ایسی صورت میں ضرورت اس کی تھی کہ مسلمانوں کو اُن کی صحیح تاریخ سے آگاہ
کیا جاتا، ہندوستان جدید کی تعمیر میں جو حصہ مسلمانوں نے لیا ہے اور جو ایثار اور قربانیاں
آزادیٔ ہند کیلئے انھوں نے کی ہیں، اُس کی مکمل تصویر اُن کے سامنے رکھی جاتی
تاکہ اُن کو معلوم ہوتا کہ وہ اس ملک میں غلام بنکر نہیں بلکہ مساوی شریک حکومت کی
حیثیت سے رہنے کے حقدار ہیں سه

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں   اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

قوموں کی ترقی و تنزلی کا دارومدار بہت کچھ ان کی گذشتہ تاریخ کی ترتیب
پر ہے۔ ہندوستان کی موجودہ حالت اور ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی زیادہ تر
تاریخ کے ان غلط واقعات کی ترتیب کا نتیجہ ہے جو مغربی مورخین نے
اپنے سیاسی مفاد کو مدنظر رکھکر انجام دی۔ قوموں کی ذہنی تعمیر میں سب سے
زیادہ مردان کے گذشتہ کارناموں اور دور ماضی میں اُن کے مکمل حالات کی
ترتیب سے ملتی ہے۔

برادران وطن نے اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی قومی تاریخ کے
مرتب کرنے میں ہر امکانی جدوجہد کی اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان
کی آزادی کیلئے صرف ہندوؤں نے قربانیاں کیں اور مسلمان دور سے تماشہ ہی
دیکھتے رہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں کانگریس کی تاریخ صدر کانگریس کے دیباچہ کے ساتھ لکھی گئی۔
اس کی اشاعت میں کانگریس نے خاص حصہ لیا اور کوشش کی گئی کہ یونیورسٹی
اور کالج کے طلبا، بالخصوص تاریخ کے طلبا، اس تاریخ کا مطالعہ کریں۔ تاریخ مذکور کے

لے اسکے مصنف کو آل انڈیا ورکنگ کمیٹی میں جگہ دیگئی اور اب صدارت کیلئے ان کا نام پیش کیا جا رہا ہے۔

مصنف نے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں ان کے کارناموں کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ ہندوستان کی ترقی میں مسلمانوں کو سب سے بڑی رکاوٹ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان قوم آباد ہی نہیں ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں سے مراد صرف ہندوؤں کا ملک اور ہندو قوم ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کے تمام کارنامے کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا، تحریک خلافت کو کانگریس تحریک آزادی کا ایک معمولی جز قرار دیا گیا۔ غرضیکہ ہر طرح ثابت کیا گیا کہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔

حال ہی میں مسلم سیاست کی ایک تاریخ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے نام سے لکھی گئی۔ اس کے فاضل مصنف نے غدر سے پیشتر کے واقعات پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ مجھے اپنی کتاب کے باب سوم (حصہ اول) کے مرتب کرنے میں بعض واقعات سے مدد ملی۔ لیکن غدر کے بعد سرسیدؒ کے زمانۂ سیاست سے وہ واقعات کا صحیح توازن قائم نہ رکھ سکے۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی مذمت، مخلوط انتخاب کی حمایت اور مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا اپنی کتاب کا نصب العین بنالیا اور اسی کو مسلمانوں کے روشن مستقبل سے تعبیر کیا۔ مسلم لیگ کی سیاست سے ممکن ہے ان کو اپنی آزادیٔ رائے کی بنا پر اختلاف ہو لیکن جہاں تک مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا تعلق ہے اور جن حالات سے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں ان کے حصہ لینے کا پتہ چلتا ہے اُن کے ظاہر کرنے میں یہ کتاب بالکل خاموش ہے۔

اسلئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کی مفصل تاریخ اور موجودہ واقعات کی صحیح تصویر عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے تاکہ کانگریس کے اس دعوے کی تردید ہو سکے کہ ہندوستان کی آزادی کے ہیرو صرف برادران وطن ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود انھیں کے قوم پرور طبقے کی تحریروں اور تقریروں اور عملی اقدام سے ثابت کیا جائے کہ ہندوستان کی زنجیر غلامی کو مضبوط کرنے والے وہی تنگ نظر کانگریسی لیڈر رہے۔ اس کار عظیم کیلئے کسی کہنہ مشق اور تجربہ کار اہل قلم کی ضرورت تھی مگر افسوس مسلمانوں میں امراء کا طبقہ اپنی محفل عشرت میں گرفتار رہے اور علماء کی جماعت باہمی رزم آرائیوں اور شغل تکفیر میں مصروف ہے۔ ان کو "عشرت امروزہی" سے فرصت نہیں، واقعات ماضی سے ان کو کیا تعلق؟ اور اپنے مستقبل کی ان کو کیا پرواہ؟ اگر تمام قوم تباہ ہوگی تو ان کو کیا غم؟ مرگ انبوہ جشنے دارد۔

قوم کے زوال کی حالت جب اس حد تک پہونچ چکی ہو اور ملت اسلامی کی کشتی اس ناقابل عبور گرداب میں پھنس چکی ہو اور کشتی کے مسافر نشۂ خواب غفلت میں سرشار ہوں تو ہر وہ شخص جسکے پہلو میں حساس اور مضطرب دل اور دل میں قوم کی محبت ہے "انفرادی" اندیشۂ سود و زیاں" سے برتر و بالا ہو کر اپنی ہمت کے موافق، اپنی تمام جد و جہد اور کوششیں اُس کشتی کو بچانے میں صرف کردیگا اسلئے کہ خود اسکی ہستی کا وجود اُس کشتی کے سلامت بچ جانے پر موقوف ہے۔ جب پوری قوم تباہ ہوتی ہے تو افراد کی زندگی کیسے قائم رہ سکتی ہے ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

آج سے ٹھیک ایک سال قبل جب میں نے "آزادی کی جنگ" کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت بھی احساس ہوا تھا اور آج بھی جبکہ مسلمانوں کی مفصل سیاسی تاریخ کو ترتیب دے رہا ہوں مجھے احساس ہے کہ میں نہ سیاسی مدبر ہوں نہ بلند پایہ مورخ، ابھی میں نے زندگی کے چوبیس پچیس سال ختم کئے ہیں اور سیاست کی دشوار گذار گھاٹیوں میں قدم رکھا ہے اسلئے قدم قدم پر یہی آوازیں آئیں ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

لیکن اس طلسم ہیچ مقداری اور بیچارگی میں کب تک گرفتار رہتا ؟ جب آنکھوں کے سامنے آگ کے شعلے بلند ہوں، قصر اسلامی کو تباہ و برباد کرنے کیلئے گولہ باری کی تیاری ہو، مسلم ماس کنٹیکٹ کے ذریعہ مسلم کیمپ میں انتشار پھیلایا جا رہا ہو تو ذاتی معروفیات وانفرادی نقصانات کا خیال بے سود اور اپنی کم مائگی اور نا قابلیت کا ماتم بیکار تھا۔ یہ وقت خاموشی کا نہ تھا ضمیر نے باواز بلند کہا ؎

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

مگر اس صدائے فریاد کو بلند کرنے سے پیشتر مجھے بہت سی رکاوٹوں پر عبور حاصل کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے میں اُس طبقے سے وابستہ نہیں ہوں جو معاشی ضروریات سے بے نیاز ہو بلکہ مجھے اپنی دنیا خود پیدا کرنا ہوتی ہے۔ دن کا تمام وقت تجارتی معروفیات کے نذر کرنا لازمی ہے۔ تجارت کی مادی تفکرات سے بھری ہوئی دنیا کو ملاحظہ کیجئے اور علمی سیاست اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں جسقدر پر سکون و اطمینان آمیز زندگی کی ضرورت ہے اسپر غور کیجئے دونوں میں زمین آسمان کا بُعد ہے۔ اُس پر کمال یہ کہ ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان کی تیاری، صوبہ مسلم لیگ یو۔ پی میں عہدیدار

بر نسل آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن ہونے کی حیثیت سے بھی فرائض کی انجام دہی۔ اسلئے
بہترین جب ان خامیوں پر نظر ڈالیں جو اس کتاب میں موجود ہیں تو ان اسباب کو
بھی نہ بھولیں جن کی بنا پر ایسی غلطیوں کا ارتکاب فطری امر ہے۔ جو انشاء اللہ آئندہ
اشاعت میں ٹھیک کر دیجائیں گی۔

اس کتاب کو اور زیادہ مفصل اور مکمل بنایا جا سکتا تھا مگر اسکے لئے کافی
عرصہ تک تیاری کی ضرورت تھی۔ لیکن آجکل جبکہ مسلمانوں کے سامنے اپنی کوئی
سیاسی تاریخ موجود نہیں ہے اور ان کے سامنے غلط واقعات پیش کرکے انکی ذہنیتوں
کو خراب کیا جا رہا ہے جبکہ ہر نیا روز نئے مسائل پیدا کر رہا ہے، اتنی فرصت کہاں کہ
اسقدر مدت تک انتظار کیا جا سکتا۔ اسی لئے میں نے اس عرصہ میں اس کتاب کی ترتیب
کو دنیا کے ہر کام سے زیادہ اہم خیال کیا۔ کتاب کے آخری سو صفحات باقی تھے
کہ کام کی شدت اور متواتر آب و ہوا کی تبدیلیوں کی وجہ سے میں انفلوئنزا کا شکار
ہو گیا۔ لیکن اس کی تکمیل کی دھن اسقدر سوار تھی کہ سوڈگری کے بخار میں بھی گیارہ بجے
رات تک محنت کرنے سے باز نہیں رہا۔ اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اس پر نظر ثانی کرکے
زبان کی غلطیوں کو دور کیا جا سکتا۔ اپنے دل کے درد کو پیش کرتے وقت زبان کی غلطیاں
میرے نزدیک کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو ۔۔۔ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

چونکہ میرا مقصد مسلم سیاست کی مکمل تصویر عوام کے سامنے رکھنا ہے تاکہ آئندہ
کسی کو ہمت نہ ہو کہ غلط واقعات پر مسلمانوں کی سیاسی عمارت تعمیر کرکے انکو گمراہ کیا
جا سکے، نہ کانگریس کو یہ ہمت ہو کہ وہ اپنے آپ کو آزادی ہند کی تنہا اجارہ دار

ثابت کرے۔ اسلئے جس ذریعے سے بھی مجھ کو صحیح اور مستند حالات اور قابل اطمینان دلائل مل سکے ہیں نے ان کو حاصل کرکے سچائی کی کسوٹی پر تولا اور جن کو سچا پایا ناظرین کے سامنے پیش کردیا۔ بالخصوص ان کتابوں کے واقعات کو ترجیح دی جو مخالفین کے قلم سے دفتاً فوقتاً نکلے تاکہ تردید کی گنجائش ہی نہ رہے مگر ان کو تحریر میں لانے سے قبل ان کی پورے طور سے تصدیق کر لی۔

بعض اوقات جب واقعات بے پردہ ہو کر سامنے آتے ہیں تو انسان بیخود ہو کر بہت کچھ لکھ جاتا ہے اسلئے اگر کہیں ایسی حالت میں کسی بزرگ کی شان میں کوئی کلمہ بیاختہ نکل گیا ہو تو وہ مجھے معذور خیال کریں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے ہندوؤں کی مخالفت منظور نہیں ہے بلکہ اُس جماعت (کانگریس) کی غلطیوں اور تنگ نظریوں کو دکھانا مقصود ہے جس کی موجودہ پالیسی مسلمانوں سے زیادہ خود ہندوؤں کیلئے مضر ثابت ہوگی۔ ان واقعات پر کانگریس کو انصاف کی نظر سے غور کرنا چاہیئے نہ کہ برطانوی طرز پر نظر عتاب سے۔ سہ

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر ۔۔۔ کہ جانتا ہوں آل سکندری کیا ہے؟

خادم ملت

عبدالوحید خاں۔ بی، اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کا ایثار

اور

آزادی کی جنگ

حصّہ اوّل

واقعاتِ ماضی پر ایک نظر

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ جدید و قدیم
(اقبال رح)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

گذشتہ تاریخ ہند کے چند اوراق

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

ہر ملک کی سیاست حاضرہ اپنے ماضی کی آئینہ دار ہوتی ہے، سیاسی انقلابات قرنوں اور صدیوں بعد اپنی مستقل تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ آج زمانہ جس راستے پر گامزن ہے کل وہی قدم آئندگاں کیلئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اسی طرح آج جو سیاسی حالت ملک میں رونما ہے وہ نتیجہ ہے اپنے ماضی کے تاریخی واقعات اور گذشتہ زمانہ کے پیہم اور مسلسل انقلابات کا۔ اسلئے ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت کا صحیح تخیل قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسکی تاریخ ماضی پر بالخصوص گذشتہ تین سو سال کی سیاسی حالت پر محققانہ اور منصفانہ نظر ڈالی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی عمارت کی بنیاد سولھویں صدی میں پڑ چکی تھی اگرچہ اس بنیاد کا سامان اسوقت سے تیار ہونا شروع ہو گیا تھا جب سے عربی فاتحین سندھ کے زوال کا آغاز اور افغانی فوجوں کا رُخ ہندوستان کیطرف ہوا تھا بدقسمتی سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز اُسوقت سے ہوا جب عرب کی سیاست اپنی کامیابی کی آخری منزلیں طے کرکے رو بہ زوال تھی اور باہمی تفرقوں کا شکار ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت معمولی سے زمانے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان میں کبھی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی جسکو اصلی

معنوں میں اسلامی حکومت کہا جا سکے۔ خلیفہ اول و دوم کے زمانے میں ہندوستان کی فتح کا ارادہ نہیں کیا گیا اور اگر فاتحین ایران نے ارادہ کیا بھی تو سورت، بھروچ اور کاٹھیاوار سے آگے نہیں بڑھے اور جلدی واپسی ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اس عربی تہذیب سے ہمیشہ محروم رہا جس سے ابتک ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک مالامال ہیں۔ خلافت بنوامیہ کے زمانے میں حجاج بن یوسف کے حکم سے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں جو ایک سترہ سالہ عربی نوجوان تھے ہندوستان کا شمالی مغربی حصہ فتح کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عربوں کی فتوحات اپنے کمال عروج پر پہونچکر تنزل کی طرف رُخ کر چکی تھیں۔ عرب ایک طرف افریقہ کے ریگستانوں تک اور دوسری طرف ہسپانیہ میں بحر اطلانٹک تک اسلام کی صحیح تعلیم پھیلا چکے تھے۔ مشرق میں فارس تک پہونچ چکے تھے اور اگر کوہ ہندوکش درمیان میں نہ آجاتا تو ہندوستان میں جب ہی اسلامی تہذیب کی روشنی پھیل چکی ہوتی۔ غرضیکہ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا ہی عربی فتوحات کا سلسلہ بند ہونا شروع ہوگیا تھا اور باہمی آویزشوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں ہندوستان فتح کیا گیا۔ لیکن مرکزی خلافت کے باہمی رقابتوں اور تبدیلیوں کی بنا پر کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ خلیفہ معتصمؒ کے زمانے ہی سے سندھ کا زوال شروع ہوگیا لیکن جتنے عرصہ تک بھی عربوں نے حکومت کی وہ اُس حکومت سے کہیں زیادہ اسلامی اصولوں پر مبنی تھی جو بعد میں افغانیوں نے قائم کی۔ یہی وجہ ہے کہ آجتک سندھ میں عربی تہذیب اور زبان کے نشانات موجود ہیں اور دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں یہ صوبہ زیادہ اسلامی ہے۔

خلافت بنو امیہ کے بعد مرکز خلافت دمشق کے بجائے بغداد قرار پایا۔ جس سے باہمی تنازعوں میں اور اضافہ ہوا۔ حکومت اسپین نے خلافت سے قریب قریب علیحدگی اختیار کرلی۔ خلافت میں رفتہ رفتہ شہنشاہیت اور استعمار نے جگہ لے لی وہی مقر ملوکیت جسکو اسلام نے منہدم کرنے کا دعوے کیا تھا پھر خلافت کے لباس میں قیصر و کسریٰ کی سنت کے موافق تعمیر ہونا شروع ہوگیا۔ عہدۂ خلافت شہنشاہیت کی طرح حق وراثت بن ہی چکا تھا۔ ایسی حالت میں خلافت کی مرکزی حالت کو زوال سے کون بچا سکتا تھا۔ مامون الرشید کے بعد ہی سے خلیفہ کی حالت کمزور ہوتی گئی اور بغاوتوں کا سامنا شروع ہوگیا۔ بالخصوص ایرانیوں کی طاقت اسقدر بڑھ چکی تھی کہ وہ نہ صرف سیاست اسلام اور خلیفۃ المسلمین پر کافی قابض ہوچکے تھے بلکہ عربی تہذیب و تمدن پر ایرانی رنگ چڑھ رہا تھا اور عجمیت کی تمام کثافتیں حجازی تہذیب میں شامل ہورہی تھیں۔ اس طاقت کو رد کرنے کیلئے خلیفۂ وقت نے ترک غلاموں کی فوج مرتب کی جو خلیفہ کی فوج خاص کہلاتی تھی ترک بہادر تھے اور خلیفہ کی حفاظت کا یہی ذریعہ تھا۔ لیکن بعد کو یہی ترک خلافت کیلئے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوئے۔ بیشک ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت ضرور رک گئی اگرچہ ایرانی کلچر نے ان ترکوں کو بھی مغلوب کرلیا۔ لیکن ترکوں کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ خلافت بغیر انکی مدد کے چلنی محال ہوگئی۔ انھیں ترکوں نے افغانستان میں حکومت قائم کی جن کی نسلیں ہندوستان میں عربوں کے زوال کے بعد ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئیں اور دوسری طرف مصر سے سمرقند تک انکے قبضہ میں آگئے۔ محمود غزنوی کے زمانے میں خلیفۃ المسلمین کی

سیاسی طاقت کے زوال اور ترکوں کے عروج کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ جب محمود غزنوی نے خلیفہ عباسی القادر باللہ کو لکھا کہ "بلاد خراسان کے چند حصے میرے قبضہ میں ہیں اُن میں سے جن پر خلیفہ کے حاکموں کا تصرف ہے میرے حق میں چھوڑ دیے جائیں۔" خلیفہ نے اپنی کمزوری کے باعث اس ناجائز خواہش کو پورا کر دیا۔ بعد میں محمود نے سمرقند بھی طلب کیا تو خلیفہ نے انکار کر دیا۔ اس پر محمود نے خلیفہ کو لکھا کہ اگر درخواست منظور نہ ہوئی تو ایک ہزار ہاتھی لیکر آؤنگا اور دارالخلافہ کو تباہ کر دونگا۔ خلیفہ نے جواب میں ایک سطر مقطعات میں لکھ کر بھیجدی جس پر صرف "ا۔ل۔م، ا۔ل م" پڑھا جاتا تھا۔ علامہ ابو قہستانی نے مطلب بتایا کہ "اسکا اشارہ "الم تر کیف" کی طرف ہے چونکہ محمود نے ہاتھیوں کی دھمکی دی تھی۔" اسپر محمود بہت نادم ہوا۔

خلافت کی مرکزی حالت کے اسقدر کمزور ہو جانے کے سبب مسلمان فاتحین کے ارادوں اور دلوں میں تبلیغ اسلام کا وہ خالص جذبہ نہ رہا تھا جو خالد بن ولیدؓ اور طارقؒ کے حملوں میں نمایاں تھا۔ عربی فاتحین ہند نے ابتدا میں ضرور اسلامی تعلیم و تہذیب کا خیال رکھا لیکن محمد بن قاسم کے بعد مسلمان فاتحین نے تبلیغ اسلام کا خیال قریب قریب چھوڑ دیا تھا ان کا مقصد اپنی سلطنت کا قیام ہو گیا تھا اور بعد میں رفتہ رفتہ وہ شخصی سلطنت کے استحکام میں اسقدر مصروف ہو گئے کہ اسلامی تہذیب کی ترویج و تبلیغ کا خیال بھی اُنکے دل سے جاتا رہا۔ وہ سب ایران کی تہذیب سے اسقدر متاثر تھے کہ ہندوستان میں حجازی تہذیب کے بجائے اُنھوں نے ایرانی رسومات اور دستور کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ جس

زمانے میں عربوں نے ایران کو فتح کیا تھا اُسوقت ایران مشرق میں علم و ہنر کا بہترین مرکز تھا اسلئے ایرانی تہذیب نے عربی کلچر کو بہت موثر کیا۔ ایرانی تہذیب اصل میں یونان سے مستعار تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم "راہب دیرینہ افلاطون حکیم" کا فلسفہ زندگی ایرانی زندگی کے ہر شعبہ میں موجود تھا۔ وہاں کی شاعری، فلسفہ اور آرٹ یونانی متشائم نظریہ حیات سے متاثر تھے۔ ایک نئے تصوف کی بنیاد جسکی اساس یاس اور حزن وملال اور ترکِ دنیا پر تھی وہاں یونانی طرز پر پڑ چکی تھی جس نے ہندستان میں آکر اور کچھ ویدانت فلاسفی سے متاثر ہوکر عجب شکل اختیار کرلی تھی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت تمام دنیا کی تاریخ میں بیمثال ہے جو رواداری اور انصاف ان ترکی حکمرانوں نے ہندوستان میں پھیلایا اس کی نظیر پہلے بھی موجود نہ تھی اور حقیقتاً ان کا زمانۂ حکومت اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے لیکن عرب فاتحین کے دل میں اسلامی تہذیب و تمدن و زبان کی ترویج و تبلیغ کلچر کا خالص جذبہ تھا وہ ہندوستان میں نہیں آسکا۔ یہ حکمران وطنیت کے اسقدر قائل تھے کہ ہندوستان میں بجائے عربی زبان کے فارسی کو درباری اور عدالتوں کی زبان قرار دی جس کی وجہ سے عربی زبان معدوم ہونی شروع ہوگئی اور فارسی زبان کو فروغ حاصل ہوتا گیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی اصل روح ہندوستان سے رفتہ رفتہ ختم ہونی شروع ہوگئی اور مذہب چند رسومات اور ضوابط کا نام بنکر رہگیا اسلئے کہ جبتک مذہب کو اُسکی اصلی زبان میں نہیں سمجھا جائیگا حقیقت دور رہیگی علما و مجاہدین اسلام ہمیشہ اسلام کی تقویت کا باعث رہے ہیں اور اسلامی تہذیب کی تبلیغ انھیں کے ہاتھوں ہوئی مگر زوال بغداد کے بعد امرائے جہاد اور علما سے

اجتہاد بالکل ختم ہو گیا تھا بالعموم علماء دین سے رزمیت ختم ہو کر بزمیت آگئی تھی۔ یہانتک کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو علما کے خیمے سب سے پیچھے عورتوں کے خیموں کے پاس نصب کئے گئے تھے تاکہ وہ امن میں رہیں۔ بالعموم علماء میں جاہ پرستی اور منصب کی خواہشیں پیدا ہو گئی تھیں۔ "شیخ سلطنت" کے عہدوں پر بالعموم قتل کے بازار گرم ہو جاتے تھے۔ "قتل مرتد" کے فتووں کا بازار گرم رہتا تھا اور ہر مفسد سلطنت "مرتد" کی زد میں آجاتا تھا۔ اسوقت کے علما کی چیرہ دستیوں کی مفصل داستان مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے "تذکرہ" میں موجود ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں جو کچھ بھی اسلام اسوقت موجود ہے وہ اسوقت کے علماء حق اور صوفیاء کرام کی جان توڑ کوششوں کا نتیجہ ہے جنکو بسا اوقات خود مسلمان حکومتوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن چونکہ اس زمانے میں زبان عربی اور حقائق مذہبی سے عوام کو کوئی لگاؤ نہ تھا اسلئے جو لوگ صوفیاء کرام اور دیگر مسلمان بزرگوں کے علوم، اخلاق اور مذہبی کارناموں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے تھے وہ اصل تہذیب اسلامی سے بے بہرہ رہتے تھے۔ حکومت وقت کی طرف سے اسلامی تہذیب کی صحیح تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا جو اسلامی حکومت کا سب سے بڑا فرض ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی مسلمان آبادی کا بیشتر حصہ انھیں جاہلانہ رسومات و توہمات میں گرفتار رہا جسمیں وہ قبول اسلام سے پیشتر تھے اور قرآن اور حدیث کے علوم جن پر تہذیب اسلامی کی بنیاد قائم ہے زیادہ فروغ نہ پاسکے۔

باہر سے جو مسلمان آکر آباد ہوئے وہ خود جمعیت سے اسقدر مغلوب ستھے کہ

یہاں آکر کچھ ہندوستانی تہذیب کو متاثر کیا اور کچھ خود یہاں کی تہذیب سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب عربی، ایرانی اور ویدانت کی تہذیب کا معجون مرکب بنکر رگئی۔

انگریزوں نے ہندوستان میں حکومت قائم کرتے وقت اس امر کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اگر اپنی تہذیب و تمدن کو نہ پھیلایا گیا تو حکومت کرنی مشکل ہوگی یہی وجہ ہے کہ ان کی کوششیں ہمیشہ یہ رہیں کہ ہندوستانی بہ ظاہر ہندوستانی رہیں لیکن دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز۔ لیکن ہمارے حکمراں اسلامی تہذیب سے اسقدر لاپروا ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے یہاں کی قدیم تہذیب کو خود اختیار کرنے اور فروغ دینے میں کافی کوشش کی۔ اُن کی ذہنیت یہاں تک بدل چکی تھی کہ اُنھوں نے عربی زبان کو تو شروع ہی سے نظرانداز کر رکھا تھا اب فارسی کے بجائے ایک تیسری مشترک زبان پراکرت اور فارسی کی آمیزش سے پیدا کرنے کی کوشش کی جس نے 'ریختہ' نام پایا اور بعد کو اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسکی کوشش سلطان بلبن کے زمانے ہی سے شروع ہوگئی تھی امیر خسروؒ کے زمانے میں اس زبان کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی جسکی وجہ سے آج ہندوستان میں روزانہ اردو ہندی کے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر ابتدا سے عربی زبان رائج ہوتی اور عربی علوم کی ترویج کی جاتی تو آج ہندوستان کی سیاست اتنی پیچیدہ نہ ہوتی۔

شہنشاہ بابر سے قبل حکومت ہند کا برائے نام تعلق خلیفۃ المسلمین سے تھا لیکن سلطنت مغلیہ کے آغاز ہی سے وہ تعلق بالکل منقطع کر دیا گیا۔ سولھویں صدی کے

آغاز میں ہندوستان کی اسلامی سیاست ناگفتہ بہ حالت پر پہونچ چکی تھی۔ اسلامی تہذیب ہندوستانی کلچر میں ملکر بالکل ایک نیا قالب اختیار کر چکی تھی۔ ہندوؤں کی سیاسی حالت روبہ ترقی تھی۔ بالخصوص ہندو مہاجنوں کی مالی حالت بہت ترقی کر چکی تھی۔ یہانتک کہ مسلمان صوبہ داروں کو بسا اوقات مہاجنوں کی مدد حاصل کرنی ہوتی تھی جنکے قرضوں کے حقوق کی حفاظت خود اسلامی حکومت کرتی تھی۔ ہمایوں کی موت اور اکبر کی تخت نشینی کے درمیانی عرصہ میں ہیمو بقال کی چندروزہ حکومت نے ہندوؤں کے حوصلوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں کی مذہبی قدامت پرستی اسقدر قائم تھی کہ باوجود چھ سو سال کے باہمی میل جول کے وہ مسلمانوں کو اب تک "ملکش" خیال کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے کھانا پینا انکے لئے مذہبی جرم تھا۔ اسلئے مسلمانوں کے خلاف انکو طبعی نفرت تھی۔ اکبر کی دوربین نگاہوں نے اس مرض کو محسوس کیا لیکن جو نسخہ اس مرض کیلئے ابوالفضل کی فرمائش سے تجویز کیا گیا وہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کو گھن کی طرح کھا گیا۔ بیشک ہندو مسلم اتحاد کا راستہ جو اکبر نے معین کیا تھا وہ عین سیاسی مصلحت پر مبنی تھا۔ لیکن اسکا صحیح راستہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہندوؤں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبے کو ختم کر کے اُن کو مسلمانوں کا دوست اور معاون بنایا جاتا — ابتدائے حکومت میں اکبر نے کچھ عرصہ تک یہ راہ اختیار بھی کی تھی مگر اپنی کامیابی اور استحکام حکومت کے بعد جو راہ اُس نے اختیار کی یا اس زمانے کے واقعات کی رو سے اُسے اختیار کرنی پڑی وہ مسلمانوں کیلئے سخت مہلک ثابت ہوئی۔ اکبر ہندو تہذیب کی طرف اسقدر

مائل ہوگیا کہ وہ خود از فرق تا قدم ہندو تہذیب بنگیا۔ اسکی پوری ذمہ داری بالواسطہ اُس وقت کے علما اور فقہا پر ہے۔ اس زمانے میں علمار سور کی جبہ دستیاں اور دیان فروشیاں اس حد تک پہونچ گئی تھیں کہ اکبر جیسے اُمّی اور اَن پڑھ آدمی کیلئے بالکل ناممکن تھا کہ وہ انکا معتقد رہتا۔ اکبر ابتدائی زمانہ میں علمار اور صوفیار کرام کا اس درجہ معتقد تھا کہ ایک مرتبہ آگرہ سے فتحپور سیکری تک اس نے حضرت سلیم چشتیؒ کی خانقاہ تک پاپیادہ سفر کیا تھا۔ اپنے لڑکے جہانگیر کا نام بھی انھیں کے نام پر شہزادہ سلیم رکھا تھا اور اپنی دارالسلطنت کو ایک عرصہ تک وہیں رکھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ علمار اسلام معمولی معمولی مناصب یہانتک کہ دست است در دست چپ کی نشستوں پر باہمی رزم آرائیوں پر اتر آتے ہیں محکمہ قضاۃ کی معمولی تقرری پر تلواریں کھنچ جاتی ہیں اور علمار حق کی دلآزاری ہر طرح کی جاتی ہے تو اکبر علمار سے یکسر متنفر ہوگیا۔ شیخ مبارک اور اسکے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو علمار وقت نے اسقدر پریشان کیا تھا کہ جب اکبر کو صحیح حالات کا علم ہوا تو اُس کے دل میں ہر عالم کی طرف سے سخت نفرت ہوگئی پھر ابوالفضل نے اسپر اور تیل چھڑکا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر اپنے اعتقاد کی اس حد تک پہونچ گیا جسکو باسانی "حد الحاد" کہا جاسکتا ہے۔ علمار کی مخالفت میں وہ ایسی غلطیاں کر بیٹھا کہ جسکا خمیازہ ہندوستان کے موجودہ مسلمان آجتک اٹھا رہے ہیں۔ جسکے ذمہ دار حقیقت میں خود وہی علمار ہیں جن کی جاہ پرستیوں اور باہمی آویزشوں نے اسکو اسلام سے ہی متنفر کر دیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جسکو صرف "مصنف کی رائے" کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" (صفحہ ۱۲) میں اس حقیقت کے

مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

"افسوس ہر عہد اور ہر دور میں جسقدر برباد یاں ہوئیں علمار سو ہی کے ہاتھوں ہوئیں وقت اور زمانے کی شکایت بے سود ہے ۔

تاکے ملامت مژہ اشکبار من یک بار ہم نصیحت چشم سیاہ خویش

سچ یہ ہے کہ عہد اکبر کے تمام فتنہ و فساد کے اصل ذمہ دار یہی علما عہد الدنیا ہیں نہ کہ ابوالفضل و فیضی، حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اسی عہد کی نسبت اپنے مکاتب میں بار بار لکھتے ہیں" ہر فتورے کہ دریں زماں در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومئے علمار سو است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند، اولئک حزب الشیاطین - الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون "

اکبر نے تمام حاملین مذہب کا یہ حال دیکھا تو سرے سے مذہب ہی کو خیرباد کہنا چاہا، خود ابوالفضل و فیضی کو بھی انھیں لوگوں نے اپنی ہوا پرستیوں اور ظلم و عدوان کے نمونے دکھلا کر اسی طریقہ میں آنے کی دعوت دی تھی جسکی بے اعتدالیاں دیکھ کر وہ خود بھی متاسف ہوتے ہونگے کہ مقصود کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا ؟ انھوں نے علمار سو کے زور و پندار کا بت توڑنے کیلئے ایک دوسرا بت تیار کیا تھا جسکا نام اکبر تھا، لیکن آگے چلکر خود اسی کی پرستش شروع ہو گئی، فیضی نے اگر علمار وقت کے متعلق یہ کہا تھا تو کیا غلط کہا تھا ؟

زباں کشیدہ بدار القضار عجب ریا شہود و کذب دعوی گراں ایمانی

اگر حقیقت اسلام در جہاں این ست   ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی"

مولانا آزاد کے مندرجہ بالا ان الفاظ سے حقیقت بہت واضح ہو جاتی ہے۔ نتیجہ جو ہونا تھا ہوا سلطنت کی عنان مکمل طور سے بیربل اور ٹوڈرمل کے ہاتھ میں چلی گئی۔ تمام سیاست ہند پر ہندو حاوی ہو گئے۔ ان کو مسلمانوں کی کمزوریوں کا بھی خوب احساس ہو گیا اور اکبر کی عنایات کی کثرتوں اور غیر سیاسی ہندو پرستی نے انکے حوصلے بڑھا دیے۔ جو ہندو ریاستیں اکبر کے قبضہ میں آگئی تھیں انکو اسقدر مراعات دیے گئے کہ بعد میں وہی سلطنت کی تباہی میں معاون ہوئیں۔

اکبر نے صرف انھیں باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک نئے دین کی بنیاد بھی ڈالدی اور خود اسکے پیغمبر ہو گئے اسکا نام "دین الٰہی" رکھا اسمیں ہندو اور مسلم دونوں شامل ہو سکتے تھے۔ اس مذہب کو مورخین نے "اکبر کی حماقتوں کی یادگار" قرار دیا ہے۔ ان ملحدانہ طریقوں کے خلاف علماء ہند بالخصوص علماء جونپور نے بغاوت کی اور حکومت کو "کافر حکومت" قرار دیا اور جہاد کے فرض ہونے کا فتوے دیدیا جس سے اکبر کی کچھ آنکھیں کھلیں مگر اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ ہندو اب غالباً اکبر کی طاقت سے بھی باہر ہو چکے تھے جسکا اندازہ خود اکبر کو اپنے آخری زمانہ حکومت میں ہو چلا تھا۔

اکبر کا یہ پیدا کیا ہوا فتنہ کم ہونے والا نہ تھا۔ جہانگیر کو کافی مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ لیکن شاہجہاں کے عہد میں ہندوؤں کو اپنی سیاسی قوت کے دکھانے کا خوب موقع ملا۔ بالخصوص دکن میں مرہٹوں نے بغاوت کا جال پھیلایا اور اورنگزیبؒ کو ولیعہدی کے زمانے میں بغاوت فرو کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا جسمیں اُسکو کافی

امیابی ہوئی۔ لیکن ہندوؤں کی بغاوت کا جال تمام ہندوستان میں پھیل چکا تھا ورنگ زیب کے برسر حکومت ہوتے وقت مسلمانوں کی حالت انحطاط کی آخری منزل تک پہونچ چکی تھی۔ علما[1] بالعموم مذہبی شہزادے بن چکے تھے۔ امرا عیش پرستی میں مصروف تھے، اسلامی تمدن ہندی تہذیب میں گھل مل چکا تھا۔ ہندو یہ طے کر چکے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں حکومت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہندوؤں کا یہ جذبہ کہ مسلمان "مدیشی ملکش" ہیں اب اتنا ترقی کر چکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں حکومت سے تصادم کی تلاش میں رہتے تھے۔ یہ حالات تھے جن پر اورنگ زیب کو قابو حاصل کرنا تھا۔ لیکن جس بے وفائی اور تنگ نظری کا ثبوت اُس کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے دیا وہ تاریخ ہند میں برادران وطن کے کارناموں کا تاریک ترین پہلو ہے۔ ہندوؤں کی اُس وقت کی کج فہمی اور غداری سے ہندوستان کو جو نقصان پہونچا ہے اُسکی تلافی ناممکن ہے۔

اورنگ زیب کے دور حکومت میں ہندوؤں کے امن و آرام اور مذہبی آزادی کا اتنا ہی خیال رکھا گیا جتنا مسلمانوں کا۔ گیا اور متعدد دیگر مقامات میں ابتک اورنگ زیب کی دقف کی ہوئی جائدادیں مندروں کے استعمال میں آرہی ہیں۔ پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی نے مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

[2] "اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اسکے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے

---

[1] حق پرست علما اور اولیا ہر وقت موجود رہے لیکن زمانہ کی کتانتوں کی بنا پر وہ گوشہ نشین رہے اس لئے جہاں کہیں علما کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر ہے اس سے مراد وہ نہیں علما سے ہے جو امور دنیوی و سیاسی میں برابر حصہ لیتے تھے۔

[2] استقلال، دیوبند، ۴ مارچ ۱۹۳۷ء

زمانے میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی۔ اور مذہب کیلئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دیگئی تھیں۔ آجتک ہند میں متعدد ہندو پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جنمیں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا ذکر ہے "

اورنگ زیب کی وفات کے وقت فوج اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر سینکڑوں ہندو موجود تھے۔ لیکن اگر اسکا کوئی قصور تھا تو صرف اتنا کہ اس نے اسلام کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکنی چاہی۔ اسکی خواہش تھی کہ ہندوستان میں جو حکومت بھی رہے وہ اسلامی اصولوں پر مبنی ہو جسکی رُو سے ہندوؤں کے ساتھ پوری رواداری سے کام لیا گیا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اڑتالیس اقسام کے محصول معاف کردیے جو غیر اسلامی تھے۔ اور صرف ایک اسلامی ٹیکس "جزیہ" مقرر کردیا جو درحقیقت غیر اسلامی رعایا کے اوپر ایک حفاظت کا محصول تھا۔ لیکن اب ہندو اسقدر مسلم آزار ہو چکے تھے کہ وہ کسی ایسی چیز کو برداشت کرنا گوارا نہ کرتے تھے جسمیں ذرا بھی اسلام کی بُو آتی ہو۔ جزیہ کی مخالفت محض اسوجہ سے کیگئی کہ وہ "اسلامی ٹیکس" تھا۔

مغربی مورخین کی یہ بہترین پالیسی تھی کہ ہندو مسلمانوں کو آپسمیں لڑانے

سلہ مثلاً ہندوؤں کے مردوں پر جو گھاٹ میں جلائے جاتے تھے اور میلوں کے موقعوں پر دوسرے بادشاہوں کے زمانے میں محصول ہوتا تھا انکو اورنگ زیب نے معاف کردیا ۱۲

کیلئے انھوں نے اورنگ زیب کی تمام رواداریوں اور انصاف پرستیوں پر پانی پھیر دیا اور اسکو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تاکہ ہندوؤں کے دل میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف جذبۂ نفرت اور بھڑکے اور اسمیں انکو کافی کامیابی ہوئی۔ آج پنڈت مالویہ اور گاندھی جی کو اورنگ زیب کی رواداری کا لاکھ یقین دلایا جائے لیکن وہ اسی پر جمے ہوئے ہیں کہ اورنگ زیب نے کروروں ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیا حالانکہ دہلی باوجودیکہ سات سو برس تک مسلمانوں کا دارالسلطنت رہی لیکن اسکے آس پاس مسلمانوں کی آبادی چودہ فیصدی سے بھی کم ہے۔

باب دوم

مسلمان حکمرانوں کی حُبّ الوطنی اور ہندوؤں کی بیوفائی

جسکو ہم نے آشنا لطف تکلم سے کیا
اُس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان باہمی رزم آرائیوں میں پھنسا ہوا تھا یہاں کا تمدن اور تہذیب دنیا بھر میں سب سے نرالا تھا۔ بت پرستی جس حد تک یہاں پہونچ چکی تھی اتنی زمانہ جاہلیت میں عرب میں بھی نہ تھی۔ یہاں کا فلسفہ اور شاعری اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی حدود سے باہر جانا ہندو دین سے اخراج کا حکم رکھتا تھا۔ اسی طرح بیرون ہند کا آدمی بالخصوص مسلمان "ملکش" اور "راکشش" سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندے ہندوستان سے باہر کی دنیا سے مطلق بے خبر تھے۔ ان کی تمام پرواز ہندوستان کی فضا میں محدود

تھی۔مسلمان جب یہاں آکر آباد ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا۔اور اسکی ترقی اور بہبودی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔یہاں تک کہ اُن کو اپنے قدیم وطن کا خیال بھی نہ رہا۔ازدواجی تعلقات بھی یہیں کے باشندوں سے قائم کئے۔آخرکار کچھ عرصہ کے بعد وہ سراپا ہندوستانی ہوگئے اور ہندوستان کی فلاح کیلئے تمام کوششیں صرف کردیں۔ہندو مسلم رعایا میں اُنھوں نے کبھی امتیاز نہیں کیا۔ہندوستان کی مجموعی ترقی اُن کے مدنظر رہی۔

ہندوستان کی پرانی تہذیب جو بت پرستی میں رنگی ہوئی تھی بہت کچھ بدل گئی۔یہاں کا فلسفہ جو امن وسکون اور ویدکی خاموش اور شانتی سے بھری ہوئی تعلیم پر مبنی تھا اسلام کی مجاہدانہ تعلیم سے متاثر ہوا۔ ہندوستان کی تہذیب کو مسلمان بادشاہوں نے چار چاند لگا دیے۔

مسز سروجنی نائیڈو نے مندرجہ ذیل تقریر میں اسکا اعتراف کیا ہے۔[1]

”عربوں نے صرف ملک اور زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل ودماغ فتح کئے ہیں۔مسلمان بھائیو! ہمارے خواب وخیال (فلسفہ) کو حقیقت کا جامہ تمھیں نے پہنایا۔اور ہمارے افکار اور تخیل خالیہ میں حرکت اور جان تمھیں نے ڈالی۔آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا میں علوم وفنون کی کیا خدمات جلیلہ کی ہیں۔اُنھوں نے ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا۔“

---

[1] اخبار وکیل ۲۶ر جنوری ۱۹۱۸ء

تجارت اور رنگ زیب کے وقت اس درجہ کمال کو پہونچ چکی تھی کہ ہندستان کا بنا ہوا کپڑا یورپ کے بازاروں میں اسی طرح چھایا ہوا تھا جس طرح آج جاپانی مصنوعات ہندوستان کے مارکٹ میں۔

مسٹر ڈینیل ڈوفو نے ۱۷۰۸ء میں اپنے ایک اخبار میں لکھا تھا :-

"اہل انگلستان ہندوستان کے بُنے ہوئے کپڑوں کی خواہش کرتے ہیں ہندوستان کی چھینٹیں اور چھپے ہوئے کپڑے پہلے فرش وغیرہ بنوانے کے کام میں آتے تھے مگر اب ہمارے ملک کی شریف زادیاں تک انکو پہننے لگی ہیں۔ اوروں کا تو ذکر کیا خود انگلستان کی ملکہ بھی چائنا سلک اور ہندوستان کی چھینٹیں پہننا پسند کرتی ہیں۔ اسوقت چاروں طرف ہندوستانی کپڑا نظر آرہا ہے"[۱]

اس زمانے کی تعلیمی حالت خود مہاتما گاندھی کی اس تقریر سے معلوم ہوتی ہے جو ۱۹۲۰ء میں موصوف نے بنارس میں کی تھی :-

"برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں تیس ہزار مدرسے تھے۔ جنمیں دو لاکھ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ آج حکومت دفتری بہ مشکل تمام چند ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے"[۲]

سلطنت مغلیہ کے آخری دور کے متعلق میکالے کا مندرجہ ذیل نوٹ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ طوائف الملوکی کے زمانے میں بھی ہندوستان کی مالی حالت کیسی تھی :-

---

[۱] بھارت درشن صفحہ ۱۶۔ [۲] اخبار مسافر آگرہ ۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۵

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لیڈروں کے مشرقی ممالک میں صوبہ بنگال ارم سمجھا جاتا تھا۔ اسکی آبادی بے حد و حایت بڑھتی رہتی تھی۔ غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلےٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں۔"

دولت کی فراوانی کی یہ حالت تھی کہ بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار بینک آف انگلینڈ کی برابر پھیلا ہوا تھا۔ (مسند آف بنگال از مزمدار صفحہ ۱۵۳)
بقول کپتان الگزینڈر ہملٹن "سورت کے ایک تاجر عبدالغفور نامی کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برابر یعنی اربوں روپیہ تھا۔" انھیں وجوہات سے ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

غرضیکہ تعلیمی حالت، مال و دولت کی فراوانی، مذہبی رواداری اور صنعت و تجارت کی ترقی میں ہندوستان مثل بہشت بنا ہوا تھا اور اگر اسوقت کا مقابلہ موجودہ ہندوستان سے کیا جائے تو آج کا ہندوستان جہنم سے کم نہیں معلوم ہوگا۔
لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود جو کچھ برادران وطن نے دہلی کے تخت کے ساتھ کیا وہ ایک عبرتناک واقعہ ہے۔ اکبر کی تباہ کن پالیسی نے اُن کے اس خیال کو کہ "ہندوستان ہندوؤں کیلئے ہے۔" اتنی تقویت دیدی تھی کہ وہ مسلم حکومت کو ختم کرنے کی ہر کوشش میں مصروف تھے۔ اورنگزیب سے قبل ہی معاملات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ ان کی اصلاح کسی کے قابو میں

سلہ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ صفحہ ۱۹

نہ رہی تھی۔ ہندو کسی حال میں مسلمان حکومت سے تعاون کرنے کو تیار نہ تھے ان کی نگاہیں مرہٹوں کی اٹھتی ہوئی طاقت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ہندو ریاستیں خود مختاری کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اورنگ زیب کی عظیم الشان شخصیت ان تمام ارادوں کو روکے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے زمانے میں ان تمام طاقتوں کو دبائے رکھا۔ جس نے سر اٹھایا اسی کو کچل دیا گیا۔ لیکن اورنگ زیب بقول علامہ اقبال مرحوم ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا۔

ع ترکش مارا خدنگِ آخریں۔

اسکے بعد اندرونی سازشوں کا روکنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ اگر بیرونی طاقت سے مقابلہ ہوتا تو مشکل اتنی زیادہ نہ تھی لیکن اپنوں کی بیوفائی اور اندرونی بغاوتوں کا سدباب کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ۱۷۰۷ء میں جب اورنگ زیبؒ کا انتقال اورنگ آباد میں ہوا تو بغاوت کے شعلے تمام ملک میں بھڑکنے لگے۔ مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا۔ ہندوستان کے پنڈت اور سوامی مرہٹوں کی آگ کو مشتعل کرنے میں پہلے ہی سے معاون تھے۔

لالہ لاجپت رائے (سیواجی اردو صفحہ ۴۴۴) میں لکھتے ہیں:۔

"شری سمرتھ رام داس سوامی برہمن نے سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اپدیش کیا۔"

تمام ہندوؤں نے اسکو ہندو مذہب کا پشت پناہ اور گئو رکھشا کے حامی ہونے کا اعلان کیا۔ اسی لئے سیواجی نے اورنگ زیب کے خلاف جنگ کو مذہبی جنگ کہہ کر ہندوؤں کو ابھارا۔ سیواجی کی وفات کے بعد اسی برہمن نے

سیواجی کے بیٹے سنبھا جی کو بدیں الفاظ تحریک کی :-

"آپ ہمیشہ سب ہندو، محبت سے رہو۔ اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے راستے سے ہٹا دو۔ لوگوں کے دلوں میں ملیچھوں کے مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو۔ اور مہاراشٹر کی سلطنت کو سب بڑھانے کی کوشش کرو۔"

تاریخ کے اس ناخوشگوار باب کے اعادہ سے مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانان ہند ہندوؤں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ ملکر رہنا ہے۔ گذشتہ واقعات اور ہندوؤں کی بیوفائی پر آئندہ سیاست کی بنیاد نہیں ڈالی جا سکتی مگر ان واقعات کو پیش کرنے سے مسلمانوں کو آئندہ خطرات سے آگاہ کرنا مقصود ہے جو اپنی بھیانک شکل میں وطنیت کا خوشنما لباس زیب تن کئے ہوئے سامنے آرہے ہیں۔ دکھانا مقصود یہ ہے کہ آج کانگریس مسلمانوں کے ساتھ وہی سب کچھ کرنے پر تلی ہے جو سیواجی تخت دہلی کے ساتھ کر رہے تھے۔ کانگریس اور کانگریسی رہنما سیواجی کو اپنا ہیرو تصور کرتے ہیں اور اسکی راہ پر گامزن ہونا فرض خیال کرتے ہیں۔ وہ راہ کونسی ہے؟ اسی کو دکھانا ان واقعات کے دوہرانے سے مطلوب ہے۔

کانگریس کا سیواجی پرستی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ابھی چند سال قبل مہاراشٹر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو کانگریس نے انہی "ہندو راج" قائم کرنے والے ہیرو کو پرستار بنایا تھا اور کانگریسی دروازے تک کا نام "سیواجی گیٹ" [1]

---

[1] تاریخ مہاراشٹر از بھائی پرمانند صفحہ ۳۳۳ -

رکھا تھا۔ واضح رہے کہ سوراج کا لفظ جس سے گاندھی جی کو بہت محبت ہے سب سے پہلے سیواجی نے استعمال کیا تھا جسکا مطلب ہندوستان کو مسلمانوں سے آزاد کرانا تھا۔ آج یہی کانگریس کا نصب العین ہے جسکا مطلب بھی گاندھی جی کے الفاظ میں ہندوراج ہے۔

اسی ہندوراج کی تعریف کرنا جسکی حمایت سیواجی نے کی تھی کانگریس کا یہ پہلا ہی موقع نہ تھا۔ اس سے پہلے سیواجی کے کارناموں کو گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں نے "قومی خدمت" سے تعبیر کیا ہے۔ پرمانند اور مالویہ جی کے الفاظ کو نظر انداز کیجئے۔ تلک آزادی ہند کے علمبرداروں اور کانگریس کے خداوندان قدیم میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ کانگریس ہر سال یوم تلک مناتی ہے لیکن رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پہلا باب صفحہ ا تا صفحہ ۱۵ میں آنجہانی تلک کے وہ ریمارک دوسرے مقررین کی تقریروں کے ساتھ ملا کر پڑھیئے جو انھوں نے ۱۲ر جون ۱۸۹۷ء کو سیواجی کی تاجپوشی کی یادگار میں ایک جلسہ میں کہے تھے۔ انکی پوری تقریر ۱۵ر جون ۱۸۹۷ء کی اشاعت کیسری میں درج ہے۔ کیسری کے ایڈیٹر خود تلک تھے۔ ریمارک مندرجہ ذیل ہے:۔

"سوال یہ ہے کہ کیا سیواجی نے افضل خاں کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا۔ اسکا جواب مہابھارت کے اوراق ہی میں ملجاتا ہے۔ بھگوان کرشن کا صاف اپدیش ہے کہ نشکام کرتے ہوئے اپنے گرو اور رشتہ دار تک کو ہلاک کر دو۔ تم پر کوئی الزام عائد نہو سکے گا۔ افضل خاں کے قتل میں سیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہ عام کی خاطر کیا۔

اس سے اسکے قتل کو گناہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہمارے گھر میں چور داخل ہوجائیں اور ہم دیکھیں کہ انکو باہر نکالنے کیلئے ہم میں کافی قوت نہیں ہے تو چاہیئے کہ انکو اندر بند کرکے مکان کو آگ لگا دیں اور انکو زندہ جلادیں پرماتما نے غیر ملکی لوگوں کو تانبے کے ٹکڑوں پر لکھ نہیں دیا ہے کہ جاؤ ہندوستان کی حکومت تمھاری ہے ''

بی۔ پٹابھائی۔ سیتا رامایا ''تاریخ کانگریس'' میں تلک مہاراج کی سیواجی کی تحریک کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

'' سیواجی کی یادگار تازہ کرنے کا سہرا لکمانیہ کے سر ہے۔ تمام مہاراشٹر میں جلسے کئے گئے اور انکی یادگار میں تہوار منائے گئے۔ پہلی پبلک میٹنگ میں مہاراشٹر کی مرہٹہ ریاستوں کے چیف اور دیگر اعضا مدار اور جاگیردار شریک ہوئے۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۹۷ء کو تلک کو ۱۸ ماہ کی قید سخت کی سزا دیگئی تھی یہ سزا اسلئے دیگئی تھی کہ تلک نے چند ایسی نظموں کو شائع کیا تھا جس میں سیواجی کا پیغام شاعرانہ تخیل کے ساتھ تھا اور یادگار سیواجی کے موقع پر ایک تقریر بھی اسی قسم کی کی تھی ''[۱]

یہ ہیں کانگریس کے قدیم ترین اور محبوب ترین لیڈر کے کارنامے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ''چور'' اور ''غیر ملکی لوگ'' کا کتنا اچھا نام دیا گیا ہے اور ان کو بند کرکے آگ میں جلادینے کی کتنی عمدہ سزا تجویز کی گئی ہے۔

مسلمان حکومت کے تباہ کرنے میں جو کوششیں ہندوؤں نے کیں

---

[۱] تاریخ کانگریس صفحہ ۱۵۹۔

ان کی ذرا سی جھلک ایڈیٹر ملاپ کے مندرجہ ذیل مضمون سے ملتی ہے:۔

"لارڈ برکنہیڈ اپنی تلوار کے نشہ میں کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ آپس میں لڑ رہے تھے تو انگریزوں نے آکر حالت سدھاری لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے لوگ ہمیشہ کیلئے پرامن زندگی بسر کرنے کیلئے آخری جدوجہد کر رہے تھے، ہندو مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ہندو ہر جگہ فتحیاب ہو چکے تھے اور ہندوستان میں ہندو راج کی ستھاپنا ہو رہی تھی۔ اگر اس وقت انگریز درمیان میں ٹپک نہ پڑتے تو یقیناً آج ہندوستان دنیا بھر کے لئے بے نظیر سلطنت ہوتا۔ لیکن کچھ ہندوؤں اور کچھ مسلمانوں کی غلطیوں یا یوں کہنا چاہیئے کہ سیاسی گناہوں کی بدولت غلامی ہماری قسمت میں لکھی تھی اور گناہوں کا پھل ہم بھوگ رہے ہیں"[۱]

بہرحال اُس پُرآشوب زمانے میں جبکہ حکومت مغلیہ خود اتنی کمزور ہوتی جارہی تھی مسلمانوں کی خود باہمی سازشیں اسکی کمزوری میں اضافہ کر رہی تھیں۔ علما کی جاہ پرستی اسلام کو کھوکھلا کر رہی تھی۔ برادران وطن کی مجرمانہ سازشوں نے اسکو تباہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدا ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی ابتدا ہے۔ انگریز ہندوستان میں بحیثیت تجار داخل ہو چکے تھے۔ انکی للچائی ہوئی نظریں یہاں کے باشندوں کے باہمی عناد کی بنا پر ہندوستان پر پڑ رہی تھیں۔

---

[۱] اخبار ملاپ مورخہ ۱۸ رجولائی ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۔

خود مسلمانوں میں میر جعفر اور صادق جیسے غدار اسی زمانے میں پیدا ہوئے
پلاسی کی لڑائی کے بعد صوبہ بنگال مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ مرہٹوں کی
طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ دہلی تک دھاوا بولنے لگے تھے۔ آگرہ کے آس پاس
کے جاٹ بہت زور پکڑ چکے تھے۔ آگرہ پر حملہ کرکے تاج محل کے بیش قیمت جواہر
لوٹ کر اُنھوں نے چھتوں تک کا سونا جلا کر پگھلا لیا تھا۔ غرضکہ ہندوستان بھر کے
ہندو، مسلمان حکومت سے بیوفائی پر کمربستہ تھے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں
ہندوستان کے مسلمانوں کی نظریں دکن کے حکمران ٹیپو سلطان پر لگی ہوئی تھیں
ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری امیدوں کا مرکز ٹیپو ہی تھا۔ اور اسکی ذات
ظلمت شب میں امید کی کرن معلوم ہوتی تھی۔ ٹیپو انگریزوں کی طاقت کا سب سے
زیادہ دشمن تھا۔ اس نے ہر چند مرہٹوں اور دوسری ہندو ریاستوں سے انگریزوں
کو ہندوستان سے نکالنے کیلئے صلح کرنی چاہی لیکن ہندو اسکے لئے ہرگز تیار
نہ تھے کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم ہندوستان میں پھر جم جائیں۔ وہ یہ
خواب دیکھ رہے تھے کہ ٹیپو کے بعد مرہٹہ حکومت قائم ہوگی اور اگر انگریز ہی حاکم
ہوگئے تو بہرحال مسلمانوں سے بہتر ہے۔ وہ دنیا کی ہر طاقت کی غلامی پر اکتفا
کر سکتے تھے مگر مسلمانوں کی حکومت کسی طور گوارا نہ تھی۔ اس زمانے کی ہندو
لٹریچر اس قسم کے خیالات سے پُر ہے۔ جن میں ہندوؤں کو یہی تعلیم دیجاتی تھی کہ وہ
مسلمانوں سے حتے الامکان ترک موالات کریں اور حکومت اسلام کے خلاف
ہر کوشش کریں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریز ہندوستان میں کافی طور
سے قابض ہو چکے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے خلاف انگریزوں سے تعاون پر

پوری طرح کمربستہ تھے اور ان کی ہر سازش میں شریک رہے۔ ۱۸۸۲ء میں بنکم چیٹرجی نے آنند مٹھ مشہور ناول لکھا جس کے آخر میں "بندے ماترم" کا گیت ہے۔ بنکم چیٹرجی کی سالگرہ کانگریس کے مشہور رہنما ہر سال مناتے ہیں۔ اس مشہور اور ہندوؤں کی محبوب کتاب میں مصنف نے ہندوؤں کو اسلامی حکومت کے خلاف بیانتک ابھارا ہے کہ مسلمان عبادت گاہوں کو بدترین الفاظ سے یاد کیا ہے اور اور مسلمانوں کے ہندوستان سے نکل جانے کی بہت دعائیں مانگی ہیں۔

غرضیکہ اس زمانے کی سیاست مسلمانوں کیلئے کافی عبرت آموز ہے اور ان کی آئندہ پالیسی کیلئے مشعل راہ ہے۔

۱۷۹۹ء وہ بدقسمت سال ہے جبکہ مسلمانوں کی آخری امیدوں کا چراغ بھی گل گیا اور ٹیپو سلطان انگریز اور مرہٹوں کی مجموعی سازشوں کا شکار ہوکر شہید ہوگیا۔ اسی سال جنگ قورانیوں میں ترکوں کا جہازی بیڑہ بھی تباہ ہوا سرنگاپٹم میں سلطان شہید کے مزار پر جو تاریخی قطعہ ثبت ہے وہ اپنے الفاظ و معنی کے اعتبار سے حد درجہ اہم ہے:-

"روم و ہندوستان کی عظمت کا چراغ گل ہوگیا"

اس طرح تمام ایشیا میں اس زمانے میں اسلام کا زوال اپنی آخری حدود پر پہونچ گیا تھا لیکن بعینہ اسی طرح جیساکہ جرمنی کی تباہی سے جرمنی جدید نے جنم لیا ۱۷۹۹ء کی ہنگامہ خیز تباہ کاریوں کی راکھ سے اسلام کے دور جدید کے مسائل نمودار ہوئے۔ جنکا ذکر آئندہ صفحات میں آئیگا۔

باب سوم (الف)

مسلمانوں کی تباہی میں انگریز اور ہندوؤں کی باہمی سازشیں

انیسویں صدی میں مسلمانوں کی عبرتناک سیاسی حالت

ع سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ (اقبالؒ)

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں دکھایا گیا ہے اٹھارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی آخری حدوں پر پہونچ چکا تھا دہلی کی سلطنت بجید کمزور ہو چکی تھی، ہندوستان میں ٹیپو کے بعد کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی جس سے مسلمانان ہند اپنی توقعات وابستہ کر سکتے۔ ہر چہار طرف تباہی اور تنزلی کا نقشہ نظر آتا تھا، انگریز مسلمانوں کے دماغ سے شہنشاہیت کے تخیل تک کو فنا کرنے پر آمادہ تھے۔ ہندو پہلے ہی سے اس روز بد کے منتظر تھے جب مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہو وہ دنیا کے ہر سہارے کو مسلمانوں کی حکومت کو تباہ کرنے میں تلاش کرتے تھے اسلئے انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کی تباہی میں ہمنوا اور ہم مقصد تھے۔ اس طرح برادران وطن ہندوستان کی غلامی اور انگریزی حکومت کی بنیاد اپنے ہاتھوں ڈال رہے تھے۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد مرہٹے بھی اپنی غداری کا انجام لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں دیکھ چکے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں انکی چند روزہ ریاست بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور ہندوستان میں صرف انگریزوں کا تسلط باقی رہ گیا۔ لیکن ہندو مرہٹوں کی حکومت کے کمزور ہونے پر بھی انگریزوں سے تعاون کیے

کمربستہ تھے اسلئے کہ ایسا کرنے سے ان کے حسب خواہش مسلمانوں کی تباہی لازمی تھی۔ برطانوی مدبرین ہندوؤں کی اس ذہنیت کا پورے طور سے اندازہ لگا چکے تھے کہ مسلمانوں کو کمزور کرنے میں ہندوان کا پورا ساتھ دینگے اسلئے انہوں نے ہندوؤں میں عیسوی مذہب کی تبلیغ اور انگریزی تعلیم کی اشاعت کو ضروری خیال کیا۔ لارڈ میکالے انگریزی تعلیم پر پہلے ہی زور دے رہے تھے۔ انکا مقصد انگریزی تعلیم کی اشاعت سے جیسا کہ انہوں نے خود اپنی رپورٹ میں تحریر فرمایا تھا یہ تھا کہ

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رسلے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

بدقسمتی سے مسلمان انگریزی تعلیم کے لئے کسی طور سے تیار نہ تھے۔ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی حکومت کے سرزمین کو ان کے ہاتھوں برباد ہوتا ہوا دیکھ چکے تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں مذہب اسلام کی تباہی ان کے پیش نظر تھی۔ اسلئے انگریزی تہذیب و تمدن سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہی کہ اگر ہندوؤں نے بھی ان کے ساتھ تعاون کیا ہوتا تو انگریزوں سے ترک موالات کا بہترین طریقہ وہی تھا۔ مسلمان علما انگریزی تعلیم اور انگریزی لباس کو غیر اسلامی اور کفر سے بھری تہذیب خیال کرتے تھے انگریز خود بھی نہ چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیمی حیثیت سے ترقی کریں اور ہندوؤں کی ترقی ان کو اسلئے مدنظر تھی کہ انکو ابھارنے سے مسلمان خود بخود کمزور ہونگے اس لئے انگریزوں نے ہندوؤں کو انگریزی تعلیم کے لئے آمادہ کیا اور دوسری طرف

کی گئی۔

مسلمانوں کو تعلیمی حیثیت سے پست کرنے میں ہر امکانی کوشش کی گئی۔
بقول ڈاکٹر ہنٹر اسکولوں کی زبان ہندی اور ماسٹر ہندو مقرر کئے جاتے
تھے اسلئے مسلمان خود بھی ان اسکولوں سے پرہیز کرتے تھے۔ نظام تعلیم مقرر
کرنے میں ایسی اسکیموں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا جن سے مسلمان زیادہ فائدہ
نہ اٹھا سکیں۔ صوبہ بنگال میں صرف یہی نہیں کیا گیا بلکہ جو اوقاف بنگال کے
نوابین نے مسلمانوں کی تعلیم کیلئے عطا کئے تھے جنکا رقبہ صوبہ بنگال کے رقبہ کے
چوتھائی کے قریب تھا ۱۸۲۸ء میں انگریزی حکومت نے ضبط کر لئے جس سے
مسلمانوں کی تعلیم پر ضرب کاری لگی۔ ہگلی کے ایک بہت بڑے وقف کو اسطرح
ضبط کر لیا گیا کہ واقف کی منشا کے خلاف اسلامی درسگاہ کو انگریزی کالج بنادیا
گیا اور مسلمانوں کو اسکے نظام میں کوئی دخل نہیں دیا گیا۔ جسوقت یہ مدرسہ انگریزی
کالج بنا اسوقت وہاں صرف تین مسلمان طالب علم تھے حالانکہ کل طلبا کی تعداد
تین سو تھی۔ یہی حال دوسرے صوبوں میں بھی رہا۔ پنجاب بنگال کی طرح مسلمانوں
کی اکثریت کا صوبہ ہے۔ وہاں کی حالت کا اندازہ خان بہادر خورشید احمد خاں
افسر سررشتہ تعلیم کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے :-

"ایک طرف تو مسلم اُستادوں کی تعداد تعلیم عامہ کے صیغہ میں گھٹائی گئی دوسری
طرف جو انگریزی اسکول صدر مقامات میں قائم کئے گئے وہ بالکل غیر مسلموں
کے ہاتھوں میں دیدیے گئے۔ چنانچہ ضلع اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کی
فہرست سے معلوم ہوا کہ ۲۳ ہیڈ ماسٹروں میں سے صرف تین مسلمان تھے۔
گورنمنٹ کی یہ پالیسی اسقدر کامیاب ہوئی کہ پچیس سال کے عرصہ میں

حالات بالکل بدل گئے اور تعلیم کا عنصر بالکل خارج ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۱ء تک کے نقشوں سے واضح ہے کہ معائنہ کنندگان اور استادوں کے سب ایک مذہب کے لوگ یعنی ہندو ہو گئے۔ کبھی کبھی کسی مسلمان کا نام جو شاذونادر نظر آتا تو وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت صوبہ سرحد بھی پنجاب کے تحت میں تھا اور وہاں ہندو استاد جانا پسند نہ کرتے تھے اسلئے مسلمان وہاں بھیجے جاتے تھے۔"

اسی طرح مدراس گورنمنٹ نے بھی ۱۸۷۱ء میں تسلیم کیا کہ :۔

"موجودہ طرز تعلیم کا قالب ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کو اس بارے میں اسقدر زیادہ گھاٹے میں رکھا گیا تھا کہ اسکولوں میں مسلمان بچوں کا کم تعداد میں ہونا حیرت انگیز امر نہیں ہے بلکہ ان حالات میں ان کا وجود ہی حیرت انگیز ہے۔"

یہ تو صرف تعلیم شعبہ کی حالت ہے جسمیں مسلمانوں کو اسقدر گرایا گیا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ہر طرف سے خارج کیا گیا تاکہ حکومت کے انصرام و انتظام میں مسلمانوں کا اثر و دخل حتے الامکان کم ہی رہے۔

ہندو ساہوکاروں کی ہر طرح ہمت افزائی کی گئی تاکہ جو کچھ زمینداریاں مسلمانوں کے پاس رہگئی ہیں وہ قرضوں میں نیلام کرالی جائیں اسی لئے سود کی تعداد کو غیر محدود کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا افلاس روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لئے ساہوکاروں سے قرض لینا پڑتا تھا اور سود کے غیر محدود ہونے کی وجہ ان کی

ا؎ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۹۲۔

یا سیں اور زمینداریاں تباہ ہونا شروع ہو گئیں۔

پھر ڈی باسو نے جو ایک مشہور ہندو مضمون نگار ہیں برطانیہ کی مسلم کشی پالیسی پر مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :-

✓ "درحقیقت[1] میں لارڈ النبرا گورنر جنرل ۱۸۴۲ء ہی میں اس پالیسی کا آغاز کر چکا تھا۔ اسکا حکم تھا کہ ہالی مسلمانوں کو ہمیشہ نیچا دکھاتے رہو۔ انھیں ہرگز ابھرنے نہ دو۔ کسی طرح ان کی ہمت افزائی نہ کی جائے۔"

پھر وہی فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ کابل اور غزنی کی فتح کے موقع پر شملہ سے لارڈ النبرا نے ولایت میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا تھا کہ :-

✓ "مجھے[2] اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ وہ خاص لوگ جنکی گذر ہی ہماری روٹیوں کے ٹکڑوں پر ہے وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار شادمانی کر رہے ہیں جب ہیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے پھر کیوں نہ ہم ہندوؤں کا ساتھ دیں جن کی تعداد ۹/۱۰ ہے اور جو ہمارے وفادار ہے۔"

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ۱۸ جنوری ۱۸۴۳ء کو لارڈ النبرا (وائسرائے ہند) نے ڈیوک آف ولنگٹن کو پھر لکھا تھا کہ :-

✓ "میں اپنے اس عقیدہ کے خلاف کیسے آنکھیں بند کر لوں کہ مسلمانوں کی یہ نسل دیوانہ وار ہماری دشمن ہے اور اسلئے ہماری بھی پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے۔"

---

[1] روزنامہ تیج دہلی ۷ ستمبر ۱۹۲۸ء [2] ہندو راج کے منصوبے صفحہ ۱۰۔

اسی کے ساتھ ان کا یہ جملہ بھی پڑھئے:۔

"برطانوی حکام کی نظر عتاب مسلمانوں پر چوتھائی صدی تک رہی اور کسی بھی اینگلو انڈین حاکم نے اس زمانے میں ہندوستان کے کسی علاقہ میں بھی مسلمانوں کو اپنی چہیتی بیگم بنانے کا خیال نہیں کیا تھا"

برطانوی حکام اس زمانے میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ان کی تہذیب و تمدن کے خلاف ہر ممکن طریقہ سے اُبھارتے تھے اور ان کو برتر بنانا چاہتے تھے اسکا اندازہ سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ ہند سے ہوتا ہے جو ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی اور جو غالباً پہلی تاریخ تھی جسمیں مسلمان حکمرانوں کے خلاف کافی زہر اُگلا گیا تھا۔ اُسکے دیباچہ میں تحریر ہے:۔

"بڑا افسوس ہند و مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات، توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے، مگر وہ تو احکامات اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک لکھتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں"

غرضیکہ بہر طرح انگریز اور ہندو ملکر مسلمانوں کی طاقت کو کچلنے میں مصروف تھے اگر ان پورے مظالم کی ایک مکمل فہرست بنائی جائے جو انیسویں صدی کے آخر تک ہندو اور انگریزوں کے باہمی تعاون اور سازشوں سے ڈھائے گئے تو ایک علیحدہ کتاب تیار کی جا سکتی ہے[1]۔

---

[1] اگر زمانے نے فرصت دی تو اس موضوع پر مفصل رسالہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ م

باب سوم (ب)
۱۸۵۷ء کا غدر اور اُسکے تباہ کن نتائج
مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کی بارش

اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار　　رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار

غدر سے قبل ہی لارڈ ویلزلی اور ڈلہوزی کے عہد میں مسلمان ریاستوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اسلامی سیاست کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ اودھ کی حکومت انگریزی سلطنت میں شامل کر لی گئی تھی، دہلی کی مسلمان حکومت کی حیثیت ایک ملک کی نوابی سے زیادہ وقعت نہ تھی۔ سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے رحم و کرم میں آکر پورے اختیارات حکومت ان کے سپرد کر کے اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ انگریز دہلی کے لال قلعہ کو جہاں اب حسرت کے سوا کچھ نہ تھا خالی کرانے کی فکر میں تھے تاکہ اسکی عظمت مسلمانوں کی پرانی تاریخ کو تازہ نہ کرے۔ لیکن بہر حال گذرے ہوئے طوفان کا ایک ٹکڑا باقی تھا۔ اس شکوہ سلیمانی اور عہد قیصری کی ایک یادگار باقی تھی جن کے درباروں کی سطوت کے افسانے ایلزبیتھ کے حضور میں کہے جاتے تھے ؏

جن کی تدبیر جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

اور جو آج اپنے پروردہ غلاموں کی غداری کی بدولت عالم نزع میں گرفتار تھی اس چراغ سحری کی دھندلی روشنی اسلام کے درماندہ کاروان کیلئے چراغ رہگذر کا

کام کر رہی تھی ۔ مسلمانان ہند ہر بلائے ناگہانی کا نشانہ بن رہے تھے لیکن دہلی کے لال قلعہ کی ایک جھلک اپنی گذشتہ عظمت کو سامنے لاکر آنکھوں کے سیلاب اشک کو خشک کر دیتی تھی ۔ مگر افسوس ! ایسٹ انڈیا کمپنی کے تند جھونکوں نے سلطنت مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر کے رنگون بھیجدیا تاکہ یہ امت اپنی گذشتہ عظمت کی آخری یادگار کو دیکھ کر اس دور کا تخیل بھی اپنے دماغ میں پیدا نہ کر سکے ۔

غدر کے اسباب کیا تھے ؟ مسلمانوں نے اس تباہ کن سیلاب میں کہاں تک شرکت کی ؟ یہ ایک طویل افسانہ ہے جس پر مختلف طریقوں سے خامہ فرسائیاں کی گئی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہادر شاہ اس غدر سے اسوقت تک وابستہ نہ تھے جب تک کہ باغیوں کی فوج نے قلعہ معلےٰ کا محاصرہ کر کے ان کو مجبور نہیں کر دیا کہ وہ اس معرکہ میں ان کی رہنمائی کریں ۔ وہ اسی طرح باغیوں کے ہاتھوں قید تھے جس طرح غدر سے پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں میں ۔ لیکن باوجود اسکے غدر فرو ہونے کے بعد انگریزی حکومت نے بہادر شاہ اور اُس کی اولاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ برطانوی عہد حکومت کی تاریخ میں ایک بدترین دھبہ ہے جس کے اعادہ کی طاقت نہ یارحلے بیان ۔

اس چمن میں مُرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانوں کے لئے (اقبالؒ)

جب بہادر شاہ کی ٹوٹی ہوئی قبر کا نشان (جس کی مرمت کا خیال خدا کا شکر ہے اب مسلمانوں کو ہوا ہے) رنگون میں ایک پولو گراؤنڈ کے کنارے گھوڑوں کی

مٹا ہوؤں کا نشانہ بنتے ہوئے نظر آتا ہے تو ہمیں ظفرؔ کے اس شعر میں کتنی پیغمبرانہ پیشین گوئی نظر آتی ہے ؎

پئے مغفرت پڑھے فاتحہ بھلا اے ظفرؔ کہاں آنکر
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے مٹا دیا

غدر کا ہنگامہ اپنے ساتھ مسلمانوں کی سلطنت کی یادگار ہی نہیں لے گیا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کچھ عرصہ کے لئے بالکل ہی ختم کر دیا۔ سلطنت کے جانے کا غم اتنا نہ تھا وہ ایک عارضی سی شے تھی اور قانون فطرت کی رو سے اُس کو جانا ہی تھا۔ دنیا ایسے انقلابات سے آگاہ ہے اور بے پرواہ ہے ؎

ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو (اقبالؒ)

لیکن جب تاریخ کے ان صفحات پر نظر جاتی ہے جن میں انگریزوں کے مظالم اور ہندوؤں کی سازشیں پنہاں ہیں جو غدر کے بعد مسلمانوں کے خلاف کی گئیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح آج اس ملک میں مسلمانوں کا وجود باقی ہے۔

غدر کے دوران میں چند ماہ کے لئے دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی جس کو ہندوؤں نے پھر اپنی موت سمجھا اسلئے کہ مسلمانوں کی حکومت کا چراغ سحری پھر روشن ہوا چاہتا تھا جبکہ ان کو "ہندو راج" قائم کرنے کی امید تھی۔ لیکن ہندو مسلمانوں میں ہم آہنگی اور یک جہتی نہ ہونے کی وجہ سے دونوں کے خواب غلط نکلے اور ایک مرتبہ پھر برادران وطن نے انگریزی حکومت کو مسلم حکومت پر ترجیح دی۔

غدر فرو ہونے کے بعد انگریز یہ فرض کر چکے تھے کہ اسکے بانی مسلمان ہیں اسلئے اُنھوں نے پورا تہیہ کر لیا کہ ہر ممکن صورت سے ان کو ختم کیا جائے۔ ان کی حالت انتقامی جذبے میں دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کا مسلمان ہونا ہی ظلم تھا۔ مسجدوں کو اصطبلوں اور فوجی کیمپوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

سر آکلینڈ کالون صاحب گورنر یو۔ پی کے مندرجہ ذیل الفاظ سے انگریزوں کے اس انتقامی جذبے کا پتہ چلتا ہے :۔

"غدر فرو ہو جانے پر ان ہی سے سخت انتقام لیا گیا۔ اور دونوں قوموں (یعنے انگریزوں اور مسلمانوں) میں مصالحت کی امید جاتی رہی"[1]

سر ولیم ہنٹر کا مندرجہ ذیل بیان جو ۱۴ ر جولائی ۱۸۶۹ء کو کلکتہ کے ایک فارسی اخبار میں شائع ہوا حکام وقت کی ہندو نوازی اور مسلم کش پالیسی کو واضح تر کرتا ہے :۔

"[2] اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں اُن پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے   مسلمان اب اسقدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی اُنھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اعلےٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں . . . . . .

۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں

---

[1] مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۵۰ ماخوذ از مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۰۹۔
[2] ایضاً - -

یا وفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے "

اسی طرح مسٹر آئی۔ سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ ہند نے لکھا تھا:۔

"تعلیم[1] یافتہ مسلمان اپنی پرانی قسم کی تربیت پر بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے کو حکومت کے عہدوں اور منافع پر جن پر اب تک وہ قابض تھا محروم پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تمام نفع کے کام ہندو کے ہاتھ میں چلے گئے اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل بے چینی سے لبریز ہو گئے ہیں یا احساس اس خیال پر مبنی نہ بھی ہو کہ ان لوگوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے ستایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مذہب کی وجہ سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے"

یہ تو حالت تھی ملازمت کی، تعلیم کے معاملہ میں بھی وہی انتقامی جذبہ کارفرما رہا۔ غدر سے پہلے ہی مسلمانوں کو تعلیم سے روکا گیا تھا اب اس جذبے میں اور بھی اضافہ ہوا۔ ایڈیٹر ملاپ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ:۔

"پہلے[2] تو حکومت مسلمانوں کے برخلاف تھی اور سمجھتی تھی کہ ان میں سے بہتیرے امن پسند نہیں ہیں اور آج سے نصف صدی پہلے گورنمنٹ کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف تھا۔ لیکن اب وہ صورت نہیں۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا ہے وہ بوڑھے بتلاتے ہیں کہ انگریزی سرکار ہندوؤں کی پوری طرفدار تھی"

ایڈیٹر تیج کا یہ ریمارک بھی ملاحظہ ہو:۔

---

[1] مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۵۱ [2] ملاپ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۲۔

"۱۸۵۷ء کے بعد حکومت مسلمانوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس بات کی کوشش کرتی تھی کہ جہاں تک ہوسکے انھیں دبا کر رکھا جائے۔ ہندوؤں کو ان دنوں اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا"[1]

پھر لکھا ہے :-

"چونکہ[2] اُن دنوں حکومت مسلمانوں سے نالاں تھی اس لئے اسوقت ہندوؤں کی ہی گڈی آسمان پر چڑھی ہوئی تھی اور بہت سے سادہ لوح ہندو سمجھتے تھے کہ انگریزوں کا راجیہ کیا آیا سمجھو کہ ہندوؤں کا راجیہ ستھایت (قائم) ہوگیا"

۱۸۷۰ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو محض وہم وگمان پر مبنی تھا بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبہ بنگال کی چوتھائی تھی ضبط کرلی جس سے ہزاروں مسلمان خانماں برباد اور پریشان ہوکر رہ گئے۔ (خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء از سر عبدالرحیم)

یہ حالت غدر کے بہت عرصہ بعد تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کو احساس ہوگیا کہ اب یہ قوم سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہی۔ سرسید نے بھی انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف جذبے کو فرو کرنے میں بہت کوشش کی جسمیں ان کو بہت کامیابی ہوئی۔ اور حکومت کو اپنی پالیسی میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی۔

اس پالیسی کے تبدیل ہونے سے ہندوؤں میں ناراضگی پھیلی، وہ چاہتے تھے کہ حسب سابق مسلمانوں کو پستی میں ہی رکھا جائے۔ باہمی آویزش کا سبب

---

[1] تیج دہلی ۱۰ جون ۱۹۲۸ء صفحہ ۴۔ [2] تیج دہلی ۱۱ مئی ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۔

پہلا بہانہ اُردو ہندی کے معاملہ میں تلاش کیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں بنارس میں ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں سے اُردو ختم کرنے اور ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کے جاری کرنے کیلئے شورش برپا کی اور اس تحریک کا صدر مقام الہ آباد مقرر کیا۔ اسی زمانے میں فرانس کے مشہور عالم علوم مشرقی مسٹر گارسن و تاسی نے جو ہندوستان تشریف لائے تھے اپنے ایک لکچر میں کہا تھا :-

"ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو انکو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے"

ہندو مسلمانوں سے اسقدر متنفر تھے کہ مسٹر بال گنگا دھر تلک نے جو اب تک کانگریس کے بہت بڑے رہنما سمجھے جاتے ہیں ستمبر ۱۸۹۳ء میں بمبئی میں ہندو مسلم فسادات کے بعد پونا میں گنپتی کا ایک میلہ جاری کیا جس کے جلوسوں میں مسلمانوں کے خلاف گیت گائے جاتے تھے اسی میلہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ بھی کیا اور ایک انجمن مخالف ذبیحہ گاؤ قائم کی۔

باب چہارم

سرسید علیہ الرحمہ کی سیاسی رہنمائی

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں دکھایا گیا ہے غدر کے بعد مسلمانوں کا انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا انگریز ایک طرف ان کو تباہ کرنے پر

مصروف اور ہندو دوسری طرف انگریزوں سے تعاون اور مسلمانوں سے نفرت کر رہے تھے اس طرح مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ ہر چہار طرف تاریکی ہی نظر آتی تھی اسوقت ملت اسلامیہ کو ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو اُن کو اس سیلاب سے نکال کر ساحل تک لے جا سکتا۔ قدرت نے اس کام کے لیے سرسیدؒ کو منتخب کیا تھا۔

سرسیدؒ سلطنت مغلیہ کے عہد میں ایک ذمہ دار افسر تھے غدر میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو وہ خوب محسوس کر رہے تھے اسلئے انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے خلاف جذبۂ انتقام کو جو انگریزوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا فرو کرنا چاہا۔ وہ یہ خوب سمجھ رہے تھے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو اسی طرح دشمن سمجھا اور ہندوؤں کو ساتھ لے کر ان کے کچلنے میں مصروف رہے تو اسپین کی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جائے گی۔ اسلئے انھوں نے انگریزوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور یہ ثابت کیا کہ مسلمان غدر سے بالکل وابستہ نہ تھے نہ ان کی کوئی سازش تھی۔ انھوں نے اسلئے انگریزوں اور مسلمانوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ انتقامی جذبہ ختم ہو۔ اس زمانے میں عیسائی پادریوں اور مسلمان علما میں مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر تلخ نتائج نکلتے تھے۔ سرسید نے اس قسم کے مناظروں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اسی زمانے میں توریت اور انجیل کی تفسیر "تبیین الکلام" کے نام سے لکھی اور اسلام اور عیسائیت میں جو امور مابہ النزاع ہیں اور جو متفق علیہ ہیں انکی تشریح کرکے دونوں کی غلط فہمیوں کو

رفع کرنے کی کوشش کی۔ اسکے بعد ۱۸۶۸ء میں دوسری کتاب "احکام طعام اہل کتاب" کے نام سے لکھی جسکا مقصد بھی باہمی منافرت کو دور کرنا تھا۔ اس کتاب میں احادیث اور آیات قرآنی سے ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے یہاں کا کھانا اور ان کا ذبیحہ جائز ہے بشرطیکہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو۔[1]
ان کوششوں سے انگریزوں کے دلوں سے بہت کچھ جذبۂ انتقام ختم ہو گیا۔
مسلمانوں کی پستی کا اصل سبب ان کے خیال میں انگریزی تعلیم کی کمی تھی۔ اسلئے انھوں نے قوم کو یہی مشورہ دیا کہ وہ سیاسی سب کاموں کو چھوڑ کر تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور سیاست میں کچھ عرصہ تک بالکل دخل نہ دیں۔

سرسید کی اس پالیسی پر اصحاب رائے نے مختلف طریقوں سے نکتہ چینیاں کی ہیں۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف نے سرسید کی عظمت اور دیانتداری کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے کیرکٹر کا ایک غلط اور گمراہ کن پہلو کو قصداً مگر بادل ناخواستہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان کو اپنی کتاب کا ماحصل در مقصد کانگریس کی تعریف کرنا اور مسلمانوں کو جمعیۃ العلماء ہند اور مجلس احرار کے اتباع میں شرکت کانگریس رکھنا تھا اور سرسید کانگریس کی ہندو ذہنیت کی وجہ سے مسلمانوں کو اسمیں جانے سے روکتے تھے اسلئے مصنف موصوف نے غلط دلائل سے عوام کو دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظروں میں سرسیدؒ ہندوستان کی غلامی کے حامی تھے، فرقہ پرور اکمیونلسٹ تھے، انھوں نے اپنی سیاست کا رہنما مسٹر بیک کو بنا رکھا تھا۔ پیرانہ سالی کی وجہ سے انکا دماغ خراب

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۲۰۰۔

ہو گیا تھا وغیرہ وغیرہ، عوام کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے وہ یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ اسلام کے متعلق وہ عجیب عجیب تاویلیں پیش کرتے تھے۔ یقیناً سرسیدؒ کی پالیسی پر اس قسم کے واقعات کو لکھتے وقت خود ان کا ضمیر ملامت کر رہا ہوگا لیکن انسان بعض اوقات اپنے مقصد کو پورا کرنے کیلئے ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جن کو وہ خود مذموم سمجھتا ہے۔

ہر حال حقیقت ہمیشہ چھپی نہیں رہتی۔ وقت گذر جانے پر آئندہ مورخ نتائج سامنے رکھ کر جب فیصلہ کرتا ہے تو حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ واقعات شاہد ہیں کہ اس زمانے میں جو پالیسی سرسید نے اختیار کی تھی اور جو مشورہ مسلمانوں کو دیا تھا وہی اُن کی نجات کا باعث ہوا۔

سرسید کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہندوستان کو غلام دیکھنا چاہتے تھے۔ حقیقت کے چہرہ کو مسخ کرنا ہے۔ ہندوستان کی محبت اُن کے رگ و ریشہ میں موجود تھی۔ انگریز کا وجود وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے لیکن جب وہ دیکھ چکے تھے کہ خود برادران وطن انگریزوں کے استحکام میں معاون ہیں اور ہر وہ چیز جس سے مسلمانوں کا دور ماضی یاد آتا ہے اُن کے نزدیک قابل نفرت ہے، تو انگریزوں سے مسلمانوں کا آمادہ بہ جنگ رہنا خود اُنکے لئے مضر تھا۔ اُن کی حب الوطنی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب بغاوت فرو ہوئی اور انگریز ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں سے نہایت بہیمانہ طور سے انتقام میں مصروف تھے تو سرسید نے ۱۸۵۸ء میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" شائع کیا جس میں خود انگریزوں کو بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ثابت کیا کہ

س بغاوت میں ہندوستانیوں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی کوئی سازش نہ تھی
بلکہ وہ حکامان کمپنی کی لاپرواہی اور رعایا کی ضرررسانی کا نتیجہ تھی۔ سرسید اسوقت
سرکاری ملازمت میں تھے۔ یہ صرف حب الوطنی کا بہت گہرا جذبہ تھا جس نے
انکو باوجود سخت خطرات کے مجبور کردیا کہ صحیح حالات قلمبند کردیں اگرچہ انکے
ہر خیرخواہ نے ان کو اس معرض خطر میں پڑنے سے روکا۔ اس رسالے کی وجہ
سے بعض انگریزی اخبارات نے ان پر باغی ہونے کا الزام لگایا لیکن جب غور
کیا گیا تو ان کی حق گوئی کی داد دیگئی اور ہندوستانیوں کے خلاف جو جذبہ نفرت
انگلستان کے عوام کے دل میں تھا وہ بہت کم ہوگیا۔

جب گورنمنٹ نے غدر فرو ہونے کے بعد ایک بڑی جاگیر ان کو دینا چاہی
تو انھوں نے صرف اسلئے اسکو لینے سے انکار کردیا کہ وہ ایک مسلمان کا ضبط
شدہ علاقہ تھا۔

جن لوگوں نے سرسید کے مضامین، لکچروں اور اُن کے حالات زندگی کا
صحیح مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ سرسید آخر وقت تک سچے ہندوستانی
رہے آخر میں ہندوؤں نے اپنے طرز عمل سے اُن کو بالکل مایوس کردیا تھا اور وہ
ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے قطعاً ناامید ہوچکے تھے جس کی وجہ سے وہ کانگریس
میں شریک ہونا مسلمانوں کیلئے نقصان دہ سمجھتے تھے لیکن جب بھی ہندوستان کا
مفاد انکے ہمیشہ پیش نظر رہا۔ سرسید کے مضامین کے مندرجہ ذیل اقتباسات
اُن کی حب الوطنی کو کسقدر واضح کرتے ہیں :-

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ ہندو

اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان، عیسائی بھی جو
اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب
یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں جو
ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیئے۔[۱]"

ایک مرتبہ پنجاب کے سفر کے دوران میں ہندوؤں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آپ نے جو لفظ (اپنے لئے) ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے
میں درست نہیں کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں
ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا
ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اسکے کہ میں
ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے۔[۲]"

ان الفاظ سے سرسید کی وسیع النظری، وسعت قلب اور حب الوطنی کا کس قدر
پتہ چلتا ہے۔ پھر ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم[۳] نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے
اور ہندو اور مسلمان اس کی دو خوبصورت آنکھیں ہیں اس کی خوبصورتی
اسمیں ہے کہ اسکی دونوں آنکھیں خوبصورت اور برابر رہیں اگر ان
میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی
اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔"

۱۸۸۴ء میں علیگڈھ کالج کے لئے چندہ وصول کرنے آپ پنجاب تشریف لیگئے۔

۱؎ مجموعہ لکچر سرسید صفحہ ۱۶۷ ۲؎ سفرنامہ پنجاب سرسید صفحہ ۱۳۹ ۳؎ سرسید کے آخری مضامین ص۵۵

یہ وہ وقت تھا جب ہندو اُن کی مخالفت پر ایک طرف اور مسلمان علما دوسری طرف ہمہ تن مصروف تھے۔ اسوقت اخبار ٹریبیون نے آپ کے متعلق لکھا تھا:-

+ "ہم اس شخص کے کلمات شکریہ کے ہم اکثر اپنے مسلمان ہموطنوں کی زبانی نہیں سُننے دل سے خوش ہوتے ہیں۔ جو سطیر سر سید احمد خاں بہادر نے قائم کی ہے وہ صرف ان کے ہم مذہبوں کے لائق نہیں ہے بلکہ ہندوؤں کی پیروی کے بھی لائق ہے"

ہندو مسلم اتحاد کے آپ اسقدر حامی تھے کہ ایک مرتبہ کالج کے مسلم طلبا کو آپ نے گئو کشی سے باز رکھنے کی صرف اسلئے کوشش کی کہ انکو صدمہ نہ پہونچے آپنے تحریر فرمایا:-

+ "ہم بارہا اپنی قوم کو سمجھا چکے ہیں کہ گائے کی قربانی سے اپنے ہندو بھائیوں کو ناراض کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ اگر ہم میں اور انمیں دوستی قائم رہے تو وہ دوستی بہت زیادہ گائے کی قربانی سے بہتر ہے"

ان واقعات کے باوجود سر سید کے متعلق یہ کہنا کہ وہ فرقہ پرست تھے محض افترا پردازی اور بہتان طرازی ہے اور مسلمان رہنماؤں کی حب الوطنی کو صدمہ پہونچاتا ہے۔

لیکن ہندوؤں کی متواتر فرقہ پرستی اور مسلم آزار پالیسی نے سر سید کو ان سے اس طرح بیزار کر دیا جس طرح مولانا محمد علی مرحوم کو آخر میں کانگریس اور ہندوؤں سے علحدہ کر دیا تھا۔ انھوں نے ان حالات کو بہت افسوس کے ساتھ

۱؎ سر سید کے آخری مضامین صفحہ ۵۵ ۲؎ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۹۳ء ص ۳؎ ان حالات کو مصنف مذکور الصدر نے ابھی لکھا ہے

اس طرح نقل فرمایا ہے:۔

"انھیں دنوں جبکہ یہ چرچا (ہندی اُردو) بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اُسوقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے کہ آخر میں اُنھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ تمام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ اب تو بہت کم ہے آگے چلکر اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا مسٹر شیکسپیر نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہے تو نہایت افسوس ہے میں نے کہا مجھے بھی بہت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے"

یہ ہے سر سید علیہ الرحمہ کی فرقہ پرستی کا وہ روشن پہلو جس کو عوام کی نظروں سے عمداً پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

دوسرا اعتراض ان کی اس پالیسی پر ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو سیاست سے ابتدا میں باز رکھا اور محض تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ بعض اہنوں نے اور غیر دانے اس پالیسی کو سخت مضر بتلایا ہے یہ مسلمانوں کا روشن مستقبل، اسکے مصنف نے سر سید کی اس پالیسی پر ہر امکانی نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن جو گذشتہ صفحات کے واقعات بہ نظر غور اور بلا تعصب مطالعہ فرمائیں گے وہ خود اسکا فیصلہ کر سکیں گے کہ اُسوقت

وہ پالیسی کس قدر مفید اور ناگزیر تھی۔ ترکوں کی تجدید حیات کیلئے سب سے بہترین نسخہ جو مصطفےٰ کمال نے تجویز کرکے عمل کیا وہ یہی تھا۔ کچھ عرصہ تک ترکوں نے تمام دنیا سے اپنے آپ کو منقطع رکھا اور اپنی اندرونی حالت کے استحکام میں کوشاں ہے۔ چند سال کی کوششوں کا نتیجہ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی "یورپ کا مرد بیمار" آج "لائق فرزند" ہے۔ اسی طرح آج مسلمانوں کی حیات ثانیہ سرسید کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے جسکو موجودہ مورخ دور ماضی کے نکتہ چینیوں سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء[1] کو دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خاںؒ نے مسلمانوں کے لئے جو راہ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھا اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اسی راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔"

عجیب اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کے دوران میں ایشیا کے مختلف حصوں میں بعض عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں کو ایک ہی نسخہ یعنی جدید تعلیم تجویز کیا۔ سرسید احمد خاں ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان و ایران میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔

ان کے متعلق حضرت علامہ اقبالؒ نے تحریر فرمایا ہے:-

"[2] ان لوگوں پر غالباً محمد بن عبدالوہاب کا اثر تھا۔ یہ شخص ۱۷۰۰ء میں نجد میں پیدا ہوا تھا اور اسی کو تحریک وہابیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کو

---

[1] ہمدرد ۲ جنوری ۱۹۳۸ء [2] مضمون اقبال در جواب جواہر لال نہرو ۱۹۳۵ء۔

عہد حاضرہ کے اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ کے نام سے موسوم کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

سرسید احمد خاں کا اثر بہ حیثیت مجموعی ہندوستان میں محدود رہا لیکن انکے متعلق نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دور جدید کا پہلا مسلمان تھا جس نے آنیوالے زمانے کے تیور کو پہچانا۔ اس نے ہندوستان اور مفتی عالم جان نے روس میں مصائب اسلام کے ازالہ کے لئے تعلیم جدید کا نسخہ تجویز کیا۔ لیکن اس بزرگ کی اصل عظمت اس بات پر مبنی ہے کہ اُس نے اول اول اسلام کے تجدد کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لئے نہایت زبردست کام کیا۔ ہم اگر اس کے مذہبی خیالات سے اختلاف بھی کریں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عہد حاضرہ اسکی حساس روح سے بڑی حد تک متاثر ہو گیا تھا۔"

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت کانگریس کوکناڈا ۱۹۲۳ء میں سرسیدؒ کی پوری پالیسی پر بحث کی ہے جس کا ایک اقتباس باوجود قلت مقام درج ہے۔ جس سے سرسید کی پوری پالیسی سامنے آجاتی ہے :-

"اگرچہ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سرسید احمد خاں کی پبلک زندگی اپنی قوم کی ترقی کے مساعی ہی میں صرف ہوئی تاہم وہ ویسے ہی ہندوستانی رہے جیسے مسلمان تھے۔ ان کی بہت سی تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سرگرم محب وطن تھے اور ان کا سینہ اتحاد ہند کے جذبہ محبت سے لبریز تھا۔ جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ وہ

اسکی تصدیق کرسکتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں سے انکی کیسی گہری دوستی تھی
جو اس تعصب کی موجودگی میں قطعی ناممکن تھی۔ جسکا بعض وقت ان پر
الزام لگایا جاتا ہے یہ الزام کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ ہر زمانے کے لئے
مسلمانوں کی سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اپنی اُن دو تقریروں
میں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے انھوں نے جو کچھ بھی دلائل پیش کئے
ہوں اُن سے قطع نظر کرکے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ صرف
دو ہی دلیلیں پیش کرتے تھے جن کی بنا پر خود سید احمد خاں کو بھی یقین
تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس قطعی نامناسب تھی۔ وہ
اس امر کا اچھی طرح اندازہ کرچکے تھے کہ ان کے زمانے کے مسلمانوں
کی طبیعت و مزاج کو اس سے زیادہ کوئی شغل و فعل نہ تھا کہ وہ اپنے
برطانوی غاصبین حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں اور وہ یہ
بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ فعل جتنا آسان تھا ویسا ہی آخرکار کانگریس
جیسی امن پسند سیاسی تحریک کی بقا و ترقی کیلئے بہت ہی خطرناک
ثابت ہوگا۔ یہ پہلی دلیل تھی جس نے سید احمد خاں کو مجبور کیا کہ وہ
اپنی قوم کو سیاسیات میں خاص حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں۔
دوسری دلیل بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی۔ ان کی رائے تھی کہ مسلمان اگر
ترقی چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اشاعت تعلیم میں کوشش کرنی
چاہیئے اور مغربی تعلیم کے حصول کیلئے مسلمانوں کو راضی کرلینا آسان
نہ تھا خواہ اپنی درسگاہ میں ہی کیوں نہوں جیسیں بحالت سرکاری اسکولوں

اور کالجوں کے مذہبی تعلیم بھی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیجاتی ہے۔
مسلمانوں کے لئے یہ آسان تر تھا کہ قابل نفرت حکومت کافرہ کی تخریبی نکتہ
چینی کے مزے لیتے رہیں بمقابلہ اسکے کہ ماہرین تعلیم کے خشک و بے مزہ
تعمیری پروگرام سے دلچسپی لیں۔ لہذا سید احمد خاں نے اپنی تمام تر توجہ
اس پر صرف کردی کہ مسلمانوں کے ساعی کو سیاسی راستے کی طرف رُخ
کرنے سے روکیں جو زیادہ دلکش لیکن ساتھ ہی اسکے کم سودمند تھا۔
پچھلی نسل کے اعمال وافعال پر نظر ڈالتے ہوئے آج جبکہ دقوع واقعہ
کے بعد عقلمند بننا زیادہ آسان ہے سید احمد خاں کا یہ طرز عمل میری رائے
میں نہایت دانشمندی پر مبنی تھا۔ اور اگرچہ میرا جی چاہتا ہے کہ بعض
باتیں جو ان کی زبان سے نکل گئیں کاش کہ وہ نہ کہتے تاہم میں اس
اعتراف پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کا یا بحیثیت مجموعی ہندوستان کا
کوئی خیر طلب، مسلمانان ہند کی رہنمائی کے لئے بغیر اسکے اور کوئی راہ
اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لہذا یہ بھی پیش نظر ہے کہ جس شخص نے مسلمانوں
کا مفاد اسی میں سمجھا کہ وہ نظر بحالات موجودہ کانگریس سے علٰحدہ رہیں
وہ شخص مسلمانوں کے حصہ غالب کا محبوب نہ تھا۔ سید احمد خاں چونکہ
تعلیمات قرآنی کی تفسیر عقل انسانی کے مطابق کرتے اور ان عام پسند
دینیات کے مخالف تھے جو راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مسلمات مذہبی سمجھی
جاتی ہیں اور نیز ان رسوم و روایات کی بیخ کنی میں مصروف ہے جو ٹھیٹ
اسلام کی نظر میں تو مستند نہ تھیں مگر جنھیں مرور ایام نے مذہبی شان

دے رکھی تھی اسلئے انکو محدود کا فرقرار دیا گیا۔ لکھو کھا مسلمان انہیں سخت سُست کہتے بلکہ سب و شتم کرتے اور مدت دراز تک اس کالج کو جو انھوں نے علیگڑھ میں قائم کیا تھا ہوا سمجھتے رہے لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود الزام کفر و الحاد اور باوجود شدت سب و شتم سیاسی پالیسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چون و چرا اسی شخص کی پیروی کی۔ ظاہر ہے کہ کسی منطقی مغالطہ یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی اور میرا یقین ہے کہ سید احمد خاں کو محض اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ان کی رائے صائب تھی"

خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اس پالیسی کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"سر سید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہییں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہ لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی اُن سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط"

مولانا محمد علی اور پنڈت جی کے اِن الفاظ کے بعد سر سید کی پالیسی پر کسی مزید تبصرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی جہاں تک انکے مذہبی اعتقادات کا تعلق ہے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور عاشق رسول تھے۔ انکے رگ و ریشہ میں اسلام کی تڑپ اور مذہب کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی مگر وہ ملاؤں اور نام نہاد علماء کی طرح قدامت پسند

اور جمود کے قائل نہ تھے بلکہ بقول حضرت علامہ اقبالؒ وہ اپنے وقت کے پہلے شخص تھے جنھوں نے آنے والے دور کے تیور پہچان لئے تھے۔ ان کا دعوے تھا کہ مذہب اسلام کا ہر اصول قانون فطرت پر مبنی اور فہم انسانی کے عین مطابق ہے اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے تفسیر قرآن لکھی جسمیں اُن معجزات اور قرآنی روایات کو قوانین فطرت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جن پر عیسائی مشنری معترض رہا کرتے تھے۔

سرسید کی محبت مذہب کا پتہ اس واقعے سے چلتا ہے کہ انکے زمانے میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر ولیم میور نے ایک کتاب لائف آف محمد لکھی جسمیں اسلام اور بانی اسلام پر سخت حملے کئے گئے تھے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی سرسید کی نیند حرام ہوگئی اور سب کام ترک کر کے دوران قیام انگلستان ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے ایک کتاب جواب میں لکھی جسمیں بجائے الزامی جوابات کے خود انھیں کی کتابوں سے انکے دعووں کو غلط ثابت کیا۔

انکے انتقال کے چند روز قبل ہی کسی عیسائی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات پر سخت حملے کئے جبتک آپنے اسکا جواب لکھ کر شائع نہیں کردیا دنیا کا ہر کام اپنے اوپر حرام کردیا۔

لیکن مذہب اسلام اور نبی آخر الزماں کا اتنا عشق رکھنے اور توحید کا اسقدر پرستار ہونے کے باوجود اس زمانے کے علماء نے اور بعض ان علماء نے جو آج انکو سرسید علیہ الرحمہ لکھتے ہیں، انکو ملحد اور کافر کہنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔

جن لوگوں نے زوال بغداد کے بعد سے علما کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب واقف ہیں کہ کس طرح مجاہدین اور مصلحین کو علمار وقت کے ہاتھوں اذیتیں اٹھانا پڑی ہیں۔ ائمہ اربعین کو جو تکالیف منصب پرست علما کے ہاتھوں اٹھانا پڑیں علامہ نیازی وغیرہ نے سکندر شاہ سور کے زمانے میں جو مصائب اٹھائے۔ علامہ محی الدین عربی (جو اسپین کے ایک جلیل القدر فلسفی اور مفسر اسلام گذرے ہیں اور جنکی بزرگی کا آج ہر شخص معترف ہے) امام رازی و امام غزالی نے جس طرح تکفیر کے فتووں کا مقابلہ کیا وہ تاریخ میں آئندگاں کیلئے ہمیشہ موجب عبرت رہیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم نے مسلمانان عالم کیلئے اپنی ہر سانس کو وقف کرکے دنیا کے سامنے عہد صحابہ کی یاد کو تازہ کردیا تھا اور جہاد فی سبیل اللہ کا اعلیٰ اسلامی نمونہ پیش کردیا تھا لیکن اس مجاہد ملت کی آخری زندگی جن مصائب اور جن آفتوں میں گذری وہ ہمارے ان علما کے دامنوں پر ہمیشہ سیاہ دھبہ رہیگی جو آج بھی اپنے فتووں سے مسلمانوں کو کافر بنانے میں بیباک ہیں۔

حضرت علامہ اقبال کے علمی تبحر اور پیغمبرانہ علمی کارناموں سے کون واقف نہیں ہے۔ آج دنیا ماتم میں ہے کہ نہ صرف اسلام کا بہترین فرزند دنیا سے رخصت ہوگیا بلکہ مشرق و مغرب کا واحد عالم رحلت کرگیا۔ مگر ان علما نے اس عظیم المرتبت ہستی کو بھی بدنام کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ علامہ اقبال نے انکی اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے خوب لکھا ہے :-

۱- کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

سرسیدؒ کی مذہبی اصلاح کی جدوجہد علامہ اقبال کے ایک مضمون سے

مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہوتی ہے :-

"لیکن اس بزرگ کی اصل عظمت اس بات پر مبنی ہے کہ اُس نے اول اول تجدّد کی ضرورت محسوس کی اور اُسکے لئے نہایت زبردست کام کیا۔ مسلمانان ہند کی مذہبی جو انتہا کو پہونچی ہوئی قدامت پسندی جو حقائق حیات سے بے بہرہ رہ چکی تھی سرسید احمد خاں کے مذہبی طرز عمل کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ شمالی مشرقی ہندوستان کے علاقہ میں جو باقی ہندوستان کے مقابلہ میں زیادہ پیر پرست واقع ہوا ہے سرسید احمد خاں کی تحریک کے ردعمل کے طور پر مرزائیت نمودار ہو گئی"..

آگے چلکر علامہ موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ سرسید اور انکے ہمعصر مصلحین نے دنیائے اسلام کو تین زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں لانے میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں وہ یہ ہیں :-

(۱) ملائیت (۲) تصوف کی خراب شدہ حالت (۳) وہ اسلامی بادشاہ جن کی نگاہ خالصۃً اپنے خاندانی مفاد پر ہی رہتی تھی۔

ملائیت کے متعلق آپنے تحریر فرمایا ہے :-

"علماء کا وجود ہمیشہ اسلام کیلئے موجب تقویت ثابت ہوا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ اور خاصکر بغداد کی تباہی کے بعد تو وہ بالکل قدامت پسند ہو گئے۔ اور اُنھوں نے اجتہاد کے سلسلہ کو بالکل بند کر دیا۔ لہٰذا انیسویں صدی کے اسلامی مصلحین (سرسید وغیرہ) کا منشا یہ تھا کہ وہ تجدید عقائد کے ساتھ جدید تجربات کی روشنی میں آزادی اجتہاد کو حاصل کریں"۔

جس تصوف کے خلاف ان لوگوں نے کچھ کہا اسکی حالت علامہ موصوف نے یہ لکھی ہے:-

"تصوف روحانی تعلیم کی عظمت سے گر کر بے علمی اور سریع الاعتقادی کا موجب بن چکا تھا اس نے غیر مرئی طور پر بتدریج اسلام کی طاقت کو کمزور کرکے یہاں تک نرم کردیا کہ اسکے نام لیواؤں نے شریعت اسلامی کی شدت ضبط سے نجات حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ انیسویں صدی کے مصلحین سرسید وغیرہ نے اس نوع کے تصوف کے خلاف بغاوت شروع کردی اور مسلمانوں کو جدیدیت کی روشنی میں آنے کی دعوت دی۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ مادہ پرست تھے۔ انکا یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں کو روح اسلام سے آشنا کیا جائے جس کا مقصد مادیت سے فرار نہیں بلکہ اس کی تسخیر ہے۔"

"جہاں تک عیش پرست علما کا تعلق ہے اگر مجھے اختیارات حاصل ہوں تو میں یقیناً اُن قوانین کو ہندوستان میں بھی نافذ کردوں جن کو مصطفٰے کمال نے ترکی میں کئے ہیں۔ ایک متوسط درجہ کے مسلمانوں کی حماقت دراصل ملاؤں کی افسانہ طرازیوں پر مبنی ہے۔ ان علمار کو لوگوں کی مذہبی زندگی سے خارج کرکے اتاترک نے امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی ارواح کو ثواب پہنچایا ہے۔"

جس طرح سرسید ہندوستان میں مذہبی اصلاح میں مصروف تھے اسی طرح جمال الدین افغانی مشرقی اسلامی ممالک میں مصروف جدوجہد تھے، ایران مصر اور ترکی میں ان کی کوششوں کا بہت اثر ہوا۔ مشہور عالم دین مفتی محمد عبدہ اور بعض دیگر مثلاً سعد زاغلول پاشا (مصر) جو آئندہ چلکر مشہور لیڈر بنگئے اُنکے معتقدین میں سے تھے۔ جس طرح مشرقی اسلامی ممالک میں ان لیڈروں نے مصطفٰے کمال اور رضا شاہ پہلوی کی اصلاحوں کے کیلئے زمین ہموار کردی۔ اسی طرح سرسید کی کوششوں سے موجودہ اسلام نئی روح

سامنے ظہور میں آیا۔ اکبر الہ آبادی، حالی، شبلی، مولانا محمد علی مرحوم، حسرت موہانی اسی نئے دور کے پیداوار ہیں اور سب کے سب سرسید کے معتقد ہیں۔

سرسید کی اسی حق گوئی اور اصابت رائے کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو علما کے تکفیر کے فتووں کی قلعی کھل گئی اور دوسری طرف ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے سیاست میں سرسید کی مکمل طور سے اتباع کی اور کانگریس سے علیحدہ رہے۔ البتہ علماء کی مخالفت کا ایک مضر اثر یہ ضرور ہوا کہ عوام جدید تعلیم سے بے بہرہ رہ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے علما آئندہ کے واقعات پر غور کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو رہنمائی کے اجارہ دار سمجھتے ہیں اور دوسری طرف علوم مغربی سے قطعی بے بہرہ اور غنیم کے اسلحہ جات سے مسلح نہونے کی وجہ سے ایک ہی پہلو پر غور کر کے فیصلہ دیدیتے جسکی خلاف ورزی انکے خیال کے مطابق کفر کی حد تک پہونچ جاتی ہے کمال یہ ہے کہ اس قسم کے فتوے ہوا کے رُخ کے ساتھ آئے دن بدلتے بھی رہتے ہیں۔

اگر جدید تعلیم کیلئے سرسید اتنی کوشش نہ کرتے اور علیگڈھ کالج قائم کر کے جدید تعلیم کی بنیاد نہ ڈالدیتے تو نہ معلوم آج مسلمان قوم کا کیا حشر ہوا ہوتا جو برابر دو سو سال پہلے سے انگریزوں اور ہندوؤں کا شکار ہو رہی تھی اور غدر کے بعد تو بالکل دم توڑ چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے مسلم قوم اپنی حیات ثانیہ کے احسان میں سرسید کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے کم ہے۔

سرسید پر تملق اور سرکاری خوشامد کا الزام لگایا جاتا ہے اس کا جواب بھی مولانا محمد علی مرحوم کی زبانی سنئیے :-

"ان کے استاد مزاج کا عمیق مطالعہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ اس امر کا اعلان کردوں

کہ تملق اور چاپلوسی جسکا سیاسی معترضین ان پر الزام رکھتے ہیں انکی فطرت سے
کوسوں دور تھی، یہی نہیں بلکہ تھوڑی سی زمانہ سازی بھی جس کی جھلک انکی
پالیسی میں نظر آتی ہے انکی آزاد طبیعت کو بہت ناگوار تھی"[۱]

باب پنجم

مسلمانان ہند کی سیاست کا دور جدید

مسلمانوں کی جدوجہد کا آغاز

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

مسلمان انیسویں صدی کے آخر تک سیاست ہند سے الگ رہے۔ سر سیدؒ
نے آخری صدی میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور پیٹریاٹک سوسائٹی (مجلس
محبان وطن) ۱۸۶۶ء میں قائم کرکے سیاست کا راستہ کھول دیا تھا لیکن مسلمان
سیاسی حیثیت سے اس درجہ گر گئے تھے کہ اُن میں کمر بستگی اور ہمت بالکل مفقود ہو چکی
تھی۔ لیکن بقول علامہ اقبالؒ ؎

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا — اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

بسا اوقات جبر و استبداد ہی نشتر قدرت کا کام کرتے ہیں اور قوموں کی پستی و
زوال ہی ان کی ترقی کا سبب بنجاتے ہیں۔ جسطرح ترکی قدیم کی راکھ سے موجودہ

۱؎ خطبہ صدارت مولانا محمد علی کوکناڈا کانگریس صفحہ ۱۲۔

ترکی نے جنم لیا اسی طرح انیسویں صدی کے اسلامی مسائل نے اپنی خاکستر سے ایک نئی دنیا تعمیر کر لی اور بیسویں صدی کا آغاز امید کی کرن اپنے ساتھ لایا۔ ؎

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی (اقبال)

کچھ انگریزوں کے مظالم اور برادران وطن کی بیوفائیوں نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دی تھیں اور کچھ تعلیم جدید نے مسلمانوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ سرسید کا لگایا ہوا پودا اب رو بہ ترقی تھا۔ حالی، شبلی اور اکبر جیسے مصلحین نے انیسویں صدی کے آخر ہی میں اس پودے کی آبیاری پوری جانفشانی سے کی تھی۔ اب اقبال، محمد علی، اور حسرت جیسے باغبانوں نے اس "لالہ کی حنا بندی" کی فکر کی۔ برادران وطن مسلمانوں سے کسی طور آمادۂ تعاون نہ تھے۔ اردو کے خلاف عرصہ سے شورش برپا تھی۔ بہار میں انکو کچھ کامیابی ہو چکی تھی بسنہ ۱۹۰۰ء میں سر انٹونی میکڈانلڈ کی مدد سے یو۔ پی میں بھی انکو کامیابی ہو گئی اور اسطرح سرکاری طور پر ہندی زبان کو عدالتی زبان تسلیم کرکے ہندو مسلم عناد کا بیج بو دیا گیا۔ اسی سال مہاراجہ دربھنگہ کی صدارت میں بھارت مہامنڈل کا عظیم الشان جلسہ دہلی میں ہوا تھا۔ مہاراجہ صاحب کا پاپیادہ وید کو ہاتھ میں لیکر سفر کرنا اسی سال کا مشہور واقعہ ہے۔ مسلمانان ہند کو اپنی کمزوریوں اور برادران وطن کی بیوفائیوں کا اب احساس ہو چلا تھا اور انھوں نے سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ انگریز اور ہندو مسلمانوں کے برابر دشمن ہیں اسلئے انھوں نے اپنی سیاسی تنظیم کی طرف کوشش شروع کی نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک کی تقریروں تحریروں اور دوروں نے مسلمانوں میں کافی جوش پیدا کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا اعلان کیا گیا جسکی رو سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ترقی کا کچھ موقع مل گیا لیکن اسکے خلاف بنگالیوں نے بیحد شورش کی اور ہر ممکن طریقے سے اسکی مخالفت کی بم پھینکے گئے، مسلمانوں پر حملے کئے گئے۔ اور جو کچھ مخالفت میں کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔ بندے ماترم کا گیت اُسیوقت سے اختیار کیا گیا۔ ۱۹۰۶ء کے آغاز میں سکریٹری آف اسٹیٹ "جان مارلے" کی تقریر بجٹ کے سلسلے میں ہوئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جدید ریفارم نافذ کرنا چاہتی ہے اسی تقریر کے بعد لارڈ منٹو نے ایک کمیشن جدید اصلاحات کے نفاذ پر غور کرنے کیلئے بٹھایا جس سے مسلمانوں کو اپنی تنظیم کا اور بھی خیال ہوا اور اپنے مطالبات پیش کرنے اور اپنے حقوق کو منوانے کیلئے جدوجہد شروع ہوئی۔ نواب محسن الملک مرحوم کی کوششوں سے تمام ہندستان کے سیاست دان مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو گئے اور ایک میموریل مرتب کیا گیا جسکو ایک نمائندہ وفد نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو گورنر جنرل کے روبرو پیش کیا۔ اس وفد سے کانگریس بہت چراغ پا تھی اور مسلمانوں کی اس قسم کی کوششوں کو بہت بُری نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس میموریل میں مسلمانان ہند کی گذشتہ عظمت اور موجودہ اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کونسلوں میں موثر اور جائز نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا اور نمائندگی میں جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا تاکہ مسلمان اپنے نمائندوں کو خود منتخب کر سکیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کیلئے مناسب اور بقدر تناسب حصے پر زور دیا گیا۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی نشستوں کے تعین کی درخواست کیگئی اس طریقہ پر یونیورسٹی کے سینڈیکیٹوں اور سنیٹوں کیلئے بھی زور دیا گیا اسی طرح کونسلوں اور اسمبلیوں میں ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انکو موثر "وزن" یعنی انکی تعداد سے کچھ

زیادہ نمائندگی دینے پر زور دیا گیا۔

اس وفد کے بعد اس امر کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کی ایک علحدہ باقاعدہ جماعت بنائی جائے جو ان کے مفاد کیلئے کوشاں رہے۔ لہذا ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اسکے لئے گذشتہ چھ سال سے برابر کوشش جاری تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم اگرچہ اس زمانے میں ملازمت میں تھے لیکن اسکی تاسیس میں آپ نے بیحد محنت برداشت کی۔ مولانا محمد علیؒ کے الفاظ میں :-

"۱۹۰۶ء کے آخر میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے ذمہ دار سید احمد خاں کے کالج کے سپوت ہی تھے، اب مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا"

اسکا نصب العین "مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور ہمسایہ اقوام میں اتحاد و اتفاق" قرار پایا۔

یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے پہلی جماعت تھی جو اس وقت قائم ہوئی اسکے قیام سے مسلمانوں میں ایک مرکزی پلیٹ فارم بنگیا۔ جہاں ہر سال جمع ہوکر وہ سیاسی جدوجہد کرسکتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی یہ اجتماعی قوت اور مرکزی تنظیم برادران وطن کو کب بھلی معلوم ہوسکتی تھی وہ تقسیم بنگال کی وجہ سے پہلے ہی سے ناراض تھے اسلئے انھوں نے اسی سال ہندو مہا سبھا کی بنیاد رکھدی جسکا مقصد محض مسلم لیگ کی مخالفت کرنا تھا۔ اسطرح برادران وطن نے علاوہ ایک حربے کے جو وطنیت کے لباس میں پہلے ہی سے کانگریس کے نام سے موجود تھا دوسرا نیا حربہ

"ہندو مہا سبھا" کے نام سے ایجاد کیا تاکہ مسلمانوں کی ہر محاذ سے مخالفت کی جا سکے لہٰذا آئندہ جاکر جو تجاویز مسلم لیگ پاس کرتی تھی بعینہ وہی ہندو مہا سبھا نے پاس کرنی شروع کر دیں حتےٰ کہ جب کبھی مسلم لیگ نے مسلمانوں کی اقلیت کی وجہ سے نمائندگی وغیرہ کی درخواست کی تو ہندو مہا سبھا نے ہندوؤں کی اکثریت کے باوجود ایسی ہی درخواست کی۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد اسکا پہلا اجلاس کراچی میں ہوا مسلم لیگ کے قیام سے مسلمانوں میں بیداری کی کچھ جھلک نظر آنے لگی تھی سیاسی پستی اور دشمنوں کے مظالم نے ان کو کافی سبق دیدیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم جدید کا نسخہ مردہ لاش میں رفتہ رفتہ زندگی پیدا کر رہا ہے۔ حرکت اور بیداری کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ کچھ قدرت کو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت قائم رکھنا منظور تھی اسی زمانے میں مغربی افق پر ترکوں اور جزیرۃ العرب کے خلاف جنگ کے بادل اُٹھتے نظر آتے تھے اور یورپ کے دیرینہ اسلامی مشرقی حکومتوں کی طرف دندان آز تیز کر رہے تھے۔ اس نے مسلمانوں کی غفلت کو اور بھی جلد دور کرنے میں مدد دی۔ تمام ہندوستان کے مسلمان غفلت کو چھوڑ کر میدان عمل میں آنیکی تیاری کر رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ علامہ اقبال ؒ نے مارچ ۱۹۰۷ء میں مژدہ سنایا تھا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

جب اس نظم کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا تو حکومت پنجاب کی طرف سے بہت شبہات

کئے گئے تھے اسلئے کہ اس زمانے میں یہ پہلی صدا تھی جو "دیار مغرب کے" رہنے والوں کے خلاف بلند ہوئی تھی اور ان کو بتلایا گیا تھا کہ خدا کی کسی دکان نہیں ہے"۔ اور یہ

"کہ اب جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زر کم عیار ہو گا"

لیکن بہرحال برادران وطن کی مخالفت برابر بڑھتی گئی جسکو کم کرنے کیلئے کافی کوششیں کی گئیں بالخصوص مسٹر گوکھلے نے ۱۹۰۷ء میں مختلف مقامات کے دورے کئے اور علیگڑھ اور دوسرے مقامات میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریریں کیں۔ علیگڑھ میں آپ نے ایک تقریر کے دوران میں خود اعتراف کیا کہ :۔

"چونکہ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے لہذا انکو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں۔ یہ خیال ایسا نہیں کہ اسکو مذاق میں اڑا دیا جائے۔ جو حالت بلحاظ مردم شماری وغیرہ اسوقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی حالت ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے یہی اعتراض ہمارے دلوں میں جلوہ گر ہوتا اور ہم بھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار رہتے جس پر کہ اسوقت مسلمان عمل کر رہے ہیں۔"

اسکے بعد دونوں طرف سے مصالحت کی کوشش ہوتی رہی۔ مسلم لیگ کے سیاسی وجود کو ۱۹۰۹ء کی جدید اصلاحات میں تسلیم کرلیا گیا تھا اور اسکا جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کرلیا گیا تھا۔

سر ڈبلیو ایڈ برن جو ۱۹۱۰ء میں کانگریس کے صدر تھے اور سر آغا خاں میں انگلستان میں ہندو مسلم مسئلہ پر تبادلہ خیالات ہوا۔ دونوں کے مشورے سے اسی سال میں

ایک اتحاد کانفرنس کرنے کی تجویز کی گئی۔ مسلم لیگ اسوقت لکھنؤ منتقل ہو چکی تھی
اور اسی سال جبکہ کانگریس کا صدر ایک اعلیٰ خطاب یافتہ شخص تھا مسلم لیگ کا سالانہ
اجلاس ناگپور میں سید نبی اللہ صاحب علیگ کی صدارت میں ہوا جنکے خطبۂ صدارت
اور اس اجلاس کی پاس کردہ تجاویز سے ثابت ہے کہ مسلم لیگ کانگریس سے ایک قدم آگے
نکل گئی تھی۔ خطبۂ صدارت میں سرحد میں فوج کی کمی اور غریب جنگ کی تخفیف پر بہت
زور دیا اسی اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد پر کافی زور دیا گیا۔ چنانچہ الہ آباد میں اتحاد
کانفرنس منعقد ہوئی مگر مالویہ جی اور دوسرے کانگریس کے ہندو مہاسبھائیوں کی
تنگ ذہنیتوں کی وجہ سے کوئی کام نہ ہو سکا۔

یہی وہ مبارک سال ہے جبکہ مولانا محمد علی مرحوم ملازمت چھوڑ کر سیاست میں
داخل ہوئے۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش اور روز افزوں سیاسی
بیداری کی حالت میں ملت اسلامیہ کو ایسے رہنما کی سخت ضرورت تھی جو انکے جوش عمل
کو صحیح راستے پر لگا دے۔ جو خود بھی محض ایک دُرِ تابندہ پروردہ آغوش موج نہ ہو بلکہ
جسکا دریائے لذت طوفان سے آشنا ہو۔ خدا کو مسلمانوں کی صحیح رہنمائی منظور تھی کہ مولانا
محمد علی جیسے انشا پرداز، سیاسی مدبر اور غازی کردار و گفتار کو انکے مسلمانوں کا خضر راہ
بنا کر بھیجدیا بلکہ جیا سی مطلع ہونے والی جنگ عظیم کے تاریک و طوفانی بادلوں سے
دھندلا ہو رہا تھا اور مغربی افق پر جوے خون مسلم کی شفق نمودار ہو رہی تھی اسوقت
مولانا محمد علی کی رہنمائی مسلمانوں کے درماندہ مگر تو خیز اور آمادۂ کارزار کاروان
کیلئے آوازِ رحیل کارواں ثابت ہوئی۔ بہت عرصہ سے مولانا ملازمت سے تنگ
آ کر اپنی سرگرمیوں کیلئے کسی وسیع میدان کی تلاش میں تھے جسمیں اپنے خیالات

اور جوش عمل کا صحیح استعمال کر سکتے اور اسلام اور ہندوستان کی خدمت کر سکتے اور جبکہ ان کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے وزارتیں اور بڑے بڑے عہدے پیش کئے جا رہے تھے، بڑودہ کی وزارت سرمائیکل اوڈوائر کے اصرار سے اور بیگم بھوپال کی چیف سیکریٹری شپ کے گرانقدر عہدے انکو بعد التماس دیئے جا رہے تھے انھوں نے صرف خدمت اسلام کی خاطر سب کو چھوڑ کر ایک راہ اختیار کر لی جیسا کہ ہمیشہ قائم رہے "سچ" کے محترم ایڈیٹر نے بالکل سچ فرمایا ہے :-

"کامریڈ کے ایڈیٹر کیلئے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسی ادارت اسکے لئے خالی تھی مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اسکے لئے چشم براہ تھی۔ عزت ثروت، اقتدار، وجاہت کے اصنام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا۔ لیکن اس کشتہ عشق نے ماسوا کی جانب نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا اور سارے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا۔"

ہندوستانی سیاست میں مولانا محمد علی کے داخل ہونے کے بعد ہوا کا رُخ یکسر بدل گیا اب سیاست کی نرمی اور ریچھے دار تقریروں اور تحریروں کا زمانہ ختم ہونے لگا۔ اسلامی سیاست میں بالخصوص ایک نئی روح آگئی اُسکے بعد سے مولانا محمد علی کی وفات تک اسلامی سیاست کا دار و مدار ان ہی کی ذات پر رہا۔ ہندوستان کی مکمل سیاست مولانا محمد علی کے سوانح حیات میں موجود ہے۔ سلاااء میں کامریڈ کلکتہ سے نکلنا شروع ہو گیا جس کی ابتدائی منزل ہی میں دنیا کو معلوم ہو گیا کہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ کامریڈ کے ایڈیٹر نے اقبال کی زبان میں بآواز بلند کہا

اب اس "دورِکہن" یعنے انبارِ خس و خاشاک کو نالۂ آتشناک سے جلا کر اک جہان نو کی بنیاد ڈالنا تھی اسلامی دنیا کی تجدید حیات کیلئے "نئے صبح و شام" پیدا کرنے ہونگے ؏

ستارے ہیں یہ پرانے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز (اقبال)

انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے دنیائے اسلام کو بتایا کہ ؎

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

بساطِ سیاست پر آتے ہی انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارا حقیقی دشمن یورپ کا استعمار ہے۔ وہی ترکوں کو ہضم کرنے کی فکر میں ہے وہی مصر اور فلسطین کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ ہندو صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے دشمن ہیں لیکن عیسائیت دنیا میں کہیں بھی اسلام کا وجود گوارا نہیں کرتی۔ اسلئے ہندوؤں کی تمام بیوفائیوں اور تنگ ذہنیتوں کو بھول جاؤ اور باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیکر مشترک دشمن کے خلاف رزم آرا ہو جاؤ۔

مسلمان اگرچہ برادران وطن کے دل آزار طرز عمل اور تباہ کن پالیسی سے بیحد دل برداشتہ تھے اور اگرچہ انکے زخموں کی تکالیف ابھی تک تازہ تھی لیکن انھوں نے اپنے محبوب رہنما کے اس مشورہ کے خلاف ایک قدم نہ اٹھایا۔

حکومت برطانیہ کے متواتر مظالم اور مسلمانوں سے وعدہ خلافیاں مسلمانوں کو روزانہ نئے سبق مہیا کر رہی تھیں کہ برطانیہ مسلمانوں کی دوست ہرگز نہیں ہو سکتی۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان

ایسے حالات میں ۱۹۱۱ء میں بہت تزک و احتشام کے ساتھ دہلی میں تاجپوشی کا دربار ہوا اسمیں ملک معظم نے مسلمانان ہند سے مشورہ کئے بغیر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا جس نے مسلمانوں میں سخت اضطراب و استعجاب پیدا کر دیا۔ اُن کو اسکا خیال بھی نہ تھا۔ وہ اس تقسیم سے بہت مطمئن تھے۔ مشرقی بنگال کے مسلمان کاشتکاروں کو ایک گونہ ترقی کا موقع مل گیا تھا۔ لارڈ کرزن خود ڈھاکہ جاکر مسلمانوں کو یقین دلا چکے تھے کہ وہ اس تقسیم کی رو سے ایک علیحدہ اسلامی صوبہ قائم رکھیں گے۔ لیکن اب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ برطانیہ کے وعدے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ حکومت برطانیہ طاقت اور شورش کے سامنے جھکتی ہے۔ مسلمانوں نے قصداً (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء) کی شورش میں کوئی حصہ نہ لیا تھا لیکن اس بے اعتنائی اور عدم توجہی نے جو مسلمانوں کے ساتھ برتی گئی مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا مادہ پیدا کر دیا۔ دوسری طرف کانگریس اس اعلان سے بیحد خوش تھی۔ کانگریس اگرچہ قومیت کی دعویدار تھی لیکن ابتدا ہی سے فرقہ پروری کی ذہنیت اسمیں موجود تھی لہذا تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس نے بہت کچھ شورش بپا کی۔ تاریخ کانگریس مصنفہ پٹابھائی سیتا را مایہ میں صفحہ ۱۰۱ میں یہ واقعات صاف تحریر ہیں :-

"کانگریس کی تاریخ میں سب سے پہلا ایجی ٹیشن (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک) پانچ سال رہا۔ جسکو دبانے کی کافی کوشش کی گئی جس کی وجہ سے شورش بہت زیادہ بڑھ گئی اور آخرکار شاہی اعلان کے وقت ۱۹۱۱ء میں کامیابی حاصل ہوئی جسمیں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ اس احسان کے بدلے میں

کانگریس کے لیڈروں نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ حکومت کے انصاف وعنایات کے شکریے ادا کئے[1]۔ مسٹر امبکا چرن مزندار نے فرمایا:۔ "ہر شخص کا دل تاج و تخت برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور محبت کی فرط خوشی میں سے بے چین ہے۔ ہم میں سے اکثر تو آزمائش کے موقعوں پر بنی برطانیہ کے انصاف سے مایوس ہو رہے تھے۔"

اس سے برادران وطن اور کانگریس کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس اعلان نے مسلمانوں کو پوری طرح بیدار کر کے سرگرم عمل کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان سیاسی حیثیت سے سب قوموں سے آگے نکل رہے ہیں۔ کانگریس نے جو پوزیشن ابتک حاصل نہ کی تھی[2] وہ مسلم لیگ نے صرف پانچ سال میں حاصل کر لی۔ ۴ مارچ ۱۹۱۲ء میں نواب صاحب ڈھاکہ کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں بہت پُر درد الفاظ میں حکومت کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کے تھی۔ جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں سے گذر گیا۔ مگر اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔"

حقیقت میں حکومت کی تقسیم بنگال کی پالیسی اور پھر اسکا اعلان تنسیخ محض ایک سیاسی چال تھی۔ بنگال کا یہ تقسیم اور تنسیخ کا معاملہ اصل میں دارالسلطنت کا کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا ایک ضمیمہ تھا تاکہ اس تبدیلی کے خلاف جو شورش ہوتی وہ اس

---

[1] اسکے لئے ملاحظہ ہو باب آئندہ۔ [2] وقار حیات صفحہ ۶۹۹۔

اعلان سے کم ہوجاتی - اسی لئے اس اصول معاوضہ پر عمل گیا۔
مولانا محمد علی مرحوم نے اسوقت جہاں ایک طرف مسلمانوں کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا وہاں یہ بھی کامریڈ میں لکھا :-

"تقسیم بنگال سے قبل مسلمانوں نے ہر طرح کے مصائب اُٹھائے تھے۔ اور دنیا کے ہرنا تواں کی طرح انھیں نہایت صبر و سکون سے برداشت کئے تھے۔ انہوں نے تقسیم بنگالہ کیلئے نہ تو کوئی شور و شغف برپا کیا تھا اور نہ کوئی جدوجہد کی تھی۔ بایں ہمہ تقسیم بنگالہ ان کے حق میں حق بہ حقدار رسید اور نعمت غیر مترقبہ دونوں ثابت ہوئی تھی۔ ان کی حالت کی ترقی کے ساتھ ان کی امیدیں اور توقعات بھی روبہ ترقی ہو رہی تھیں یہ صحیح ہے کہ ہر نو دولت کی طرح ان سیاسی نو دولتوں نے بھی اپنی امیدوں کا پیمانہ بہت بلند کر لیا تھا اور بعض اوقات مور کی طرح پیچ و خم دکھانے لگے لیکن بھنگ کا نشہ کتنی دیر تک رہ سکتا ہے۔ چند ہی روز میں ردعمل شروع ہوا اور اس قیامت کے ساتھ کہ انھیں ہلا دیا۔ یہ آزاد شدہ غلام پھر قید غلامی میں آ گئے۔ اور آہ! لذت انتقام سے کون دست بردار ہو سکتا ہے۔ ان کے آقایانِ قدیم بالکل قابل معافی ہوتے اگر دوبارہ اپنے غلاموں کو قابو میں پاکر مشق تازیانہ ذرا اور زور کے ساتھ کرتے۔ مشرقی بنگال کے مسلمانوں سے ان کے حاکموں کی طرف سے جنگ میں خود ان کے ہمسایوں کے خلاف کام لیا گیا۔ اور اب جبکہ ان حکمرانوں کیلئے جنگ کا جاری رکھنا آسان نہ تھا تو انھوں نے اپنی صلح تو آسانی اور جلدی سے کر لی۔ اور مسلمانوں کو ان

لوگوں کے رحم پر چھوڑ دیا جنکے خلاف ان کو جنگ کرنے پر مجبور کیا گیا
تھا۔ تاریخ میں بیوفائی اور غداری کی اس سے ذلیل تر مثال کا ملنا دشوار ہے"

یہ حالت تو ہندوستان میں تھی۔ ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک کے مصائب نے
مسلمانان ہند کی بے چینی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مصر کی سیاست ناقابل اطمینان تھی
ترکی اور ایران کے جدید نظام دستوری کی در پردہ مخالفت انگلستان میں کی جا رہی
تھی۔ روس جاپان سے شکست کھا کر اپنے پرانے دشمن برطانیہ سے اتحاد کر چکا تھا اور
ترکی اور ایران کیلئے خطرۂ عظیم ثابت ہو رہا تھا۔ یورپ کے خطرناک "اصول معاونہ"
پر عملدرآمد کر کے اسلامی ریاستوں کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ مراکش فرانس کے اسلئے
حوالہ کر دیا گیا تھا تاکہ مصر میں انگریزوں کو آزادی حاصل رہے۔ طرابلس اٹلی کیلئے
چھوڑ دیا گیا تھا۔ جرمنی سے بندرگاہ آگا در پر جہاز بھیجنے پر مشہور معاملت ہو چکی تھی۔
سلاواء کا اختتام آغاز سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ ترکی جنگ
طرابلس میں سخت بے رحمی سے شہید کئے گئے تھے۔ جس سے ہندوستان کے
مسلمانوں میں بہت اضطراب تھا۔

اسی سال روسیوں نے شمالی ایران میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت بہیمانہ
سلوک کئے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے مجتہد ثقتہ الاسلام
کو بہت سے مسلمانوں کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں کو
بیحد زخمی کر دیا اور اسپر اٹلی کی کعبۃ اللہ شریف پر دھمکی اور مشہد مقدس پر روسیوں
کی گولہ باری نے اور بھی نمک پاشی کی۔

سلاواء میں جب اٹلی نے جزیرہ ٹریپولی پر حملہ کیا تھا تو مسٹر شہر ممکبس کا ردعمل

جو برطانوی سفیر متعینہ دیانا تھے بیان کیا تھا کہ "بہت جلد اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا"
ڈر تھا کہ خدانخواستہ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہ ہو جائے۔

ابھی طرابلس کے شہیدوں کے خون کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان میں جنگ چھڑ گئی اور ترکوں کو بہت نقصانات برداشت کرنے پڑے ایک مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترک یورپ سے ختم ہوا چاہتے ہیں۔ انگلستان کی اس روش نے جو اس نے مراکش، ترکی اور ایران کے دشمنوں کے ساتھ اختیار کی ہندوستان کے مسلمانوں کو قطعی مایوس کر دیا تھا۔ اسی سال جنوری کے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ میں نواب وقار الملک صاحب نے ایک مضمون میں قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گیا ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدے میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے، لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ ہر قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔"

اس اعلان سے مسلمانوں کی سیاست کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد کیلئے مولانا محمد علی مرحوم نے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد روانہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ کام بہت مشکل تھا لیکن مولانا کی اپیل پر مسلمانان ہند نے چندوں کی بوچھار کر دی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اس زمانے میں میدان سیاست میں نو وارد ہوئے تھے۔ عوام اگرچہ اُن سے ناآشنا تھے لیکن مولانا محمد علی کی نظر انتخاب نے اس کام کیلئے ان ہی کو سالار وفد بنایا۔ جو خدمات اس وفد نے ترکی میں انجام دیے وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

مولانا ظفر علیخاں صاحب بھی ترکوں کی صحیح حالت معلوم کرنے اور مسلمانان ہند کو ان کی مظلومی سے آگاہ کرنے کیلئے ترکستان گئے اور وفد میں شریک ہو گئے جنکی تقریروں اور تحریروں نے ترکستان میں مسلمانان ہند کی ہمدردی کو اچھی طرح ظاہر کر دیا۔ ہندوستان میں جب یہ وفد لوٹ کر آیا تو ہر جگہ اسکا استقبال ہوا اور انکی خدمات پر مبارکبادیاں پیش کی گئیں۔

غرضکہ اس سال مسلمانان ہند میں عام بے چینی اور اضطراب کی حالت برپا تھی۔ علامہ اقبال کی اکثر شرربار نظمیں، شمع و شاعر، شکوہ و جواب شکوہ وغیرہ۔ اسی سال مسلمانوں کو بے چین کر رہی تھیں۔ الہلال اور کامریڈ کلکتہ سے بہت آن بان سے نکل رہے تھے۔ اسی سال مولانا شوکت علی صاحب نے "خدام کعبہ" کی بنیاد رکھی تھی۔

۱۹۱۳ء کے خونی واقعات | ہندوستان کی سیاست بیرون ہند کے مسلمانوں بالخصوص ترکوں کی سیاست سے بہت کچھ متاثر ہو رہی تھی۔ ترکوں کے خلاف یورپ کی متحدہ طاقتوں کی سازشیں مسلمانان ہند کے اضطراب اور جوش میں روز بروز اضافہ کر رہی تھیں۔ ان کی نظریں ترکی سیاست کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

جنگ بلقان کے بعد ۱۹۱۳ء میں ترکی میں صلح کانفرنس راشد پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اتحادی ایڈریا نوپل کو ترکی مقبوضہ ماننے پر تیار نہ تھے۔ ترکوں کا مطالبہ تھا کہ ایڈریا نوپل کے علاوہ البانیہ اور مقدونیہ کو بھی ترکوں کے ماتحت رکھا جائے وہ اسپر تیار رہتے تھے کہ مقدونیہ میں عیسائی ریاست اور البانیہ میں ترک مسلمان ریاست قائم رہے لیکن سلطان کے ماتحت رہیں لیکن اتحادی منظور نہ کرتے تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ترکوں کی حمایت میں بہت مضامین لکھے۔

یونانی ترکوں سے برابر جنگ آزما تھے اور اتحادی ترکوں کی مخالفت میں برابر سرگرم عمل تھے۔ ایڈریانوپل میں ترکوں کی شکست اور دشمنوں کے قبضہ کی خبر ہندوستان میں بہت صدمہ کے ساتھ سنی گئی۔ جس نے ہر مسلمان کو رنج میں مبتلا کر دیا ترکوں کی شکست خوردہ فوجوں اور مفتوح رعایا کے ساتھ عیسائی فوجوں نے جس طرح انتقام لیا اور جو مظالم ان کے ساتھ کئے وہ ایک لرزہ انگیز داستان ہے۔ البانیہ میں مسلمانوں کا قتل عام معمولی چیز تھا۔ مقدونیہ میں جتنے مظالم مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے ان کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ ان عیسائی عورتوں کو جو مسلمان ہو گئی تھیں زبردستی عیسائی بنایا گیا اور ان کے خاوندوں کو قتل کر دیا گیا۔ بعض اوقات ایک گھنٹی شہر میں بجائی جاتی تھی اور تمام مسلمانوں کے لئے حکم تھا کہ وہ اُس گھنٹی کے بجتے ہی فوراً چرچ میں چلے جائیں۔ جو حکم کی تعمیل فوراً نہیں کرتا تھا اُسکو گولی سے مار دیا جاتا تھا۔

Sers (سیرس) میں ایک لاکھ چوبیس ہزار مردوں میں سے صرف بیس ہزار مردوں کو زندہ چھوڑا گیا تھا۔ روم کے ایک جرنلسٹ کے بیان کے مطابق دو لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں کو مجموعی طور سے شہید کیا گیا تھا۔ (کامریڈ ۱ر فروری ۱۹۱۳ء)

رفتہ رفتہ مراکش اور طرابلس ترکوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ ایران کی حالت خطرہ میں تھی آخرکار ۳۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو سینٹ جیمس پیلس میں ترکوں اور ریاستہائے بلقان میں ۱۲ بجکر چالیس منٹ پر صلح ہوئی۔ اس صلح میں ترکوں کے ساتھ سراسر ناانصافی کی گئی۔ اس صلح سے نہ ترک مطمئن تھے نہ ہندوستان کے مسلمان۔ آخرکار جب ایڈریانوپل کو ترکوں نے فتح کر لیا تو برطانیہ نے

اس فتح کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جس سے اس کی بدنیتی کا راز افشا ہو گیا۔ ابتدا میں ایڈریا نوپل کے معاملہ میں سرکار برطانیہ غیر جانبدار تھی لیکن جب اتحادیوں نے اسکو فتح کر لیا تو ان کی فتح کو تسلیم کر لیا مگر جب ترکوں نے اسکو فتح کیا تو گورنمنٹ برطانیہ اسکی فتح کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔

انگریزوں کی ان روباہ بازیوں نے مسلمانان ہند کے جذبات میں ایک آگ سی لگا دی وہ کھلم کھلا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ انگریز مسلمانوں کو دنیا سے فنا کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان باوجود اپنی وفاداری کے انگلستان کی ان حرکتوں کی وجہ سے ان کے سخت مخالف ہوتے گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ اس طرح وہ مکہ اور مدینہ کو تباہ کر دیں گے اور ترکوں کو یکسر فنا کر دینگے۔ پھر یورپین مدبرین کی تقریریں صاف بتا رہی تھیں کہ "یہ محض سیاسی جنگ نہیں ہے بلکہ اسلام اور عیسائیت کی پرانی دشمنیوں کا انتقام ہے۔"

شاہ فرڈی نینڈ نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ "یہ جنگ "صلیبی جہاد" کی یادگار ہے۔"

مسٹر اسکوئیتھ (جو اس زمانے میں وزیر خارجہ سلطنت برطانیہ تھے) کی تقریروں میں صاف صاف "اعلان جہاد" کا پتہ چلتا تھا یہاں تک کہا گیا کہ

"ساتویں صدی سے سترھویں صدی تک مغرب کو جو صدمات اسلام نے پہونچائے۔ اب ان سب کا بدلہ لیا جا رہا ہے اور اس طرح ایک طرف ترکی سے اور دوسری طرف ہر جگہ سے اسلامی طاقت کو تباہ کیا جائے گا۔"

اسلامی سیاست کے یہ حالات مسلمانوں کو برابر دل برداشتہ کر رہے تھے۔ ۱۹ فروری

۱۲ ربیع الاول کو تمام ہندوستان میں ترکوں کی فتح کی دعا مانگی گئی۔ ترکوں کی مالی امداد کے لیے "ہلال احمر" سوسائٹیاں قائم کی گئیں اور ترکی مشکلات کے ذریعہ ترکی حکومت کو قرضہ کے لئے چندے کئے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانان ہند نے ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی امداد مالی کی۔

مسلمانوں کے جوش کی یہ حالت تھی کہ ایک سرحدی عورت نے اپنے نو ماہ کے بچے کو "ہلال احمر" سوسائٹی کے حوالہ کر دیا تھا۔ جو سالٹھ پونڈ میں نیلام کیا گیا تھا۔ جس سے اس عورت کی تشفی ہوئی

(خط از مولانا ظفر علی خاں بخدمت ایڈیٹر آؤٹ لک منقول از کمرڈ یہ ۱۰ مارچ ۱۹۱۳ء)

ہندوستان کے مسلمانوں پر جو عام بے چینی اس وقت طاری تھی اسکا صحیح اندازہ مولانا محمد علیؒ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو مرحوم نے ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء کو سسل ہوٹل لندن میں اسلامک سوسائٹی کی ڈنر میں کی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا:-

"باوجود مسلمانوں کی وفاداری کے جو واقعات ٹریپولی بلقان اور پرشیا میں رونما ہوئے اُن کی وجہ سے جتیار مسلمانوں نے بہت دنوں تک کھانا تک بھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ اور گھروں کے معمولی معمولی کام بھی وہ نہیں کر سکے۔ ہمارے منہ میں کھانا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اور نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ سب امیر وغریب پریشان تھے اگرچہ امرا اپنے افسوس کو ظاہر کرنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ ہر شخص کی آنکھ آنسوؤں سے تر تھی

لہ علیگڑھ کے طلبا نے بالخصوص تقلیل غذا کی تحریک شروع کر دی تھی اور اسطرح جو رقم بچتی تھی وہ ترکوں کی امداد کیلئے بھیجی جاتی تھی۔

ہم ان کی آنکھوں کو کیسے خشک کر سکتے تھے جب خود ہماری آنکھیں سیلاب اشک بنی ہوئی تھیں۔" (کمریڈ ۹ ۲ر نومبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۴۲۸)

مولانا محمد علی مرحوم نے دوران قیام لندن میں برطانوی وزرا سے ملکر مسلمانان ہند کے جذبات کی ترجمانی کرنی چاہی اور ترکوں کے متعلق مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کو سمجھانے کی درخواست کی مگر درخواست منظور نہوئی جس کو مسلمانوں نے بہت بُری طرح محسوس کیا۔ مولانا محمد علی نے لندن سے رخصت ہوتے وقت ۲۷ر نومبر کو الوداعی تقریر میں فرمایا:-

"اگرچہ ہماری آواز اس مرتبہ لارڈ کرو کے کانوں تک نہیں پہونچ سکی لیکن بہرحال انکے کانوں تک تو پہونچی جو انکے حاکم ہیں اور جنکے ووٹ کی ضرورت ان کو رہتی ہے۔ اگرچہ ہم اپنے وطن پہونچکر اپنے ہم وطنوں کے دلوں کی آگ کو نہیں بھڑکائیں گے کہ ہم کو مایوس ہو کر واپس آنا پڑا لیکن اسکا یقین کامل ہے کہ وزراء کو کسی نہ کسی صورت سے ہم کو یہاں اور ہندوستان میں، دونوں جگہ سننا ہی پڑے گا۔" (کامریڈ ۲ر دسمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۴۲۲)

اسی سال مولانا محمد علی مرحوم کے لندن جانے سے قبل کامریڈ کو پریس ایکٹ کا شکار ہونا پڑا جو غالبًا ہندوستان میں پہلی بدعت تھی۔ مقدونیہ کے ترکوں نے بلقانیوں کے مظالم سے تنگ آکر ایک اپیل شائع کی تھی جسمیں برطانیہ سے درخواست کی تھی کہ بلقان کے حلیف اور ترکوں کے خلاف صرف مسیحی ہمدردی کی بنا پر نہوں اور اس میں عیسائیوں کے مظالم بیان کئے تھے جو اہل مقدونیہ پر کیے جا رہے تھے۔ اس مضمون کو جسکا عنوان تھا "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" مولانا محمد علی نے کامریڈ

میں بالا اقتباس شائع کر دیا جسکو حکومت ہند نے بہت ناپسند کیا اور مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے تمام وہ پرچے ضبط کر لیے گئے جسمیں وہ مضمون شائع ہوا تھا۔ اور دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی۔ مولانا نے اس حکم کے خلاف اپیل کیا مگر نامنظور ہوا۔ مولانا اس ہمہ گیر قانون کی زد میں اسلئے آئے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس قسم کے مضامین سے انقلابی جذبہ پیدا کر رہے ہیں اگرچہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ رسالہ میں بغاوت پھیلانے کی کوئی چیز نہیں ہے اور تعزیرات ہند کی زد سے باہر ہے لیکن ہز لارڈ شپ کے الفاظ میں :-

"سیکشن نمبر ۴ کی زبان اسقدر وسیع ہے جتنی انسانی ذہنیت وسیع بنا سکتی ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسی چیز اس قانون کی وسیع زد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ قانون وکیل سرکار کے الفاظ میں تعزیرات ہند کے قانون سے بھی وسیع تر ہے۔ اسمیں ملزم کے خلاف ثبوت کا بہم نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ ملزم اگر یہ ثابت نہ کر سکے کہ وہ جرم سے بری ہے تو خود بخود مجرم سمجھا جائے گا اور صفائی میں صرف یہی ثابت کرنا نہیں ہے کہ اُسکے الفاظ سے ہز مجسٹی کی رعایا کے کسی فرقے یا جماعت کے دل میں نفرت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ کہ ان الفاظ سے ایسا ثابت ہونے کا کسی طرح امکان ہی نہیں ہے"

سر لارنس جنکنس چیف جسٹس نے لکھا :-

"اگرچہ ہمدرد کے اخبار کے چند پرچے ضبط ہو گئے ہیں لیکن اُسکا کیریکٹر محفوظ ہے اور جس چیز کا اس کو زیادہ خطرہ تھا اس سے وہ بری ہے جو اسکے لئے باعث تشفی ہوگا"

اسی طرح جسٹس اسٹیفن نے لکھا :-

"میں اپنے آپ کو ایسی پوزیشن میں دیکھتا ہوں جس سے میں بالکل آشنا نہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے برٹش ایمپائر کا کوئی جج برطانوی قانون کی ابتداء آفرینش سے اب تک اس سخت پوزیشن میں نہیں رکھا گیا جیسی کہ یہ ہے"

اس مقدمہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ناراضگی کو بہت کچھ بڑھایا اور جس قابلیت سے مولانا محمد علی مرحوم نے اس مقدمہ کو لڑا اُسکی تعریف ہر ماہر قانون نے کی۔

جب ۵ مارچ ۱۹۱۷ء کو بی-جی ہرنمان کی سرکردگی میں مسٹر جناح منی اور پنڈت مالویہ وغیرہ پر مشتمل ایک پریس ایسوسی ایشن وفد وائسرائے سے ملا تو وائسرائے نے نہ صرف وفد کو بُری طرح لگے ہاتھوں لیا بلکہ سر لارنس جینکس کو بھی بہت بُرا بھلا کہا کہ :-

"جج کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ یہ بتائے کہ قانون کیسا ہونا چاہیئے بلکہ یہ کہ قانون کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں اگر جج کو ان حالات کا علم ہوتا جو میں آپ کو بتا رہا ہوں تو اس قسم کے ریمارک لکھنے سے قبل وہ ضرور جھجکتے"

جبکہ یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور کی مچھلی بازار کی مسجد کا واقعہ پیش آیا۔ متولیوں کی غلطی سے فائدہ اٹھا کر میونسپلٹی کی سڑک نکالنے کے لئے مسجد کے ایک حصہ کو گرا دیا گیا تھا۔ کانپور کے غیور مسلمان اس توہین کو برداشت نہ کر سکے اور مسجد کی گری ہوئی اینٹوں کو اٹھانے لگے جس پر پولیس بلائی گئی مگر مجمع کو نہ روک سکی اسپر فوج بلائی گئی اور دن کی روشنی میں انصاف پر دن

حکومت کے حکم خاص سے غیر مسلح مسلمانوں کے مجمع پر گولیاں چلائی گئیں جسمیں سیکڑوں مسلمان زخمی ہوئے اور کافی شہید ہوئے۔ اس حادثے نے مسلمانوں کے دلوں کی آگ کو بہت بھڑکا دیا۔

کانپور کی مسجد کا واقعہ اگرچہ مقامی تھا لیکن مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت ایسے اہم معاملہ کو خواہ وہ مقامی ہی ہو کب نظر انداز کر سکتی تھی ان کا دل مقدونیہ اور البانیہ کی مسجدوں کی شہادت سے پکا ہوا تھا اور مشہد مقدس میں حضرت امام رضا کے مقبرہ پر روسیوں کی گولہ باری نے ان کے دل کو زخمی کر رکھا تھا۔ پھر خود ہندوستان میں اس قسم کا حادثہ ان کو متاثر کئے بغیر کب چھوڑتا۔ کمریڈ میں لکھنے سے قبل انھوں نے صوبہ کے گورنر سر جیمس مسٹن سے خط وکتابت کی۔ سر مسٹن کلکٹری کے زمانہ سے مولانا کے بہت دوست تھے مگر اس معاملہ میں مولانا کے اصرار اور تمام حالات کے انکشاف کے باوجود گورنر صاحب نے ایک نہ سُنی آخر کار مولانا نے کمریڈ میں اس مسئلہ کو آل انڈیا مسئلہ کی حیثیت سے جگہ دی اور ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کا نقطہ نظر حکومت کے سامنے رکھا مگر سب بیکار ثابت ہوا اور مسلمانوں کا جوش برابر بڑھتا رہا۔ آخر کار مسٹر میکڈانلڈ اور گورنر کے طرز عمل سے مایوس ہو کر مولانا محمد علی مع مسٹر وزیر حسن جو اُسوقت مسلم لیگ کے سکریٹری تھے بہت خفیہ طور سے لندن گئے یہانتک کہ پاسپورٹ اور ٹکٹ بھی ایم علی اور ڈبلو حسن کے نام سے خریدا تاکہ سر مسٹن کی حکومت تمام منصوبوں کو ختم نہ کر دے۔ وہاں جاکر آپ نے مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔ آخر کار وہاں سے وائسرائے ہند کے نام احکامات آئے اور مولانا کی واپسی سے قبل ہی تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور مسجد کے اُس حصہ کو تعمیر کرنے کی

اجازت دی گئی۔

مسلمانوں کی عام بیداری اور بے چینی مسلم لیگ کے اجلاسوں کی کارروائیوں سے خوب ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین سیلف گورنمنٹ مقرر کیا۔ بقول مصنف "تاریخ کانگریس" لیگ کے اس نصب العین پر اور اس اعلان پر کہ "ہندوستان کی آئندہ سیاست اور ملک کے مفاد کا دارومدار ہندوستان کی دونوں قوموں (ہندو اور مسلمان) کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل پر ہے۔" کانگریس میں بہت خوشی منائی گئی۔ اس سال لیگ کے دو اجلاس ایک مارچ میں لکھنؤ اور دوسرا دسمبر میں آگرہ میں ہوا۔ حکومت خود اختیاری کا نصب العین لکھنؤ میں مقرر ہوا۔ سر ابراہیم رحمت اللہ نے آگرہ میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:۔

"ہندوستان ہمارا آبائی ملک ہے اور قابل قدر وراثت اور آخر کار ہمارے جانشین کو اسے ہمارے سپرد کرنا ہوگا۔"

یہ الفاظ اس زمانے میں بغاوت کے مترادف تھے مگر اب مسلم لیگ بقول سید نبی اللہ صاحب "اپنی پیدائش سے چھ سال کے اندر اپنے گھونگھے میں سے نکل کر ملک کی ترقی کے منصوبہ میں شامل ہو گئی۔" (خطبہ صدارت استقبالیہ اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ دسمبر ۱۹۱۶ء)

اس زمانے کے سیاسی حالات نے مسلمانان ہند کو برطانیہ کی مسلم آزار پالیسی کی وجہ سے حکومت کے خلاف صف بستہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملک میں صرف دو جماعتیں موجود ہیں ایک انگریز دوسرے مسلمان[1] کانگریس

---

[1] زمانہ کا انقلاب بھی عجیب ہے۔ ۲۲ سال بعد مسلمان اتنے گر گئے کہ صدر کانگریس نے یہاں تک فرما دیا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگریس دوسرے انگریز۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی غلطی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اسوقت برطانیہ کی حلیف تھی (جسکا ذکر مفصل آئندہ صفحات میں ہے)

باب ششم

جنگ عظیم کا آغاز اور زمانہ جنگ کی سیاست ہند

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوے خوں ہے، یہ جوے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

۱۹۱۳ء کے اختتام پر ہی مغربی افق پر جنگ کے بادل اُمنڈ رہے تھے مسلمانوں کی نظریں بیرونی اسلامی سیاست پر لگی ہوئی تھیں اور وہ نہایت بے چینی کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کے ساتھ یورپ کی اتحادی طاقتوں کے منصوبوں کو دیکھ رہے تھے۔ مسلمان انگریزوں کو نفرت اور غصہ کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور انگریز مسلمانوں کو مشتبہ سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ جنگ عظیم میں اگر ترکوں نے برطانیہ کی مخالفت میں جنگ میں شرکت کی تو مسلمانان ہند حکومت برطانیہ کی مخالفت کریں گے۔ بالخصوص مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی سرگرمیوں نے حکومت کے دلوں میں اور بھی شکوک بھر دیے تھے۔

جولائی ۱۹۱۴ء میں جنگ کا آغاز ہوا۔ باوجود مسلمانوں کے شدید اضطراب کے مولانا محمد علی نے ابتدا میں حکومت برطانیہ سے موالات کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا ہے کہ انگریزوں سے لڑا جا سکے اور برطانیہ کو موقع دیے کہ مسلمانوں کے جذبات کو اور نہ بھڑکائیں۔

۲۱ اگست ۱۹۱۱ء کے کامریڈ میں مولانا نے ایک مضمون اسی موضوع پر تحریر فرمایا جسکا ایک اہم اقتباس مندرجہ ذیل ہے :-

"برطانیہ عظمیٰ نے ٹرکی، ایران اور مراکش کے معاملات میں مسلمانان ہند کے جذبات کا احترام کیا یا نہیں؟ وزرائے انگلستان کے وعدے ترکوں کے ساتھ ان کی گذشتہ جنگ کے نازک ترین موقع پر انصاف یا معقولیت پر مبنی تھے بھی یا نہیں، بلوسیتر اور ہرزگووینہ کے علاقہ میں، آسٹریا اور طرابلس کے علاقہ میں، اٹلی کی معاہدہ شکنی پر انگریزوں کا جو طرز عمل رہا۔ اُسے اُنکے اعلان سے کچھ بھی مطابقت ہے۔ جو انھوں نے حال میں عہدناموں کے احترام کے بارے میں فرمایا ہے، طرابلس اور بلقان میں شیرخوار بچوں، بے ناصر و یار عورتوں اور صاحب فراش ضعیفوں کو جس طرح ذبح کیا گیا اس پر انگلستان کے ضمیر کو کچھ حرکت ہوئی؟ گوری نوآبادیوں کا برتاؤ اپنی ہی جیسی محکوم کالی رعایا کے ساتھ نیک ہے یا بد؟

سرکار انگلستان نے ان غلطیوں کی اصلاح کیلئے ان حرکتوں پر کوئی دباؤ ڈالا یا اب تک اپنی ناقابل تحسین بے بسی کا عذر پیش کرتی رہی ہے؟ ہندوستانیوں کا جو حقوق و فرائض کے مساوی طور پر لحاظ کئے جانے اور اپنے ملک کی حکومت میں معقول حصہ دیے جانے کا مطالبہ چلا آتا ہے۔ اس مطالبہ کو انگریزی دفتر شاہی نے اب تک برضا و رغبت سُنا ہے یا بغض و عداوت کے کانوں سے؟ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ میں مسلمانوں کو ان کی وفاداری کا صلہ ملا یا ان کے جمود کو ذاتی سمجھ لیا گیا؟ -

ان کی عبارت گا ہوں اور ان کے مقابر کا احترام ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہو!
بعض وقت اسے رعب حکومت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو ہم
کہتے ہیں کہ ان سب سے قطع نظر کرکے یا زیادہ صحیح طور پر ان سب سے موازنہ کرکے
ہم نے اس خیال کو سب پر مقدم پایا ہے کہ ہمارے لئے ہماری اپنی قومی
و جماعتی ارتقا کی موجودہ منزل میں انگلستان کے زیر تربیت رہنا لازمی ہے
اور یہ دیکھ کر کہ انگلستان نے ہمارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں اُن سے کہیں
بھاری پلہ اسکے احسانات کا ہے، ہم بصدق نیت اور بطیب خاطر اسکے
وفادار رہیں گے عام اس سے کہ وہ جرمنی کی بحری قوت کو توڑ کر یورپ
کا مطلق العنان حکمران ہو جائے یا بحر شمالی میں اُسکے عظیم الشان بیڑے
کا آخری جہاز غرق ہو جائے اور اسکا آخری سپاہی لیج یا لندن میں کام آجائے۔
مضمون کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ باوجود برطانیہ کی مسلم آزار پالیسی کے مسلمانوں کی
وفاداری کا اعلان بدرجہ مجبوری تھا اور حکومت کے اشتباہ کو جو مسلمانوں کے خلاف
اسکے دل میں تھا دور نہ کر سکتا تھا۔ اس بیان کو تحریر کرنے کے بعد مولانا نے
کوکناڈا میں خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:۔

"اس طویل بیان سے غرض یہ ہے کہ دنیا دیکھ لے کہ ہندوستانی مسلمانوں
کے خیالات اس گورنمنٹ کے متعلق اب سے کچھ پہلے تک کس قدر حسنِ ظن تھے
اور ہم نے ناانصافی بے اعتنائی اور فسادت قلبی کے متواتر طرز عمل کو
برداشت کرتے ہوئے کیسے صبر و سکون کا اظہار کیا۔"
مولانا نے ڈاکٹر انصاری کی طرف سے غلطت پاشا مرحوم کو بھی اسی مضمون کا

تار دیا تھا کہ :—

"لڑائی میں شریک ہونے سے قبل ترکی کو اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے"

اسی سال جبکہ ترکی ابھی جنگ میں نہیں شریک ہوا تھا لیکن انگریزی حکومت نے اسکے زیر تعمیر جنگی جہازوں پر (جو انگریزی کارخانوں میں تیار ہو رہے تھے) خواہ مخواہ قبضہ کر کے اُس نے لڑائی مول لی تھی۔ لندن ٹائمز نے اپنے ایک افتتاحیہ زیر عنوان "چوائس آف دی ٹرکس" (ترکوں کا انتخاب ۱ھ) میں ترکوں کو زور شور سے دھمکی دی کہ اپنا بھلا چاہتے ہیں تو برطانیہ سے بگاڑ نہ کریں یہاں تک کہ یونان پر بھی پیشقدمی نہ کریں۔ مولانا محمد علی نے جب اس مضمون کو پڑھا تو جوش سے بے قابو ہو گئے اور باوجود اپنی بیوی کی سخت علالت کے اسی وقت اسی عنوان سے اس کا جواب تیار کیا جسمیں مولانا نے چالیس گھنٹے متواتر بغیر کچھ کھائے پیئے اور آرام کئے محنت کی تھی۔ یہ مضمون کامریڈ کے ۲۲ کالموں میں آیا تھا جسمیں یورپی سیاسیات میں خلیفۃ المسلمین کے خلاف برطانیہ کی مسلسل دراز دستیوں کو اس طرح بے نقاب کیا گیا تھا کہ حکومت ہند بلبلا اُٹھی اور کامریڈ کا وہ پرچہ فوراً ضبط کر لیا گیا۔ لیکن باوجود استدعائے گوئی کے مسلمانانِ ہند کو یہی مشورہ دیا کہ وہ صبر سے کام لیں اور حدود قانون سے تجاوز نہ کریں۔ آپ نے آخر میں تحریر فرمایا تھا :—

"ان سب لوگوں نے جو حقیقی وفادار ہیں کام کے ساتھ عراقی بحث و مباحثہ کے باب کا خاتمہ کر دیا۔ اور اب اسے نظر بھر کر بھی نہ دیکھیں گے۔ جو کچھ ہماری شکایات ہوں، جو اصلاحات ہم چاہتے ہوں، ہر چیز وقت مناسب کے لئے ملتوی ہے اگر گورنمنٹ بھی رہ ہمیں سب کچھ دے دے جو ہمیں محبوب ہے

مطلوب ہیں۔ مثلاً اگر ہمیں مسلم یونیورسٹی ہماری شرائط پر دیدی جائے یا
قانون مطابع کی منسوخی کا اعلان کیا جائے، یا حکومت خود اختیاری تک
ہمیں دیدیجائے، تو ہم گورنمنٹ سے بہ ادب کہیں گے کہ یہ وقت اسکا نہیں
ہے اور ہم بالفعل ان عطیات کو شکریہ کے ساتھ واپس کردیں گے۔
مراعات صلح کے زمانے میں مانگی اور دیجاتی ہیں، ہم روس یا پولینڈ کے
رعایا نہیں ہیں۔ ہم رشوت نہیں چاہتے ہیں"

مولانا نے اس امر کو بھی اچھی طرح واضح کردیا تھا کہ :-

"مسلمانان ہندان وعدوں پر جو ان سے مقامات مقدسہ اور مذہب کے
متعلق انگریز اور ان کے اتحادیوں نے کئے ہیں پوری طرح اعتماد رکھتے ہیں
اور ساتھ ہی حکومت پر اس امر کی بھی خوب تصریح کردی تھی کہ جزیرۃ العرب
پر حملہ نہ کیا جائے نہ مقامات مقدسہ کی اس حفاظت کو خطرہ میں ڈالا جائے
جو کامل آزاد اسلامی طاقت کے ذریعہ سے کی جاتی ہے"

جب ترکوں سے جنگ چھڑ گئی تو دہلی میں رپوٹر اور اسوشیٹڈ پریس کے نمائندے
کو بیان دیتے ہوئے بھی مولانا نے فرمایا کہ :-

"میں پہلے بھی مضمون میں پیشین گوئی کرچکا تھا کہ اگر ترکوں سے جنگ
چھڑ گئی تو بھی ہندوستانی مسلمان اپنی وفاداری پر قائم رہیں گے اور
اب جبکہ جنگ چھڑ گئی ہے تو میں مکرر کہتا ہوں کہ وفاداری اب بھی
قائم ہے"

اسپر مولانا نے مسلمانوں کو ایسے بچوں سے تشبیہ دی جن کے والدین آپس میں

لڑ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

"خواہ ماں برسرِ حق ہو یا باپ، ہر حالت میں رنج و کلفت بچوں کے نصیب ہو گی۔"

لیکن ساتھ ہی برطانیہ کو اسکے وعدے یاد دلائے اور فرمایا کہ :۔

"مسلمانوں سے حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے کی توقع کرنی چاہیئے یعنی کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔"

لیکن تاروں کے سنسر نے جو ایک عیسائی تھا نہایت ہوشیاری سے مولانا کے بیان میں سے اس جملہ کو حذف کر دیا۔ جسکا مطلب شاید یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو یہ یاد دہانی کی گئی کہ "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو" تو شاید ان کو اس سے ملے ہوئے اس قول کی بھی یاد آجائے کہ "اللہ کو دو جو چیز اللہ کی ہے۔"

لیکن برطانیہ کے وعدوں کی اہمیت اسوقت تک رہتی ہے جبتک وعدہ کرنیوالی وزارت برسرِ اقتدار رہتی ہے۔ اور وزارت کے تبدیل ہوتے ہی وعدے بھی بدل جاتے ہیں۔ چند ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ وہ تمام وعدے محض مسلمانوں کی تسلی کیلئے تھے دوران جنگ ہی میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ خلیفہ اور مجاہدین اسلام کے مقابلہ میں گورنمنٹ کی حمایت کریں۔ شام، فلسطین اور [illegible] کو خلیفہ کے مقبوضات سے علیحدہ کرکے خود اپنے قبضہ میں کر لیا۔

مولانا محمد علیؒ نے برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد [illegible] اور اسی سلئے مسلمانوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی تھی مگر جب حقیقت سامنے آئی تو وہ بھی سب سے بڑے باغی بن گئے۔ کوکناڈا میں خطبہ صدارت میں اپنے ان مضامین اور

بیانات کے متعلق جن میں مسلمانوں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین کی تھی آپ نے فرمایا:-

"اب جبکہ میں کامریڈ کے فائلوں کو اٹھا کر پڑھتا ہوں۔ اور ان توقعات کو جو نہ صرف ۱۹۱۳ء کے شروع ہونے تک بلکہ ۱۹۱۴ء کے اختتام تک میں نے عام طور پر ظاہر کی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کسی ایسے جانور کی جو اب بالکل معدوم ہے وہ ہڈیاں ہیں جو حال میں دستیاب ہوئی ہیں"

حکومت ہند جنگ عظیم کے آغاز ہی سے مسلم مدبرین کو اشتباہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور جوں جوں جزیرۃ العرب اور ترکوں کے خلاف جنگ ہوتی گئی مسلمانوں کا اضطراب اور حکومت کا اشتباہ بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انڈین ڈیفنس ایکٹ (قانون تحفظ ہند) پاس کیا گیا تاکہ جن مدبرین سے خطرہ ہو ان کو اس قانون کی زد میں لایا جائے۔ سب سے پہلا خطرناک مدبر ظاہر ہوا "مسٹر محمد علی" تھا۔ اخبار کی ضبطی کے بعد مولانا محمد علی مع اپنے برادر مولانا شوکت علی صاحب اور اہل و عیال گرمیوں میں آرام کرنے کی غرض سے براہ اجمیر نینی تال جانے والے تھے کہ دہلی میں [illegible] قانون تحفظ ہند کی رو سے مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے نظر بندی کا حکم ملا۔ آپ نے اس حکم کے پڑھتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ:-

"یہ ایک بہترین خدمت ہے جس کی ادائیگی کیلئے خدائے حکیم نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے منتخب کیا"

اس گرفتاری کا سبب معلوم کیا گیا تو جواب ملا کہ:-

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب ایسے سوالات کا جواب دینا پسند نہیں کرتے"
مہرولی میں آپ کو نظر بند کیا گیا۔ مہرولی جانے سے قبل دونوں بھائیوں نے جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی تھی۔ خلقت کی خلقت زیارت کیلئے جمع تھی۔ قاضی عبدالغفار صاحب اس روز کا اپنا مشاہدہ اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

"[1] وہ آخری جمعہ مجھے یاد ہے جب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر یہ دونوں اہل دہلی سے رخصت ہو رہے تھے اور دل کی کیفیات سے بے قابو ہو کر رونے والوں کو تلقین صبر و استقامت کر رہے تھے۔ مسجد شاہجہانی کی سیڑھیوں پر یہ دو انسان پتھر کے دو مینار تھے جن پر زمانہ کی طوفان انگیزیاں بے اثر تھیں"

مہرولی سے بعد کو لینسڈاؤن اور پھر چھندواڑہ آپ کو منتقل کر دیا گیا۔ حکومت سے اسمبلی میں علی برادران کی گرفتاری کے متعلق سوالات کئے گئے مگر کوئی صحیح جواب نہ مل سکا۔ آنریبل رضا علی نے سوال کیا تو جواب ملا کہ :۔

"حسب دفعہ ۳ قانون تحفظ ہند نظر بندی کا حکم دیا گیا ہے"

پھر ۱۹۱۵ء کی انتظامی رپورٹ میں یہ وجہ بتائی گئی کہ :۔

"اس ماہ میں محمد علی شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اسلئے کہ گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں کی ایک جماعت پر برا اثر ڈال رہی تھیں"

مسٹر جناح کے سوالات پر جواب ملا کہ :۔

"چونکہ انھوں نے حکومت کے خلاف کھلم کھلا حصہ لیا ہے اسلئے انکو نظر بند

---
[1] سیرت محمد علی صفحہ ۲۵۰

کر دیا گیا اور اگر وہ آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کریں تو ان کی رہائی پر غور
کیا جا سکتا ہے۔"

ابھی مولانا محمد علی اسیر ہی تھے کہ حکومت کی نظر عتاب دوسرے مسلمان مدبرین
پر بھی پڑی۔ مولانا ابوالکلام کو ۱۹۱۶ء میں نظر بند کر کے رانچی بھیجدیا گیا۔ اور مولانا
حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں صاحبان کو بھی نظر بند کر دیا گیا۔ حضرت مولانا
محمود الحسن صاحب شیخ الہند کی گرفتاری کا بھی خطرہ تھا مگر آپ نے ستمبر ۱۹۱۵ء میں
مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی۔ ترکوں اور شریف حسن کی جنگ مولانا کے دوران قیام
ہی میں ہوئی۔ وہیں مولانا حسین احمد صاحب بھی جو درس علوم عربیہ میں مصروف تھے
شیخ الہند صاحب کے رفیق ہو گئے۔ مولانا کے متعلق حکومت کو یہ شک تھا
کہ آپ نے بیرونی اسلامی ممالک سے اپنے مریدوں کے ذریعہ خط و کتابت کر کے ہندوستان
پر حملہ کی دعوت دی ہے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں مولانا کے خلاف یہ الزام
لگایا گیا تھا کہ آپ نے اپنے شاگرد مولوی عبیداللہ صاحب کو کابل بھیجا جہاں وہ
جرمن اور ترک مشن سے ملے جو وہاں مقیم تھے اور امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف
زور ڈالا۔ لیکن حقیقت میں یہ سب غلط واقعات ہیں۔ واقعہ صرف اتنا ہی کہ مولانا
ہندوستان میں ایسے انقلاب کے متمنی تھے جسمیں شرعی نظام مکمل طور سے قائم رہے
اور چونکہ انگریزی حکومت کے دور میں اسلامی احکام کی صریحاً خلاف ورزی ہو رہی تھی
اور بیرونی اسلامی سیاست کا بھی انکے دل پر اثر تھا اسلئے آپ نے دارالاسلام
میں ہجرت کا ارادہ کیا۔ عجب نہیں اگر آپ ہندوستان میں قیام فرما رہتے تو آپکو
بھی علی برادران اور مولانا ابوالکلام صاحب کی طرح ہندوستان ہی میں نظر بند رہنا

پڑتا اور مالٹا کی اسارت کی نوبت نہ آتی لیکن مکہ معظمہ پہونچکر اور بالخصوص حجاز کے ترکوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی وجہ سے حالات دگرگوں ہوگئے۔ ابتداء میں خود ترکی حکومت نے آپ کے گروہ کو جاسوس سمجھ کر پریشان کیا مگر جب ترکی وزراء کو یقین دلایا گیا تو آپ پر سے وہ قیود اٹھالی گئیں۔ شریف حسین کی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کی حکومت کی موافقت میں علمائے اسلام کے فتوے طلب کئے گئے۔ مولانا سے بھی دستخط کرنے کو کہا گیا مگر مولانا نے صاف انکار کردیا اسلئے کہ اسکی حکومت انگریزوں کے رحم وکرم پر تھی۔ جس کی وجہ سے شریف حسین نے آپ کو مع رفقا کے انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔ اور آپ کو کافی عرصہ تک جزیرہ مالٹا میں اسیر رہنا پڑا۔ ان تمام واقعات کو مفصل طور سے مولانا حسین احمد صاحب نے سفرنامہ حجاز میں قلمبند فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہند کا کسی ایسی سازش سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا جس کی مفروضہ وجہ سے آپ کو اتنی تکالیف اٹھانا پڑیں۔

مسلم لیگ کی کوشش مصالحت اور ۱۹۱۶ء کا میثاق لکھنؤ

جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے ہندو مسلم اتحاد پر کافی زور دیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح نے اسکے بعد سے برابر ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کیلئے قوم کی نظریں مسٹر جناح کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنگ عظیم کے شروع ہوجانے اور بعض مسلم لیڈروں کی گرفتاری اور خلیفۃ المسلمین کی طاقت کے کمزور ہوجانے پر مسلمانان ہند آزادی کے نشے سے اسقدر سرشار تھے کہ وہ ہر اس تنکے کا سہارا لینے کو تیار تھے جو ان کو آزادی کی منزل کی طرف لے جائے

وہ جتنا انگریزوں سے متنفر ہوتے جاتے تھے ہندوؤں سے رابطہ اتحاد پیدا کرنے کے متمنی تھے۔ اگرچہ برادران وطن کی بیوفائیوں اور برطانیہ اُن کے تعاون کی داستان اُن کے دماغ میں تھی مگر وہ ہر کوشش ہندو مسلم مفاہمت کی کرنے میں مصروف تھے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے۔ کانگریس کے پریزیڈنٹ ایک اعلےٰ خطاب یافتہ سر ایس۔ پی۔ سنہا اور لیگ کے صدر مسٹر مظہرالحق بیرسٹر پٹنہ تھے۔ مسٹر جناح، حسرت موہانی اور مسٹر مظہرالحق نے ہندو مسلم مفاہمت کی مدبرین کانگریس سے مشورہ کرکے بہت کوشش کی۔ چونکہ ۱۹۱۷ء کی نئی اصلاحات نافذ ہونے والی تھیں اسلئے ہر دو فریق نے کوئی باہمی سمجھوتے سے متفقہ اسکیم بنانے کی کوشش کی اور آخرکار ایک کمیٹی ریفارم اسکیم پر غور کرنے کیلئے بنا دی گئی۔ مولانا محمد علی مرحوم اسوقت نظربند تھے۔ اپنے خطبہ صدارت کوکناڈا میں اس مفاہمت کے متعلق آپ نے اپنے تاثرات کو اس طرح قلمبند کیا ہے:—

"مسٹر جناح کی موثر وکالت، صدر نشین لیگ کے تدبر یان اور شیر بے نیام مسلمان وطن دوست مولانا حسرت موہانی کی جرأت و استقلال کی مجموعی طاقت سے آخرکار وہ مفاہمت ہو ہی گئی جسکا ثمرہ اگلے سال لکھنؤ کے تاریخی میثاق کی شکل میں ملنے والا تھا۔"

نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں سر یندر ناتھ بنرجی کی صدارت میں مسلم لیگ اور کانگریس کی مشترکہ میٹنگ ہوئی۔ اور باہمی مفاہمت کے بعد ایک معاہدہ مرتب ہوا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے موسوم ہے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور لکھنؤ کے

مشہور تاریخی اجلاس ہوئے۔ کانگریس کے صدر مسٹر امبکا چرن موزمدار اور لیگ کے صدر مسٹر جناح تھے۔ کانگریس نے ۲۹ر دسمبر کو اور لیگ نے ۳۱ر دسمبر کو اس معاہدہ کی تصدیق کی۔

مسٹر جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا۔

"یہ امر میرے لئے اور ہر محب وطن کیلئے نہایت اطمینان بخش ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو ہندو جماعت کے لیڈروں نے تسلیم کر لیا ہے اور اسکے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی کمیٹیوں نے گذشتہ نومبر میں کلکتہ میں ملکر جو عہدنامہ متفقہ فیصلہ کیا تھا وہ اسکی بین دلیل ہے۔ دونوں فریقوں میں چند ایسے نفوس جنکا رضامند ہونا محال ہے اب بھی ممکن ہے کہ کہیں موجود ہوں لیکن بہ حیثیت مجموعی فرقہ وارانہ ابر کے خوف سے مطلع صاف ہو گیا ہے۔ اور مستقبل کے مناظر ان علامات سے چمک اٹھتے ہیں جو ہندوستان کے وفادار فرزندان کے دل خوشی سے معمور کر دیتی ہے"

مولانا محمد علی ابتک نظر بند تھے اور تمام ملک ان کی رہائی کا طالب تھا۔ ۱۹۱۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے۔ مسلم لیگ کی صدارت کیلئے مولانا محمد علی کو منتخب کیا گیا لیکن حکومت نے اجلاس کی شرکت تک کے لئے اجازت نہ دی۔ آپ کی جگہ کرسی پر آپ کی تصویر رکھدی گئی اور آپ کی والدہ ماجدہ نے نظر میں اپنا ایک بیان پڑھکر سنایا۔ اسی صدارت کے متعلق مولانا نے ایک

سلہ بدقسمتی سے آج ۲۲ سال بعد کانگریس اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

شعر میں فرمایا تھا۔ ؎

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

کانگریس نے بھی مولانا کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک رزولیوشن پاس کیا۔

اسی سال مسٹر مانٹیگو ہندوستان میں تشریف لائے۔ اُن کی خدمت میں نواب محمد اسحاق خاں صاحب کی سرکردگی میں مسلمانوں کے ایک وفد نے حاضری کی درخواست کی لیکن جب حکومت ہند کو یہ معلوم ہوا کہ اسمیں علی برادران کی رہائی کا مطالبہ بھی ہے تو ان کو باریابی کی اجازت نہ مل سکی کیونکہ وہ اپنے ایڈریس میں سے اس مطالبے کو نکالنے پر راضی نہ تھے۔

ستمبر ۱۹۱۸ء میں حکومت کی طرف سے یہ تحریک کی گئی کہ اگر علی برادران ایسا بیان دیدیں کہ آئندہ وہ کوئی کارروائی ایسی نہیں کرینگے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ برطانیہ کو نقصان پہونچے یا جس سے حکومت کے دشمنوں کو اخلاقی یا عملی مدد پہونچ سکے تو انکو رہا کر دیا جائیگا۔ لیکن ان مجاہدین راہ حق کو کوئی چیز راہ راست سے نہ ہٹا سکتی تھی انھوں نے صاف جواب دیا کہ "ہم یہ سب کچھ صرف ایسی صورت میں کرنے کو تیار ہیں اگر ہمارا مذہبی مفاد حکومت کے مفاد سے نہ ٹکرائے ورنہ ہم کوئی ذمہ داری نہیں دے سکتے"۔ اس بیان سے حکومت مطمئن نہوئی اور رہائی کا مسئلہ درمیان ہی میں رہ گیا۔

ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک ٹریبونل مقرر کیا گیا تاکہ وہ علی برادران کی نظربندی کے صواب و عدم صواب پر غور کرکے اپنی رائے پیش کرے۔ اس کمیشن نے فرداً فرداً علی برادران کے بیانات قلمبند کئے۔ علی برادران سے ۲ ... [illegible]

سے ثابت کیا کہ حکومت کی دست درازیاں کسی طرح انصاف پر مبنی نہ تھیں۔

اگر مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے تو ہم سچے وفادار ہیں ورنہ ہم سے بڑھ کر

کوئی دشمن نہیں ؎

ٹریبونل نے ان کی نظر بندی کو جائز قرار دیا لیکن حکومت سے سفارش کی کہ ازراہ ترحم خسروانہ انکو رہا کر دیں۔ لیکن حکومت ایسی سفارش کو کب ماننے والی تھی۔ مسز بسنت جو تین ماہ قبل ہوم رول ایجی ٹیشن میں گرفتار ہوئی تھیں رہا کر دی گئیں۔ لیکن علی برادران کا اسقدر خوف حکومت کے دلوں پر تھا کہ ان کو اب بھی رہا نہ کیا گیا۔ کمال یہ تھا کہ اب تک علی برادران کا کوئی خاص گناہ بھی ثابت نہ تھا۔ کوئی چارج انکے خلاف قائم نہ ہوا تھا۔ صرف اسلئے کہ ان سے "حکومت کو خطرہ ہے" وہ نظر بند تھے۔ مسز بسنت اسی لئے وائسرائے سے ملیں مگر کوشش بیکار ہوئی۔

۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں آنریبل مسٹر اے کے فضل الحق کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر انصاری مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ یہ اجلاس اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی اجلاس تھا۔ مسلمانوں کے عام اضطراب اور حکومت کے خلاف عام ناراضگی کا پتہ اس اجلاس کی جوشیلی کارروائی سے چلتا ہے۔ مسلم لیگ اس زمانے میں آج کی طرح واحد نمائندہ جماعت تھی اور تنہا سیاسی رہنما۔ اس اجلاس میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے مع دیگر علما کے شرکت فرمائی تھی۔ مولانا موصوف کانپور کی مسجد کے بعد سے برابر سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی اور حسرت موہانی

آپ ہی سے بیعت تھے "خدام کعبہ" کی بنیاد آپ ہی کے ایما سے رکھی گئی تھی۔ انگریزوں سے آپ کو دلی نفرت تھی۔ مہاتما گاندھی ابتدائی زمانہ میں آپ کے دولتکدہ پر اکثر مقیم رہا کرتے تھے اور مولانا کو "سیاسی پیر" کہا کرتے تھے۔ گاندھی جی سے مولانا کو بہت محبت تھی ایک شعر میں آپ نے اس محبت کا اشارہ فرمایا تھا:۔

حمرے کہ بہ آیات و احادیث گذشت   رفتی و نثار بت پرستی کردی

اُس زمانے میں کانگریس اور لیگ کے اجلاسوں میں یونین جیک کے جھنڈے لگائے جاتے تھے۔ کانگریس میں تو ملک معظم کی وفاداری کا رزولیوشن ہمیشہ پاس ہوتا تھا (جس پر مفصل بحث آئندہ باب میں ہے) مولانا عبدالباری صاحب جب دہلی کے اس اجلاس میں بہ اصرار صدر تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ اور آپ نے جب یونین جیک کو ہال میں دیکھا تو غصہ کی شدت سے منہ سُرخ ہوگیا اور فرمایا کہ:۔

"اس ہال میں کسی مذہبی مسئلہ پر ایمانداری کے ساتھ ایک لفظ کہنا بھی حرام ہے جبتک انگریزی جھنڈوں کی لعنت یہاں موجود ہے"

مولانا کے ان الفاظ کے ساتھ تمام ایوان میں سناٹا چھا گیا اور آنریبل فضل الحق نے ایکدم میز پر کھڑے ہو کر ان جھنڈوں کو اپنے ہاتھ سے اُتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ اقدام اُس زمانے کی سیاست میں بڑی زبردست سزا کا مستوجب تھا۔ اور آخر کار ڈاکٹر انصاری کا خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ ضبط کر لیا گیا۔

باب ہفتم

تحریک خلافت کے آغاز تک کانگریس کی برطانیہ نواز پالیسی

برادرانِ وطن کی اعتدال پسند سیاسی پالیسی پر ایک نظر

اے دُرِ تابندہ، اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا (اقبالؒ)

گذشتہ صفحات میں مفصل طور سے اسلامی سیاست پر بحث کی جا چکی ہے حکومت برطانیہ کی جو پالیسی مسلمانوں کے ساتھ ڈیڑھ سو برس تک رہی اور مسلمانان ہند کا جو طرز عمل بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت انگلشیہ کے ساتھ رہا وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ بیرون ہند مشرقی اسلامی ممالک کی بے بسی اور مسلمانان ہند کے اضطراب و بیداری نے ہندوستان کے موجودہ انقلاب کیلئے کتنی سازگار فضا پیدا کر دی اسکا فیصلہ آئندہ نسلوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا کیا جا سکتا کہ آج کانگریس کے چہرے پر جو سُرخ غازہ نمایاں ہے وہ خالص مسلمانوں کے خون کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ کانگریس کا دعوے ہے کہ ہندوستان کے موجودہ انقلاب کو پیدا کرنے والی صرف کانگریس ہے "تاریخ کانگریس" کے مصنف نے ہندوستان کی موجودہ سیاست کی تعمیر میں مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کیا ہے اور یہی ثابت کرنے کی غلط کوشش کی ہے کہ موجودہ حقوق کانگریس اور بالخصوص گاندھی جی کی جد و جہد سے ملے ہیں اور ان مجاہدینِ حق کو جنھوں نے

اپنی تمام عمر برطانیہ کے "دیوِ استبداد" سے جنگ کرنے میں صرف کردی ہندوستان کی جنگ آزادی میں اتنا حصہ بھی نہیں دیا جتنا کہ لالہ لاجپت رسالے اور شردھانند مہاراج کو دیا ہے۔ ان صفحات میں ہمارا مقصد کانگریس کے اس باطل دعوے کی نقاب کشائی کرنا ہے اور یہ دکھانا ہے کہ کانگریس کے وہ ہیرو جو آج ہندوستان کا ہٹلر بننے کا خواب دیکھتے ہیں اس زمانے میں جبکہ برطانیہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہا تھا اور مسلم مدبرین قید تنہائی کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں اسیر تھے، کس طرح حکومت انگلشیہ کے حلیف بنے ہوئے رہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول علامہ شبلی۔

"درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جاتی ہے تو ع تا ثریا می رود دیوار کج"

آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد ہی ایک انگریز کے ہاتھوں صرف اسلئے رکھی گئی تھی کہ وہ ایک اپوزیشن پارٹی کی حیثیت سے حکومت کی خامیوں پر نکتہ چینی کیا کرے اور اس فرض کو کانگریس نے آخری وقت تک بہت وفاداری کے ساتھ نبھایا سوائے اس قلیل زمانے کے جب اس کی عنان علی برادران کے ہاتھوں رہی۔ مسلم لیگ اپنی پیدائش کے پانچ سال بعد ہی برطانیہ کیلئے خطرۂ عظیم بن گئی۔ اور بارہ سال بعد تو یہ خطرہ اسقدر دشمنی میں مبدل ہو گیا تھا کہ ۱۹۱۸ء میں خطبہ صدارت استقبالیہ حکومت نے منبط کر لیا تھا۔ لیکن کانگریس کے قیام کے آٹھ سال بعد ۱۸۹۳ء کے سالانہ اجلاس میں سردار دیال سنگھ صاحب کے خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :—

"کانگریس اس ملک میں برٹش حکومت کی چمکتی ہوئی یادگار رہے۔ ہم اُس

آئینی دور میں رہنے کا فخر رکھتے ہیں جس کا نعرہ "آزادی" ہے
اور جس کا سب سے بڑا ستون "رواداری" ہے۔"

اس سے کچھ عرصہ قبل دادا بھائی نوروجی کانگریس کی صدارت فرماتے ہوئے
اعلان کر چکے تھے کہ:۔

"ہم کو مردانہ وار کہہ دینا چاہیئے کہ ہم سر سے پا تک برطانیہ کے وفادار ہیں۔"

بارھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۹۶ء میں صدر کانگریس نے اپنے خطبۂ صدارت
میں فرمایا تھا:۔

"اس آفتاب کے نیچے انگریز قوم سے زیادہ ایماندار اور ثابت قدم کوئی
قوم موجود نہیں ہے۔"

۱۸۹۸ء میں مسٹر آنند موہن بوس نے مدراس کانگریس کے صدر کی حیثیت سے
خطبہ میں فرمایا تھا:۔

"ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ انگلینڈ کا دوست ہے نہ کہ دشمن اور اس کار
عظیم میں فطری توسط سے اُسکے ساتھ ہے جو اُسکے پیش نظر ہے۔"

سر سید علیہ الرحمہ کی پالیسی پر اعتراض کرنے والے حضرات ان الفاظ کو انصاف
کی نظر سے دیکھیں۔

تقسیم بنگال کے اعلان کے بعد سے ۱۹۱۱ء تک کانگریس نے ہندو نکتہ
نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت ہند کے خلاف کچھ شورش اسلئے کی کہ مسلمانوں کو
اس تقسیم سے فائدہ نہ پہونچ جائے۔ لیکن اس تقسیم کے منسوخ ہو جانے کے بعد
پھر وہی تعاون شروع ہو گیا۔

کانگریس کے مدبرین اس زمانے میں جبکہ مسلمانوں پر ہر قسم کی سختیاں کیجا رہی تھیں نہ صرف زبانی تجاویز اور تقریروں سے حکومت کی تعریف میں قصیدہ خوان تھے بلکہ عملی طور سے بھی پورے سرکاری تھے۔ حکومت کانگریس کے بڑے بڑے عہدہ داروں کو گورنمنٹ کے اعلےٰ مناصب عطا کرتی تھی۔ کانگریس کا صدر یا سکریٹری ہونا حکومت کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے کی ضمانت ہوتی تھی بالخصوص ججی اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل ایسے لوگوں کیلئے وقف تھیں۔

Sir S. Surahmania Aiyar سرایس۔ سبرامانیہ ایر مدراس کے ایک مشہور سرکاری خطاب یافتہ کانگریسی تھے جو پہلی کانگریس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے۔ مسٹر وی۔ کرشنا سوامی ایار وہ بزرگ ہیں جنکی کوششوں سے مدراس میں کانگریس کنونیشن کا اجلاس ۱۹۰۸ء میں منعقد ہوا تھا اور سرآرتھر لالی Sir Arther Lawly نے جو اس زمانے میں مدراس کا گورنر تھا اپنے خیمے کانگریس کے اجلاس کیلئے عطا فرمائے تھے۔ سرسنکرن نیر نے ۱۸۹۷ء میں امراؤتی میں کانگریس کی صدارت کی تھی بیرسٹر Ramasam راماسام نے ۱۸۹۵ء میں کانگریس میں شرکت کی اور اس اجلاس میں جنوبی افریقہ کے باشندوں کی ہمدردی کے متعلق رزدلیوشن کی تائید کی تھی۔ پھر مسٹر ٹی۔ وی۔ سیشاگیری ایار T.V. Seshagiri Aiyer ۱۹۱۷ء میں اور مسٹر پی آر۔ سندارا ایار P. R. Sandara Aiyar ۱۹۰۸ء میں شامل ہوئے۔

سلہ تاریخ کانگریس صفحہ ۱۴۳۔

ان سب حضرات کو ہائی کورٹ کی ججی کے عہدے دیے گئے۔ انہیں سے دو کو ایگزیکیٹو کونسل کی ممبری بھی بخشی گئی۔

سر محمد حبیب اللہ صاحب جو ۱۸۹۰ء میں کانگریس پلیٹ فارم پر پہلی بار آئے مدراس اور دہلی گورنمنٹ کے ممبر بنائے گئے۔ سر ایم کرشنا نیر ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں نمودار ہوئے اور لا ممبر بنائے گئے۔ اور سر کے وی ریڈی جو آجکل مدراس میں بڑے مشہور سرکار پرست ہیں ۱۹۱۷ء تک پکے کانگریسی رہے۔

اس طرح صرف مدراس سے چھ جج اور چھ ممبران کونسل وائسرائے اور گورنر کے تقررات صرف اسلئے کیے گئے کہ ان کو کانگریس میں اقتدار حاصل ہوا۔ بعد میں مسٹر جی۔ اے ٹیسن سٹرف بورڈ کے ممبر بنائے گئے۔ سر آر۔ کے ۔ شنمکم چیٹی جو آجکل کوچین میں دیوان ہیں ابتدا میں کانگریسی ہونے کی وجہ سے ترقی کے زینہ پر پہونچے۔ بمبئی میں طیب جی جنھوں نے ۱۸۸۷ء میں مدراس میں۔ مسٹر چنداورکار جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں لاہور میں کانگریس کی صدارت کی دونوں بمبئی ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے۔ مسٹر این۔ ایم۔ سمراتھ اور مسٹر بی۔ این باسو سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر کانگریسی ہونے کی وجہ سے بنائے گئے اور سر چمنا لال سیتلواڈ آف بمبئی اگزیکٹو کونسل کے ممبر ہوئے۔

کلکتہ میں مسٹر اے۔ چودھری جنھوں نے تقسیم بنگال کی شورش میں بہت حصہ لیا فوراً ہائیکورٹ کے جج بنا دیے گئے۔

"لارڈ منٹو کی سوانح حیات" مصنفہ لیڈی منٹو سے ایک عجیب واقعہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ ۱۹۰۸ء میں جب لارڈ مارلے گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے

قانونی ممبر کا تقرر کرنا چاہتے تھے تو دو ممبروں پر نظر انتخاب پڑی۔ ایک اشو توش مکرجی اور دوسرے مسٹر ایس۔ پی سنہا۔ مسٹر سنہا کلکتہ کے اجلاس کانگریس سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک رزولیوشن پر تقریر فرما چکے تھے جو ایک والی ریاست کی معزولی تخت بغیر الزام ثابت کئے" سے متعلق تھا۔

لارڈ مارلے نے لکھا کہ "مسٹر سنہا کانگریسی ہیں اگرچہ اعتدال پسند" اسلئے ایک غیر کانگریسی کے مقابلہ میں کانگریسی کو منتخب کیا گیا۔

اسی طرح سنہ ۱۹۲۰ء میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں جگہ خالی ہوئی تو اگرچہ لارڈ چیمسفورڈ مہاراجہ بردوان کو منتخب کرنا چاہتے تھے مگر مسٹر مانٹیگو نے ایک کانگریسی مسٹر بی۔ این شرما کو اسلئے پسند کیا کہ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کانگریس میں اس نے حکومت کی وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ اسطرح سنہ ۱۹۲۰ء تک گویا کانگریسی ہونا حکومت کی وفاداری کی ایسی کھلی ہوئی ضمانت ہوتی تھی کہ غیر کانگریسی کے متعلق شک کیا جا سکتا تھا مگر کسی کانگریسی کے متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اسی طرح کلکتہ میں مسٹر ایس۔ آر داس نے سنہ ۱۹۰۵ء کی کانگریس میں تقریر کی اور وائسرائے کی کونسل کے لا ممبر بنائے گئے۔ یو۔ پی میں سر تیج بہادر سپرو جو اس زمانے میں پکے نیشنلسٹ اور کانگریسی تھے گورنمنٹ آف انڈیا کے لا ممبر بنائے گئے۔ اور سید حسن امام جنھوں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں کانگریس کا اجلاس پٹنہ میں منعقد کرایا تھا ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے۔ اور مسٹر ایس۔ سنہا بہار کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے۔

صرف یہی ایک راہ عنایت نہ تھی جو خداوندان کانگریس کیلئے حکومت میں داخل ہونے کی کھلی تھی بلکہ اور بھی بہت طریقے تھے جن سے کرم گستری کی جاتی تھی۔
سر فیروز شاہ مہتا کو جو پکے کانگریسی تھے لارڈ کرزن نے سنہ ۱۹۰۴ء میں سر کا خطاب دیا مسٹر سری نواس ساستری کو جنگ عظیم کے دوران میں لارڈ ہنٹ لینڈ نے لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا اور سنہ ۱۹۲۱ء میں اُن کو مہاراجہ کچھ کے ساتھ امپیریل کانفرنس میں ہندوستان کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا اور تھوڑے عرصہ بعد پریوی کونسلر بنا دیا گیا۔
اسکے بعد انکو حکومت کی طرف سے ہندوستان اور امپائر کے موضوع پر تقریر کرنے کیلئے امریکہ اور دوسری نوآبادیوں میں بھیجا گیا۔ انکے اخراجات کیلئے حکومت ہند نے ساٹھ ہزار روپے منظور کئے۔ اور آخرکار سنہ ۱۹۲۷ء میں انکو جنوبی افریقہ میں ایجنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

قطع نظر ان اکرامات و عنایات کی بوچھار کے کانگریس نے پارلیمنٹ کے ممبران حکومت برطانیہ کے ذمہ دار مدبرین اور دوسرے برطانوی باشندوں سے نہ صرف تعاون کیا بلکہ اُنکے مرنے پر ماتم کے رزولیوشن پاس کئے۔ حالانکہ وہی لوگ تھے جو ہندوستان کے قفس کی تیلیوں کو کسنے میں معاون ہوتے تھے۔
سنہ ۱۸۹۸ء میں گلیڈسٹون وزیر اعظم برطانیہ کی موت پر ماتم کیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں مدراس کانگریس میں اسٹینلی ایڈورلی اور مسٹر ڈبلیو۔ سی کین کی اموات پر تعزیتی تجاویز افسوس پاس کی گئیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب دار السلطنت کلکتہ سے دہلی تبدیل ہوا اور لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند دہلی میں جلوس کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر داخل ہوئے اسوقت کم

بم پھینکا گیا جس سے خدا کے فضل سے وہ بال بال بچ گئے۔ یہ حرکت یقیناً بزدلی اور غیر مہذب ہونے کا ثبوت تھا لیکن جبکہ مسلم لیگ نے کوئی رزولیوشن اس قسم کا پاس نہیں کیا کانگریس نے پٹنہ کے اجلاس ۱۹۱۲ء میں اظہار افسوس کیا اور اس مذموم حرکت پر غیظ و غضب کی تجویز پاس کی اور وائسرائے کے نام بذریعہ تار اسکی اطلاع اسی روز کی۔ کانگریس کی غلامانہ ذہنیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ اپنی وفاداری کا اظہار کرنے میں حد درجہ نمائش سے کام لیتی تھی۔

۱۹۱۴ء میں مدراس میں کانگریس کا سشن ہو رہا تھا اور مسٹر اے۔ پی پیٹرو ہندوستانی فوج کی روانگی کے متعلق تقریر فرما رہے تھے درمیان تقریر میں لارڈ پینٹلینڈ گورنر مدراس تشریف لے آئے فوراً تمام ہاؤس بلحاظ ادب کھڑا ہو گیا اور صرف یہی نہیں بلکہ مقرر کو روک کر مسٹر سریندر ناتھ چٹرجی سے کانگریس کی وفاداری تخت برطانیہ کا رزولیوشن پیش کر دیا گیا۔ جنھوں نے حسب معمول پوری فصاحت سے وفاداری کی تجویز کو پیش کیا۔ بالکل یہی واقعہ ۱۹۱۶ء کی کانگریس سشن لکھنؤ میں پیش آیا جب سر جیمس میسٹن جلسہ میں تشریف لائے۔

۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے اجلاس بمبئی میں منعقد ہوئے لیگ کا اجلاس زیر صدارت مولانا مظہر الحق اور کانگریس کا لارڈ سنہا۔ دونوں اجلاس کی کارروائیوں پر غور کرنے اور خطبات صدارت کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کس قدر اعتدال پسند جماعت تھی اور مسلم لیگ کس حد تک گرم تھی

سلہ تاریخ کانگریس صفحہ ۱۲۱۔

ہو چکی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت کانگریس کوکناڈا میں کسی ظریف کا یہ واقعہ نہایت ظرافت سے نقل کیا ہے :۔

"کانگریس کے سالانہ اجلاس بمبئی کے بنگالی صدر لارڈ سنہا اور ان کے ہمسایہ اور قانون پیشہ بھائی جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر تھے بہ ارادۂ سفر بمبئی میں ایک ہی گاڑی میں سوار ہوئے۔ راستے میں دونوں نے ایک دوسرے کا خطبہ صدارت دیکھنے کیلئے مانگ لیا۔ تاکہ باہم گر توسیع خیالات کریں لیکن خوبیٔ وقت واتفاق سے دونوں ایک دوسرے کا خطبہ پڑھکر واپس کرنا بھول گئے۔ چنانچہ مولانا مظہر الحق نے مسلمان اراکین مسلم لیگ کے روبرو وہ گرما گرم اور تیز و تند خطبہ پڑھ دیا جو بنگالیوں کا ہی حصہ تھا اور لارڈ سنہا نے کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کے سامنے وہ نرم اور پر از احتیاط و حزم خطبہ پڑھا جو ہمیشہ کے وفادار مسلمانوں ہی کے شایان شان تھا"

اس اجلاس کانگریس میں جو تجاویز پاس ہوئیں ان میں پانچویں تجویز کانگریس کی وفاداری برطانیہ کی تھی اور چھٹی تجویز میں برطانیہ اور اتحادیوں کو انصاف پرور اور حق پرور تسلیم کرتے ہوئے ان کے جہازی بیڑے کی کامیابی پر مبارکباد دیگئی تھی واضح رہے کہ اس زمانے میں اسی جہازی بیڑے کی مخالفت میں مسلمان شور و شر کر رہے تھے اسلئے کہ یہ طاقتیں ترکوں کو تباہ کرنے میں صرف کی جا رہی تھیں مولانا محمد علی اور دوسرے مسلم لیڈر اسی جرم میں گرفتار تھے اور کانگریس بالمقابل ان کی کامیابیوں پر مبارکباد پیش کر رہی تھی۔

اس اجلاس کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کو سبجکٹ کمیٹی کے لئے منتخب نہیں کیا جا سکا تھا اور صدر اجلاس نے اختیارات خصوصی سے کام لیکر انکو نامزد کیا تھا۔ اُس زمانے میں کانگریس برطانیہ کی حلیف تھی اور مہاتما گاندھی بالکل ایک غیر معروف شخص تھے۔ فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب کے دولتکدہ پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم نے مہاتما جی کو اُس زمانے میں بالخصوص مسلم عوام میں بہت تعارف کرا دیا، یہ کیا خبر تھی کہ بعد میں یہی شخصیت ہندوؤں کے لئے قابل پرستش اور مسلمانوں کیلئے بیحد مضر ہو گی۔

ہندو مسلم جھگڑے | مسلمانان ہند برطانیہ کی مسلم کش پالیسی سے اسقدر تنگ آ چکے تھے کہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حکومت ان کی کبھی دوست نہیں ہو سکتی اگرچہ برادران وطن کے طرز عمل سے بھی ان کو دل برداشتہ بنا رکھا تھا لیکن مسلم مدبرین ہندوستان کی غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک عمل اور اتحاد کے خواہشمند تھے وہ خوب سمجھ چکے تھے کہ اسلامی ممالک کی آزادی کیلئے ہندوستان کی آزادی بیحد ضروری ہے اسلئے وہ اس منزل پر پہونچنے کیلئے ہر گروہ کو اپنے ساتھ لینا چاہتے تھے مگر برادران وطن کچھ تو اسلئے کہ انکے دلوں میں طبعًا مسلمانوں سے نفرت تھی اور کچھ اسلئے کہ مسلمان بیرونی مسلمانوں سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے اور اُنکے لئے ہر قسم کی قربانی کو تیار رہتے تھے وہ مسلمانوں سے اسلئے الگ رہتے تھے کہ اُنکو یہ خطرہ ہو گیا تھا کہ مسلمان افغانستان اور ایران سے سازش کر کے مسلم حکومت کی بنیاد ہندوستان میں ڈالنا چاہتے ہیں اسی لئے جب نیکی پور کے کانگریس سشن میں مولانا مظہرالحق نے خطبہ صدارت استقبالیہ میں ترکوں کے مظالم پر

کچھ تبصرہ کیا تو ہندو پریس میں آگ سی لگ گئی تھی اور بعض کانگریسی حضرات نے
اسیوقت اعتراضات کرنے شروع کر دیے تھے۔ اسی لئے ۱۹۱۸ء میں
جنگ عظیم میں برطانیہ اور اُسکے اتحادیوں کی کامیابیوں پر مبارکباد کا رزولیوشن
پاس کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء میں ہندو مسلم اتحاد کو اپنے نصب العین میں شامل
کر لیا تھا اور کانگریس کے تمام رہنما ہندوؤں سے اتحاد کیلئے دل وجان سے کوشاں
تھے مگر بدقسمتی سے برادران وطن نے ان کوششوں کو کبھی اچھی نظروں سے
نہیں دیکھا۔

اُسی سال اجودھیا میں زبردست بلوہ ہوا اور گورنمنٹ کے حکم سے وہاں
گائے کی قربانی بند کر دیگئی۔ مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس جب کرسمس کے موقع پر
آگرہ میں ہوا تو گورنمنٹ کے اس طرز عمل پر اظہار افسوس کیا گیا اسکے کچھ ہی عرصہ
بعد ۱۹۱۴ء میں ضلع مظفر نگر میں بقرعید کے موقع پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر
بہت مظالم ذبیحۂ گاؤ کو بند کرنے میں کئے۔ پھر ستمبر ۱۹۱۷ء میں ضلع اعظم گڈھ
میں مسلمانوں پر اتنے مظالم کئے گئے کہ تاریخ مثال پیش نہیں کرسکتی۔ پچیس ہزار
ہندوؤں نے وہاں کے دیہات کے مسلمانوں پر منظم حملہ کیا۔

۱۹۱۸ء میں کتار پور متصل ہردوار میں مسلمانوں پر زیادتیاں کیگئیں۔ جس میں
بیس کے قریب مسلمانوں کو آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس سال دہلی میں مسلم لیگ
کا اجلاس ہوا ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ میں
اس واقعہ پر بہت افسوس ظاہر کیا تھا۔ جسکا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"بیجا نہ ہوگا اگر اس جگہ کٹار پور کے اندوہناک واقعات کا ذکر کیا جائے
جہاں ہندوؤں نے بے قصور اور صلح جو مسلمانوں کے ساتھ بغیر اشتعال کے
وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ ان ہولناک واقعات کو پڑھکر مجھے جو صدمہ ہوا ہے
وہ بیان سے باہر ہے۔ ناراضگی اور غصہ کے جو جذبات سب کے دلوں میں ہیں
ان کا ذکر کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ اس قسم کے واقعات دونوں قوموں کے
تعلقات خراب کرتے ہیں اور اس باہمی اتحاد کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں
جس کے ہم سب آرزومند ہیں"

ان الفاظ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمان اُن بلوؤں کو رد کرنے
میں کسقدر کوشاں تھے مگر بدقسمتی سے کسی ہندو لیڈر کی آواز ان کے خلاف
سنائی نہ دیتی تھی۔ مصنف "تاریخ کانگریس" نے بھی اس قسم کے بلوؤں کا ذکر تک
نہیں کیا۔

اسکی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں مدبرین کانگریس مسلمانوں سے اتحاد
قائم کرنے کی مساعی سے زیادہ جنگ عظیم میں برطانیہ کی امداد میں مصروف تھے
جبکہ علی برادران اور دیگر مسلم رہنما اسیر فرنگ تھے اور طرح طرح کے مصائب میں مبتلا
تھے آجکل کے آزادی کے ہیرو برطانیہ کے استحکام کیلئے جنگ عظیم میں انگریزوں
کو مدد پہنچانے کیلئے ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کرا رہے تھے۔ مہاتما جی
ہندوستان بھر کا دورہ انگریزوں کی حمایت میں اور رنگروٹ بھرتی کرانے کی
ترغیب دلانے کیلئے کر رہے تھے۔ آنجہانی مسٹر تلک جولائی سنہ ۱۹۱۶ء تک
فوج کی بھرتی کیلئے بیحد کوشاں رہے۔

آخر مہینہ جولائی ۱۹۱۸ء میں تلک نے مہاتما گاندھی کے نام بطور ضمانت پچاس ہزار روپیوں کا ایک چیک روانہ کیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ :-

"اگر برطانیہ ہندوستانیوں کو فوج میں اعلےٰ مناصب عطا کرنے کا مہاتما جی سے صرف وعدہ کرے تو میں پانچ ہزار سپاہی صرف مہاراشٹر سے دینے کا وعدہ کرتا ہوں اور اگر وعدہ پورا نہ کر سکوں تو یہ پچاس ہزار روپیوں کا چیک ضبط کر لیا جائے[۵۱]"

جبکہ ہندوستان کا ہر مسلمان برطانیہ کی فوجی طاقت کے خلاف احتجاج بلند کر رہا تھا اور انکے رہنما جیل کی کوٹھریوں میں بند تھے۔ برادران وطن ـــ اور برادران وطن میں کانگریسی اور قومی مدبرین ـــ کیوں استحکام برطانیہ کیلئے اسقدر کوشاں تھے؟ صرف اسلئے کہ بقول مہاتما گاندھی "ہندوستان اور برطانیہ کا مفاد مشترک ہے[۵۲]" وہ سمجھ رہے تھے کہ اگر جنگ عظیم میں برطانیہ کو شکست ہوئی اور ترکوں کی طاقت بڑھ گئی اور مشرق سے برطانیہ کا اثر کم ہو گیا تو مشرق میں علامہ اقبال کی مشہور پیشین گوئی کے کے مطابق اسلامی دنیا مشرقی جغرافیہ کی شکل بدل ڈالے گی۔ انکو خطرہ تھا کہ کہیں برطانیہ کی سیاسی طاقت کمزور ہو جانے پر ہندوستان کا مستقبل اسلامی حکومت میں مبدل نہ ہو جائے اور ہر چند مولانا محمد علی مرحوم اپنی اسیری سے قبل اور مولانا حسرت موہانی اپنی تحریروں اور تقریروں سے مہاتما جی اور دوسرے مدبرین کانگریس کو

---

۵۱ ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۲۰۵۔ ۵۲ وہ یہ تھی کہ تمام مشرقی ممالک کے مسلمان ایک وفاقی شکل میں مستقل اسلامی سٹیٹ قائم کر لیں جس کو اس شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے ۔ نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاک کاشغر

یقین دلاتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے تو صاف فتوے کی شکل میں اعلان کر دیا کہ ہندوستان کے مسلمان وطن کے خلاف ہرگز نہ ہونگے مگر ان کا یہ شک دل سے نہ نکلتا تھا کہ "سرحدی افغان ہندوستان کو ہضم کر جائینگے" یہی وجہ ہے کہ کانگریس ہمیشہ برطانیہ کی خارجی پالیسی کی حامی رہی ہے۔ حبش کی جنگ میں اٹلی کے خلاف اس نے صرف اسلئے آواز اٹھائی کہ برطانیہ اٹلی کے خلاف تھا۔ چین کی موافقت اور ہمدردی میں کانگریس کا وفد ڈاکٹر اٹل کی سرکردگی میں محض اسلئے جا رہا ہے کہ جاپان کے خلاف برطانیہ کی آواز بھی بلند ہے ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج فلسطین میں بھی چین سے زیادہ مظالم ہو رہے ہیں اور صدر کانگریس باوجود دعوت فلسطین وہاں جانا گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے جنگ عظیم میں برطانیہ کی فوجی طاقت کے استحکام میں اسقدر امداد کی بلکہ اُن مسلمانوں کو وطن کا غدار کہا جو ترکوں کی حمایت میں تکالیف برداشت کر رہے تھے اور یہاں تک کہا کہ :-

"ہندوستان کا مسلمان جزیرہ نما گیلی پولی کی ایک انچ زمین کے بدلے میں سارے ہندوستان کو قربان کر دینے کو تیار ہے"

ان واقعات اور خیالات کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر انصاری مرحوم نے دہلی مسلم لیگ کے مجلس استقبالیہ کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا :-

"حضرات بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ اخوت اسلامی جو اُن کے اور تمام مسلمانوں کے درمیان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں رشتۂ محبت قائم کرتی ہے درحقیقت اس وطن پرستی کے خلاف ہے جس کا

تعلق صرف ہندوستان سے ہے میں نے بعض دوستوں کو کہتے سنا ہے کہ ہندوستان
کا مسلمان جزیرہ نما گیلی پولی کی ایک زمین کے بدلے سارے ہندوستان کو
قربان کرنے کو تیار ہے۔

"حضرات اس قسم کی باتوں سے جن کی تصدیق واقعات ہرگز نہیں کرتے
حقائق کے چہرہ کو مسخ کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہر معرکہ میں ہم اپنے ہندو
بھائیوں کے شانہ بشانہ رہے ہیں۔ اگر ہم مسلمانان ترکی و ایران کے
ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرز عمل نے ثابت کر دیا
ہے کہ ہم اپنے ان ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرنے میں جو غیر ممالک میں
مقیم ہیں کسی سے کم نہیں۔ وہ حق پرست یعنی احمد محمد کچالیہ ہندوستان ہی کا
ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑتا رہا۔ اور آخر تک ہمارے
حقوق کی حفاظت میں مسٹر گاندھی کی جانشینی کرتا رہا"

جبکہ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے استقبالیہ کمیٹی کے صدر کا خطبہ اسقدر سخت تھا کہ اُسکو ضبط
کر لیا گیا تھا اور مسلم لیگ کی کارروائی اتنی انتہا پسند تھی جسکا ذکر گذشتہ صفحات
میں آچکا ہے۔ کانگریس کی تمام کارروائیوں نے وفاداری برطانیہ کا پر زور اظہار
کیا تھا۔ اجلاس میں سب سے پہلے رزولیوشن میں کانگریس کی شہنشاہ معظم سے
وفاداری اور جنگ عظیم کے کامیابی کے ساتھ ختم ہونے پر برطانیہ کو مبارکباد دی
گئی اور رزولیوشن میں یہ الفاظ شامل کئے گئے "یہ لڑائی تمام دنیا کی آزادی کیلئے
لڑی گئی تھی"۔
تمام دنیا کی آزادی میں یہ واضح رہے کہ ترکوں کی آزادی اور فلسطین کی

آزادی بھی شامل ہے جسکا زیادہ آج بھگتنا جا رہا ہے۔

دوسرے رزولیوشن میں اتحادیوں کی جوانمردی اور بالخصوص ہندوستانی فوجوں کی بہادری کو جو انھوں نے آزادی اور انصاف کیلئے لڑائی میں کامیابی کے ساتھ دکھائی" تسلیم کرتے ہوئے انکو مبارکباد دیگئی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں برطانیہ کی خارجی پالیسی کی مخالفت کی اور خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا اسکے مفصل وجوہات اور جن شرائط سے انھوں نے اشتراک عمل کیا وہ آئندہ صفحات میں درج ہیں۔

باب ہشتم

تلخ برتاؤ کیسا جنگ عظیم کے بعد کانگریس کی حسب معمول وفاداری

جنگ عظیم کے اختتام پر مہاتماجی اور دیگر رہنمایان کانگریس کو امید تھی کہ اب ان کی وفاداریوں کا صلہ دیا جائے گا۔ اور اگرچہ اقبال انکو بار بار آگاہ کرچکے تھے ؎

چہ نادانی امید غمگسار یہا ز افرنگ است
دل شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

مگر یہ وفادار رہبران راہ آزادی" اپنی التجاؤں اور درخواستوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جو واقعات ظہور میں آئے اور انکے باوجود کانگریس اور مہاتما گاندھی کا جو طرز عمل برٹش امپیریلزم کی حمایت میں رہا وہ آئندہ سطور میں مفصل بیان کیا جائیگا جسکو ناظرین غور سے پڑھیں

مسلمانوں کو جنگ عظیم کے میدان ہی میں حکومت باغی سمجھ چکی تھی جنگ کے اتمہ پر جو صلح ہوئی اُس سے مسلمانان ہند بہت ناراض تھے اسلئے کہ اتحادیوں نے جو شرائط ترکوں سے منوائی تھیں وہ نہایت ذلت آمیز تھیں۔ لیکن باوجود ان تمام اسباب کے مسلمان بالکل خاموش تھے اور ہندوستان میں کسی قسم کی کوئی شورش نہ تھی۔ لیکن اوائل ۱۹۱۹ء ہی میں حکومت نے ایسے قوانین نافذ کرنا چاہے جن سے ہندوستانیوں کو بہت تکلیف پہونچی بالخصوص اُنکے اتنے باامن اور صلح جو رہنے کے باوجود اس بے اعتمادی نے جو ان قوانین سے ظاہر تھی انکو بہت صدمہ پہونچایا۔ ہندوستان کے حالات پر غور کرنے کیلئے جو رولٹ کمیٹی بٹھائی گئی تھی اُس نے ۱۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو اپنی رپورٹ شائع کی اور ۱۲ فروری ۱۹۱۹ء کو سرولیم ونسنٹ نے لیجسلیٹو کونسل میں رولٹ بل پیش کیا جو مارچ ۱۹۱۹ء کے تیسرے ہفتہ میں پاس ہو گیا جسکی رو سے عدالتوں کو بہت زیادہ اختیارات دلائے گئے تھے جنکا اپیل بھی نہ ہو سکتا تھا۔ پولیس کو اختیارات دیے گئے تھے کہ ایسے آدمیوں سے جن سے کوئی خطرہ ہو چاہے جس طرح ضمانت طلب کیجائے اور لوکل گورنمنٹ کو ہر مشتبہ شخص کے گرفتار کرنے کا اختیار دیدیا گیا تھا۔

اس قانون کے پاس ہوتے ہی ملک میں عام بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور بالخصوص گاندھی جی کی تو آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی یہ برطانیہ پر امید غمگساری بڑی غلطی تھی۔ لیکن اس گھبراہٹ میں انھوں نے جو قدم اٹھایا وہ اور بھی غلط تھا انھوں نے اعلان کیا کہ اگر اس قانون کو نافذ کیا گیا تو وہ ستیاگرہ کرینگے۔ ملک اسوقت بالکل غیر منظم تھا۔ دوران جنگ میں خود گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو

برطانیہ کے خلاف اٹھانے کی ترغیب دی تھی اور اب ان کو ستیاگرہ کی تعلیم دینا خلاف دانش تھا بالخصوص جبکہ پہلے سے ملک اسکے لئے تیار نہ تھا اور نہ ایسی تحریک پر قابو رکھنے کی کوئی تنظیم پیشتر سے تھی۔ لہذا اسکا انجام وہی ہوا جو منتشر اور بے معین منزل گروہ کا ہوتا ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو تمام ملک میں ہڑتال کرنے کا اعلان کیا گیا مگر پھر یہ تاریخ ۶ اپریل تک کیلئے ملتوی کر دیگئی لیکن اعلان کی تشہیر کی کمی کی وجہ سے دہلی میں اسی روز جلوس نکلا اور ہڑتال ہوئی اور پولیس نے گولی چلائی۔ ۶ اپریل کو ہندوستان بھر میں جلوس نکالے گئے اور ہندو مسلم اتحاد کے عجیب عجیب نظارے دیکھنے میں آئے۔ مسلمان اپنی دھن میں اسقدر سرگرم تھے کہ انھوں نے رواداری کی رو میں ہندوؤں سے اتحاد کیلئے ہندو لیڈروں کو جامع مسجد کے صحن میں بلاکر تقریریں کرائیں اور خود قشقے بھی پیشانیوں پر لگائے۔ ہسٹری آف دی کانگریس کے مصنف نے تحریر فرمایا ہے:۔

"اس باہمی اتحاد کا فوری سبب یہ تھا کہ مسلمان ترکی کی ذلت اور خلافت کی کمزوری کی وجہ سے جو لڑائی کے بعد صلح کی شرائط سے ظاہر ہوئی تھیں بیحد برگشتہ تھے اور ہندوؤں کو ان سے ہمدردی تھی۔"

اس سال کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہونا قرار پایا تھا اور سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کی خواہش تھی کہ یہ اجلاس پنجاب میں نہونے پائے۔ ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو دونوں اس اجلاس کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان دونوں کو گرفتار کرکے کسی غیر معلوم مقام پر بھیجدیا گیا۔ پبلک نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بنگلہ کو گھیر لیا فوج نے گولی چلائی اور چند اموات بھی ہوئیں۔ مجمع اب تشدد پر اتر آیا اور مشتعل

لاشوں کے جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ راستہ میں نیشنل بینک کی عمارت جلا ڈالی اور انگریز منیجر کو قتل کر ڈالا۔ ریلوے گودام اور کئی دوسری عمارتوں کو بھی جلا دیا گیا۔ آخر کار شہر ۱۰ اپریل کو ملیٹری کے حوالہ کر دیا گیا۔ یہی حشر کسور اور گجرانوالہ میں بھی ہوا۔ بعض مقامات پر ریلوے پل اور تار کی لائنیں وغیرہ توڑ دی گئیں۔ ۱۰ اپریل کو گاندھی جی نے دہلی جانا چاہا مگر ان کی محبوب حکومت نے انکو داخلہ کی اجازت نہ دی مگر انھوں نے اسکی خلاف ورزی کی اور گرفتار کر لیے گئے۔ یہ اس وفاداری کا پہلا صلہ تھا جو جنگ عظیم کے دوران میں آپ نے دکھائی تھی۔ مہاتما جی کی گرفتاری پر بھی کلکتہ اور دوسرے مقامات پر گولی چلی مہاتما جی کو بمبئی بھیجدیا گیا وہاں سے احمد آباد جاکر آپ نے ستیہ گرہ کو ملتوی کر دیا اور تسلیم کیا کہ "یہ میری ہمالیہ جیسی غلطی تھی"۔

بالکل اسی زمانے میں ۱۳ اپریل کو امرتسر میں ہندو سال نو کے سلسلہ میں ایک جلسہ عام کی منادی کی گئی اور جلسہ منعقد ہوا۔ جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہوا جو چار دیواری سے محصور ایک مقام ہے جسمیں داخلہ کا راستہ اسقدر تنگ ہے کہ گاڑی بھی نہیں نکل سکتی جبکہ جلسہ میں بیس ہزار مرد، عورتیں اور بچے موجود تھے اور ایک شخص مسمی ہنسراج تقریر کر رہا تھا۔ جنرل ڈائر کے حکم سے فوج نے گولی چلائی۔ جنرل ڈائر کے بیان کے مطابق کل سولہ سو گولیاں چلائی گئیں اور اسوقت گولی بند کی گئی جب اسیونیشن ختم ہو گیا۔ اس حادثے میں گورنمنٹ کے بیان کے موافق چار سو سے زیادہ آدمی مارے گئے اور ایک ہزار اور دو ہزار کے درمیان زخمی ہوئے اور ستم یہ ہوا کہ مرنیوالے اور زخمیوں کو رات بھر بغیر پانی پلائے اور بغیر

امداد کے محصور رکھا۔ جنرل ڈائر کے زمانہ حکومت میں صرف یہی نہیں ہوا بلکہ امرتسر میں پانی کی سپلائی بند کر دی گئی۔ کوڑوں کی سزا عام کر دی گئی۔ ایک سڑک کے رہنے والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے چلیں جس کی تعمیل عرصہ تک جاری رہی۔ تیسرے درجہ کے ٹکٹ بالکل بند کر دیے گئے۔ دو آدمیوں کا ساتھ ملکر چلنا بند کر دیا گیا۔ بازار کے نرخ فوج مقرر کرتی تھی۔ جو دُکان بند کرتا تھا اسکو سزا دیجاتی تھی۔

قلعہ کے قریب کوڑے لگانے کا ایک خاص مقام تیار کیا گیا تھا اور شہر میں مختلف جگہوں پر اور اس طرح بنائے گئے تھے۔

امرتسر میں فوجی عدالت میں ۲۹۸ بڑے بڑے الزامات کے مقدمات پیش ہوئے جن میں سے ۲۱۸ کو سزائیں دی گئیں [له]۔

اور ان سب پر ستم یہ کہ سر مائیکل اڈوائر نے جنرل ڈائر کی اس وحشیانہ حرکت کو بذریعہ تار صحیح تسلیم کر لیا۔ وہ تار یہ تھا:۔

"آپ کا طرز عمل صحیح ہے۔ لفٹنٹ گورنر تصدیق کرتے ہیں"

یہ حالات صرف گجرانوالہ اور امرتسر ہی میں نہیں رونما ہوئے بلکہ قصور اور لاہور میں بھی یہی ہوا۔

لاہور میں ان ستم ظریفیوں کی حد یہاں تک پہونچی کہ طلبا کو حکم تھا کہ دن میں چار مرتبہ مختلف مقامات پر جمع ہو کر فوج میں حاضری دیا کریں۔ شہر کے

له ۵۱ کو سزائے موت، ۴۶ کو عبور دریائے شور، ۲ کو دس سال کی سزائے سخت، ۷۹ کو ۷ سال، ۱۰ کو ۵ سال اور ۱۳ کو ۳ سال اور ۵۹ کو اور معمولی سزائیں دیگئیں۔

روؤسا کی سائیکلیں اور موٹریں ضبط کر کے فوجی افسروں کے استعمال کیلئے دیدی گئیں۔ بجلی کے پنکھے اور دیگر سامان فوج کیلئے ضبط کر لیے گئے۔

مارشل لا کا نوٹس ایک کالج کی دیوار سے کسی نے پھاڑ ڈالا۔ اس جرم میں کالج کے تمام پروفیسر مع پرنسپل گرفتار کیے گئے اور ان کو قلعہ تک مارچ کرنے کا حکم دیا گیا جہاں ان کو تین دن تک بند رکھا گیا اور زمین پر لٹایا گیا۔

کرنل اوبرائن نے یہ حکم دیدیا تھا کہ جو ہندوستانی کسی انگریز سے ملے وہ فوراً جھک کر سلام کرے اگر کسی سواری پر جا رہا ہو تو فوراً اُتر جائے اور اگر چھاتہ لگائے ہو تو فوراً نیچا کرے۔

کرنل اوبرائن نے ایک مرتبہ تو یہاں تک کیا کہ شہر کے مخصوص آدمیوں کو گرفتار کر کے اسٹیشن تک نیم عریانی کے ساتھ جلتی ہوئی دھوپ میں لایا گیا اور مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بند کر دیا گیا۔ حوائج ضروری کی بھی اجازت نہ دی گئی اور اس طرح ان کو چوبیس گھنٹے تک بند رکھا۔ اسوقت انکی جو حالت تھی وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ جب ان قیدیوں کو سڑکوں پر سے جایا جا رہا تھا تو ان کی تعداد برابر بڑھتی جاتی تھی اسلیے کہ گرفتاریوں کا سلسلہ بلا امتیاز مذہب و ملت جاری تھا۔ سب آدمیوں کے پیروں میں ایک دوسرے سے ملا کر زنجیریں باندھ دی گئی تھیں۔ افسوس ان قیدیوں میں ایک وہ بزرگ بھی تھے جنھوں نے شہنشاہ معظم کی آمد کے موقع پر کنگ جارج اسکول کو ایک لاکھ روپیہ دیا تھا اور قرضہ جات جنگ اور وار ریلیف فنڈ میں کافی چندہ دیا تھا[1]۔

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۲۰۰۔

کیپٹن Doveton نے کسور میں ایک پبلک پنجرہ تیار کرایا تھا جس میں ایک سو پچاس آدمی ایک ساتھ بند کئے جاسکتے تھے اور انکو عوام دیکھ سکتے تھے۔

اگر ان مظالم کو جو اُس زمانے میں ہندوستانیوں پر کئے گئے، مفصل بیان کیا جائے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔

۲۰ و ۲۱ اپریل کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ مسٹر وی پٹیل اور این۔ سی کیلکر پر مشتمل ایک وفد لندن بھیجا گیا۔ مالویہ جی نے ایک عرضی لندن میں لارڈ سنہا کے پاس بھیجا جو کانگریس کے غداو ندان قدیم میں سے تھے۔ اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ مارشل لا کو منسوخ کرائیں۔

۲۱ جولائی کو مہاتما گاندھی جی نے اپنا بیان سول مخالفت کو بند کرنے کے اسباب کو واضح کرتے ہوئے شائع کیا۔ اسمیں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"میں گورنمنٹ کے مشورہ کو قبول کرتا ہوں جس سے میری پُرامن سول مخالفت کا اظہار ہوگا ایک پرامن احتجاج کرنے والے کا مقصد حکومت کو پریشان کرنا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک کو بند کرکے میں ملک اور حکومت اور پنجابی مظلومین کی زیادہ خدمت کرسکتا ہوں"

یہ ہے مہاتما گاندھی کا ہندوستان کی سیاست میں سب سے پہلا قدم جس کو فوراً پیچھے ہٹانا پڑا۔

ہندوستانی لیڈروں نے پنجاب جاکر بچشم خود وہاں کے حالات دیکھے جس سے وہاں کے سہمے ہوئے مظلومین میں کچھ جان آئی۔ کانگریس نے ایک الگ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی اور ہنٹر کمیٹی نے الگ اپنی رپورٹ ان واقعات

پیش کی۔ آخرکار ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تجویز پاس ہونے کے بعد جنرل ڈائر کو عہدے سے برخاست کیا گیا لیکن یوروپین عورتوں نے ہندوستان ہی میں بیس ہزار پونڈ کی خطیر رقم ان کو نذر کی اور ان کی اس بہادری کے صلہ میں ایک تلوار پیش کی گئی۔

حکومت برطانیہ کے ان مظالم اور فوجی قوانین کی وجہ سے ہندوستان میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے دل پر ان مظالم کا کیا اثر ہوا۔ آزادی کے اوتار کے جذبات کس حد تک جوش میں آئے اور برطانیہ کی وفاداری میں کہاں تک فرق آیا؟

لیکن افسوس! جب ایک بے تعصب نظر ان واقعات پر ڈالی جاتی ہے اور گاندھی جی کے طرز عمل پر غور کیا جاتا ہے تو شرمندگی کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مہاتما جی ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا بالکل نہیں چاہتے بلکہ ان کی تمام جدوجہد اور کوششوں کا مطلب ہندوستان کی دیوی کے سر سے کچھ بار ہلکا کرنا ہے اسکو پنجرے سے باہر لانا مقصود نہیں ہے۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس کچھ دنوں بعد ہی امرتسر میں منعقد ہوا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات ملک میں نافذ ہونیوالی تھیں۔ کانگریس میں یہ سوال زیر بحث تھا کہ آیا ان حالات کے باوجود ان اصلاحات پر تعاون کے ساتھ عمل کیا جائے یا نہیں۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس اس اسکیم کے خلاف اور اسکی منسوخی کی موافقت میں تھے لیکن دو مہاتما گاندھی جی اور مالویہ جی اسکے نفاذ کے حامی تھے۔

لہذا جب مسٹر داس نے یہ رزولیوشن پیش کیا کہ:

"کانگریس اپنے اُس اعلان کا پھر اعادہ کرتی ہے کہ ہندوستان اب
مکمل ذمہ دار حکومت" کیلئے بالکل تیار ہے اور اسکے خلاف جو اسکیم بھی
ہوگی وہ ناقابل قبول ہوگی۔ یہ آئینی اصلاحات جو نافذ ہونے والی ہیں
ناقابل اطمینان اور مایوس کن ہیں"

تو مہاتما جی اس تجویز کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے اس تجویز میں سے لفظ
"مایوس کن" کو نکالنے اور مندرجہ ذیل الفاظ کے اضافہ کی ترمیم پیش کی :-

"اس حکومت کے اجراء سے قبل یہ کانگریس شاہی اعلان کو وفاداری
کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ اور امید کرتی ہے کہ عوام اور حکام دونوں ملکر
ان اصلاحات کے نفاذ کیلئے تعاون کرینگے تاکہ کامل ذمہ دار حکومت جلد
حاصل ہو سکے۔ اور یہ کہ کانگریس رائٹ آنریبل ای۔ ایس۔ مانٹیگو
کی جانفشانیوں کا جو اُنھوں نے اس سلسلہ میں برداشت کیں تہ دل سے
شکریہ ادا کرتی ہے"

لیکن آخرکار رزولیوشن پاس ہوتے وقت "وفاداری" اور اس قسم کے چند
خوشامدانہ الفاظ کو مسٹر داس اور علی برادران کی مخالفت کی بنا پر (جو اب
جیل سے رہا ہو چکے تھے) نکال دیا گیا۔

اس ترمیم کو پیش کرتے ہوئے مہاتما جی نے جو تقریر کی وہ حد درجہ معتدل
اور وفاداری سے بھری ہوئی تھی۔ ہسٹری آف دی کانگریس کے لائق مصنف
اس واقعہ کو اس طرح لکھتے ہیں :-

"اسوقت مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جبکہ مسٹر داس اصلاحات کی منسوخی

اور اسکے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے ۔ عدم تعاون ـــــ کے حامی تھے
مسٹر گاندھی تعاون اور اشتراک عمل کا نمونہ بنے ہوئے تھے ۔ بیشک
وہ ایسے ہی تھے ۔ آئندہ نسل ان کے اس رزولیوشن پر خواہ کچھ ہی فتوے
دے مگر اسوقت تو امرتسر میں ان ہی کی فتح ہوئی "

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان ان اصلاحات کے بالکل خلاف تھے ۔ علامہ اقبال
بآواز بلند فرما رہے تھے ۔ ؎

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس فتح کو بھی دیکھا اب آگے دیکھیئے "ہسٹری آف دی کانگریس" کے مصنف
کی زبانی ہی سنیئے :-

" پنجاب کے مظالم کی طرف تمام لوگوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں ۔ لیکن
گاندھی جی کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح پنجاب اور گجرات کی پبلک کے
تشدد اور زیادتیوں کے خلاف اور ان کی ان حرکات کو مذموم سمجھتے ہوئے
ایک رزولیوشن پاس کر دیں ۔ سبجیکٹ کمیٹی نے اس رزولیوشن کو نامنظور
کر دیا ۔ گاندھی جی مایوس ہوگئے ۔ رات بہت جا چکی تھی ۔ گاندھی جی نے
بہت دبی آواز میں کہا کہ اگر اس رزولیوشن کو منظور نہ کیا گیا تو میرے لئے

لہ ہسٹری آف [illegible] کانگریس صفحہ ۳۰۰ ۔

کانگریس میں رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لہذا صبح کو اس رزولیوشن
کو منظور کر ہی لیا گیا اگر چہ ڈیلیگیٹوں کی کثیر تعداد میں بے چینی رہی۔"
آگے چلکر پھر مصنف موصوف لکھتے ہیں :۔

"گاندھی ابھی تک گورمنٹ سے لڑنے کو تیار نہ تھے۔ اسی لئے شہزادہ
ولیعہد کے لئے "خوش آمدید" کا رزولیوشن پاس کیا گیا۔"

بہر حال ان تمام واقعات سے ایک حقیقت بالکل سامنے آجاتی ہے کہ مہاتما گاندھی
ہندوستان کیلئے اُس آزادی کے خواہاں نہیں ہیں جو علی برادران اور دوسرے
مسلمانوں کا مطمع نظر ہے۔ وہ طرز حکومت میں تبدیلی یقیناً چاہتے ہیں لیکن حکومت
کے ڈھانچے کو بالکل بدلنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی سوراج
یا آزادی کامل کو مد نظر رکھ کر سول نافرمانی نہیں کی۔ بلکہ کسی خاص مسئلہ پر سول
نافرمانی کی مثلاً رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر۔ اگر اسکو منسوخ کر دیا جاتا تو سول نافرمانی
کی نوبت بالکل نہ آتی۔ یہی طرز عمل آئندہ بھی جاری رہا۔ اسیطرح وہ پنجاب کے مظالم
اور علی برادران کے مجبور کرنے پر خلافت کی بنا پر سول نافرمانی کرنے پر تیار ہوئے
مہاتماجی کی وفاداری اور حکومت برطانیہ سے مکمل تعاون کی داستان خود اُن کے
اس بیان میں مفصل طور سے موجود ہے جو انھوں نے مارچ ۱۹۲۲ء کو عدالت
احمد آباد میں اُسوقت دیا تھا جبکہ خلافت کی تحریک کو دفن کر کے وہ گرفتار ہوئے
تھے اور مقدمہ جاری تھا۔

اُس بیان میں ابتدا میں اپنی افریقہ کی وفاداری کا اظہار کیا تھا کہ جو کچھ حکومت
کے خلاف کیا گیا اس سے حکومت کی تخریب مقصود نہ تھا بلکہ محض [illegible] اور طرز حکومت

میں کچھ اصلاح مقصود تھی ۱۸۹۹ء اور ۱۹۱۴ء کی جنگ میں برطانیہ کی امداد کے لئے جو کچھ کارنامے کئے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"دونوں مواقع پر مجھے تمغہ جات ملے۔ اور لارڈ ہارڈنگ نے جنوبی افریقہ میں میرے کام کے صلہ میں قیصر ہند کا تمغہ عطا فرمایا۔ جب ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی تو میں نے لندن میں ہندوستانی باشندوں بالخصوص طلباء کی ایک والنٹیر کور تیار کی۔ پھر ۱۹۱۸ء میں جب ہندوستان میں لارڈ چیمسفورڈ نے فوجی بھرتی کیلئے اپیل کی جس کے جواب میں میں نے باوجود خرابی صحت کے اسوقت تک سپاہی بھرتی کرائے جب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ اب سپاہیوں کی ضرورت باقی نہیں رہی"

بہرحال ۱۹۱۹ء تک کانگریس باوجود ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات کے اعتدال پسند حکمت عملی سے دو قدم بھی آگے نہ بڑھنے پائی تھی۔ اور برطانیہ کی چہیتی دلہن بدستور بنی ہوئی تھی لیکن آئندہ ایک سال میں صرف ایک شخص کی واحد اور انقلاب انگیز کوششوں سے ہی کانگریس انقلابی جماعت بن گئی جسکا ذکر آئندہ باب میں آئیگا۔

باب نہم

ترک موالات کی تحریک کا آغاز

علی برادران پانچ سال کی نظربندی کے بعد ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے

جبکہ امرتسر میں کانگریس اور مسلم لیگ کا سیشن ہو رہا تھا۔ رہائی کے بعد سیدھے شمع آزادی کے دونوں پروانے امرتسر پہونچے۔ جہاں انکا بے مثل استقبال ہوا۔ مولانا محمد علی اگرچہ سیاست کی دنیا سے پانچ سال تک بالکل الگ رہے تھے مگر ترکوں کی ذلت آمیز شرائط صلح اور پنجاب کے مظالم نے انکو بے چین کر رکھا تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کی طرح اعتدال پسند اور برطانیہ کے وفادار نہ تھے۔ آپ نے آتے ہی فرمایا کہ "میں جیل سے واپسی ٹکٹ لیکر آیا ہوں" کانگریس میں آپ کو ڈیلیگیٹ نامزد کیا گیا۔ آپ کی تقریر کے مندرجہ ذیل الفاظ گاندھی جی کی اُس ترمیم والی تقریر کی طرح نرم اور خوشامدانہ نہیں ہیں بلکہ آزادی کی منزل کے دیوانے رہبر کی "صدائے رحیل" ہے:۔

"میں کہتا ہوں اس آزادی کیلئے مسٹر تلک کو پھر جیل چلا جانا چاہیئے، مجھے دوبارہ عمر بھر کیلئے نظر بند ہونا چاہیئے۔ مسز بسنت کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیئے۔ مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جانا چاہیئے جیسے کہ پنجاب میں ہوئے۔"

مولانا محمد علی کی تقریر کے علاوہ مسلم لیگ کا وہ اجلاس جو کانگریس کے ساتھ ساتھ ہی امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا کانگریس کے نرم اور خوشامدانہ اجلاس سے بالکل مختلف تھا جسمیں وفاداری کا اظہار بدرجہ کمال کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کا اجلاس حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اسمیں گجرات اور پنجاب کی پبلک کی حرکات کو مذموم سمجھ کر انکے خلاف کوئی رزولیوشن پاس نہیں کیا گیا۔ بلکہ امرتسر کے واقعات پر بہت اظہار افسوس کیا گیا۔ تقسیم ترکی کے متعلق گورنمنٹ کو دھمکی دی گئی

اور ایک رزولیوشن میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کو انگلستان واپس بلا لینے تک کا مطالبہ کیا گیا۔ ع بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ہندو مسلم اتحاد پر یہاں تک زور دیا گیا کہ عید الضحےٰ کے موقع پر حتی الامکان گائے کی قربانی کم کرنی قرار پائی۔

مولانا محمد علی مرحوم نے سب سے پہلے مسئلہ خلافت پر قدم اٹھایا۔ وہ اُن شرائط سے بہت مایوس تھے جن پر راضی ہونے کیلئے اتحادیوں نے ترکوں کو مجبور کر کے ترکی کو تقسیم کر لیا تھا اور ابتدائے جنگ میں جو وعدے خلیفہ سے اور مسلمانان ہند سے کئے گئے تھے ان سب کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایک وفد وائسرائے سے ملا اور مسلمانان ہند کا نقطۂ نظر واضح کیا۔ وفد کے ایڈریس سے خاص اقتباس یہ ہے :۔

"ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی بڑا اور زرخیز حصہ زمین ہو یا کیسا ہی زبردست سیاسی مسئلہ ہو، مگر وہ معاوضہ نہیں ہو سکتا اُس اخلاقی عزت کے نقصان کا جو برطانیہ کو ہوگا اگر وعدے حرف بحرف پورے نہ کئے گئے۔ اخلاقی رعب کا خاتمہ اسلئے اور گراں معلوم ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائیگی جو حضور والا کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کئے تھے"

مگر وائسرائے کا جواب بہت مایوس کن ملا۔

اس کے بعد مولانا محمد علی کی ہی سرکردگی میں دوسرا وفد امرتسر لیگ کے رزولیوشن کی تکمیل میں یورپ بھیجا گیا۔ وہاں مولانا محمد علی مرحوم نے وزرا اور ذمہ دار اصحاب بالخصوص پاپائے روم سے ملکر اور پبلک میں تقاریر کر کے

مسلمانان ہند کا نقطۂ نظر مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کیا۔

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ جزیرۃ العرب، مسوپوٹامیہ، عرب، سیریا اور فلسطین مع تمام مقامات مقدسہ خلیفہ کے ماتحت رہنے چاہیئیں۔ مگر شرائط صلح کے مطابق تھریس یونان کو دیدیا گیا ایشیا، ترکی مقبوضات، فرانس اور برطانیہ نے تقسیم کرلئے اور ایک ہائی کمیشن مقرر کردیا گیا جو اصل میں حکمراں تھا اور خلیفہ قیدی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔

لیکن آخرکار حسب توقع کوئی کارآمد نتیجہ برآمد نہو سکا۔ اور آٹھ ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد وفد ہندوستان واپس آیا۔ وفد کا بہت زبردست استقبال کیا گیا اور اسکی ناکام مراجعت نے مسلمانوں کے دلوں کو اور بھی مضطرب کردیا اور برطانیہ کے خلاف انکے دلوں میں نفرت کا بہت کچھ اضافہ ہوگیا۔ اور اب انھوں نے طے کرلیا کہ حکومت برطانیہ سے کسی قسم کا تعاون کرنا گناہ عظیم ہے۔

۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو تمام ہندوستان میں جلسے کئے گئے، اور ہڑتالیں کیگئیں مولانا شوکت علی نے ایک تجویز اس تاریخ کیلئے تیار کی کہ:-

"اگر صلح کے شرائط ہمارے مذہب کے خلاف ہوئے تو مسلمانان ہند تحت برطانیہ کی وفاداری کا تعلق منقطع کرلیں گے۔

مئی میں صلح کے شرائط شائع ہوئے اور خلافت کی تحریک میں ایک نئے جوش کا اضافہ ہوگیا۔

آخرکار خلافت کمیٹی نے جو ۱۹۱۹ء میں تحفظ خلافت عثمانیہ کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ بمبئی میں ۱۹۲۰ء میں طے کردیا کہ اب مسلمانان ہند کے پاس

کوئی چارہ کار نہیں سوائے اسکے کہ موجودہ حکومت سے ترک تعاون کریں۔

خاص اسی روز ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی جس نے ہندوستانیوں میں ایک مایوسی اور بے چینی پیدا کردی۔

۳۰ مئی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بنارس میں ہوئی۔ یہاں ایک لیڈروں کی کانفرنس ترک موالات کے پروگرام پر غور کرنے کیلئے بنائی گئی جسکی میٹنگ ۲ جون کو الہ آباد میں ہوئی۔ کمیٹی نے اپنا پروگرام شائع کیا جس میں برٹش اشیاء کا بائیکاٹ اور عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ شامل تھا۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی اس پروگرام کا پہلے ہی اعلان کر چکی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کانگریس نے ابھی تک کوئی تجویز ترک موالات کی پاس نہ کی تھی صرف پروگرام پر غور تھا لیکن آل انڈیا خلافت کمیٹی نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں اسکو پاس کر چکی تھی اور جسکی تائید میں کلکتہ اور دوسرے بڑے مقامات میں مسلم جلسے بھی ہو چکے تھے۔ اور پھر ۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو مدراس خلافت کانفرنس میں خطابات کا واپس کرنا، مجسٹریٹیوں کو چھوڑنا اور ملازمتیں چھوڑنا بھی پروگرام میں شامل کر لیا گیا تھا۔

تحریک ترک موالات کا باقاعدہ اعلان صرف مسلمانوں کی طرف سے یکم اگست کو ہوا اور علی برادران نے اس مقصد کیلئے ملک کا دورہ شروع کر دیا۔ علی برادران نے بڑی خوشامدوں کے بعد گاندھی جی کو عدم تشدد کا کافی یقین دلا کر ہموار کر لیا تھا لیکن لالہ لاجپت رائے اور مالویہ جی وغیرہ انکو ہمیشہ ان خطرات سے ڈراتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے اس قسم کی تحریک کے ساتھ ساتھ افغانستان وغیرہ سے اتحاد

پیدا کر دیا تو ہندوستان کیلئے خطرۂ عظیم بنجائیگا۔ لیکن مولانا محمد علی کے یقین دلانے پر وہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ ابھی تک کانگریس کے دوسرے لیڈر بالکل الگ تھے۔

علی برادران کے دوروں نے ملک میں آگ لگادی تھی اور ہندوستان کے ہر گوشہ کا مسلمان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ تھا۔ ترکوں کی تذلیل اور ہندوستان کے مظالم نے تحریک کے آغاز ہی میں صوبہ سرحد اور سندھ کے بعض غیور قبائل کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کی ظالم حکومت کو چھوڑ کر افغانستان ہجرت کر جائیں اسلئے کہ انکے نزدیک اب ہندوستان دارالحرب تھا۔ اگست کی سخت گرمیوں اور زمانہ برسات میں اٹھارہ ہزار مسلمان ہجرت کر کے افغانستان کی راہ لے چکے تھے۔ مگر افسوس جب وہ افغانستان پہونچے تو افغانی حکام نے اُن کا داخلہ وہاں بند کر دیا جس سے انکو پھر واپس آنا پڑا اور اسطرح جو نقصانات ان کو اُٹھانا پڑے وہ ناقابل بیان ہیں۔

یہ عجب لطف ہی کہ مسلمان ترک موالات کی تجویز پر عامل ہو چکے تھے اور لڑائی شروع کر چکے تھے مگر کانگریس اور تمام ہندو لیڈر ابھی تک ترک موالات کو منظور بھی نہ کر سکے تھے۔

۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس ہوا جسمیں ترک موالات کی تجویز کو پاس کیا گیا لیکن دسمبر ۱۹۲۰ء تک اسپر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ اسلئے کہ ابھی ناگپور کے اجلاس میں اسپر قطعی فیصلہ ہونا باقی تھا۔ ہندو عوام اور لیڈر ابھی تک کوئی سخت قدم اُٹھانے کو تیار نہ تھے۔ آخرکار دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور کا مشہور اجلاس ہوا۔ مسلمانوں کے جوش عمل اور آمادگی کار زار کا ثبوت یہ ہے کہ

ناگپور سشن میں ۱۴۵۸۲ ڈیلیگیٹ میں سے ۱۰۵۰ مسلمان ڈیلیگیٹ تھے اور ترک موالات کو اسی طرح منظور کرنے کے منتظر تھے جیسے خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ میں کر چکے تھے۔ دسمبر میں مسلم لیگ بھی ترک موالات کی تجویز پاس کر چکی تھی۔ لیکن کانگریس میں دو گروپ تھے اور دونوں ایک دوسرے کے بہت مخالف۔ مسٹر سی۔ آر داس اس پروگرام کے اسقدر مخالف تھے کہ مشرقی بنگال اور آسام سے دو سو پچاس ہم خیال ڈیلیگیٹ اپنے اخراجات سے ناگپور لیگئے تھے اور چھتیس ہزار روپیہ اپنے پاس سے صرف اسلئے صرف کیا تھا کہ جو کچھ کلکتہ میں پاس ہو چکا ہے اُسکو رد کر دیا جائے۔ لندن کی لیبر پارٹی کے نمائندے بھی اس پروگرام کے سخت مخالف تھے۔ مہاتما گاندھی جی کو مولانا محمد علی مرحوم نے ضرور ہموار کر لیا تھا اور وہ پروگرام کے پورے طور سے موافق تھے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کسی طرح بلا واسطہ یا بالواسطہ تشدد نہو گا۔ اسکا مولانا نے انکو یقین دلا دیا تھا۔ ناگپور سشن میں صرف ایک ذات محمد علی کی تھی جو ہر شخص کو ہموار کرنے اور لڑنے میں مصروف تھی۔ جن آنکھوں نے اس اجلاس کا نظارہ دیکھا ہے اور برادران وطن کے ایک طرف ڈر ڈر کر قدم اٹھانے کو اور دوسری طرف محمد علیؒ کی جانفشانیوں اور اپنے مخالفین کو ہموار کرنے کی کوششوں کو ملاحظہ کیا ہے وہ ضرور آج کے "آزادی" کے ہیروؤں پر ہنستے ہونگے۔

کرنل ویج ووڈ (Wedgwood) نے (جو لیبر پارٹی کے نمائندہ ہو کر شریک اجلاس ہوئے تھے) سبجیکٹ کمیٹی میں "ترک موالات" کے

سلہ ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۳۴۷۔

پروگرام کی مخالفت میں جب فرمایا:۔

"آپ لوگ ایسا کرنے سے اپنے دوستوں کے لئے جو لندن میں آپ کی حمایت کرتے ہیں مشکلات پیدا کر دینگے۔آپ خود اپنے کام میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ پولیس آپ کے پیچھے ہوگی۔قانون پیشہ لوگ تحت کی وفاداری کی قسم کھاتے ہیں اور وہ ترک موالات میں حصہ نہیں لے سکتے آپ ایک نامعلوم صحرا میں گھسے جا رہے ہیں۔آپ کو تعمیری کام کرنے لازمی ہیں"

ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ محبوبۂ وطن کا سچا عاشق محمد علی فوراً کھڑا ہوا۔ اور تمام اعتراضات کا اسطرح جواب دیا:۔

"اسکو صاف صاف ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہمارے ہندوستان سے باہر کوئی دوست نہیں ہیں۔ہماری نجات خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم کو یا تو اپنے مستقبل کی بنیاد ابھی ڈالدینی چاہیئے یا آئندہ ترقی کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہم اسکو محسوس کر کے اس پروگرام کو اختیار کر رہے ہیں پولیس ہندوستانی سیاست میں کوئی نیا عنصر نہیں ہے۔گذشتہ پندرہ سال میں ہم نے ایک ایک حبہ اسی طرح دوپٹہ کے سایہ میں وصول کیا ہے بیشک قانون پیشہ حضرات کو وفاداری کے حلفنامے پر دستخط کرنا ہوتے ہیں اور اسی لئے ہم اُن سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سندیں پھاڑ ڈالیں ہم جانتے ہیں کہ ہم ایک لق ودق صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ بیشک اسلئے کہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس بہشت نژاد مقام۔ کنعاں۔ کا راستہ اسی صحرا میں

ہو کر رہے۔ اور پھر ہم کو اپنے موسٰے اور ہارون کی رہبری پر اعتماد کامل ہے کہ وہ ہم کو دروغ سے صداقت، تاریکی سے روشنی اور موت سے زندگی کی طرف لے جائیں گے۔"

اسی طرح مولانا نے ہر تقریر کا جواب دیا اور آخر میں تمام اعتراضات کے جیتے جاگتے پتلے مہاتما گاندھی کو ہموار کرنے کے بعد اُن کا سارا زور مسٹر سی۔ آر داس کی طرف تھا۔ لہٰذا سبجیکٹ کمیٹی کے ختم ہونے کے بعد مولانا حیران رہ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ آخر کار ان کی سحر آمیز شخصیت مسٹر داس پر بھی غالب آ گئی جبکہ انھوں نے مولانا سے کہا کہ "اب وہ ارادہ کر چکے ہیں کہ ان کیلئے پریکٹس چھوڑ کر ترک موالات کرنا ہی مناسب راستہ ہے۔" اور عام اجلاس میں لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ انھوں نے دیکھا کہ ترک موالات کی تجویز مسٹر سی۔ آر داس ہی پیش کر رہے ہیں۔

اب مولانا محمد علی بہت مطمئن تھے۔ اسلئے کہ ملک کی سب جماعتیں حکومت کے خلاف صف آرا تھیں۔ حکومت کا طرزِ عمل بھی کچھ اور تھا۔ ہندوستانی وفاداروں پر انعامات و اکرامات سے نوازش کی گئیں۔ سر سرینڈرناتھ بنرجی کو نائٹ بنایا گیا لارڈ سنہا کو ۱۹۲۱ء کے ابتدا میں بہار اڑیسہ کا مستقل گورنر بنایا گیا۔ لالہ ہرکشن لال کو وزیر بنایا گیا حالانکہ کچھ ماہ پیشتر پنجاب میں ان کی تمام جائداد کی ضبطی اور ان کو حبس دوام کا حکم مل چکا تھا۔ اسی زمانے میں ڈیوک آف کناٹ کو ہندوستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ وہ ہندوستانیوں کے جذبات کو اپنی صلح جو تقریروں اور وعدوں سے ٹھنڈا کر دیں۔ انھوں نے ہندوستانیوں سے بہت کچھ اپیل کی کہ گذشتہ زمانے

بھلا دیں اور خوشگوار مستقبل کی تعمیر میں کوشش کریں۔ مسٹر ولیم ونسٹ نے سپریم کونسل میں پنجاب کی زیادتیوں پر بہت اظہار افسوس کیا۔ لیکن اب یہ پشیمانی بے سود تھی اور آئندہ کیلئے اطمینان مہمل۔ سے

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مسلمانوں کا ایثار | علی برادران نے مہاتما جی کو ساتھ لیکر تمام ملک کا دورہ کیا ہندوستان کے ہر حصے میں ایک آگ لگ گئی جس کی مثال تاریخ میں نہ پہلے تھی اور نہ اسکے بعد ملنی آسان ہے۔ مسلمانوں میں ترک موالات کی تحریک ناگپور سشن سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ جسکا اعلان یکم اگست کو کیا جا چکا تھا اسی اعلان کے بعد اٹھارہ ہزار مسلمان ہجرت کی تکالیف کا شکار ہو چکے تھے۔ مولانا محمد علی جامعہ ملی کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ ترک موالات شروع ہوتے ہی ڈاکٹر انصاری اور علی برادران نے علیگڑھ یونیورسٹی پر دھاوا بولا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ یہ یونیورسٹی گورنمنٹ سے سرکاری تعلق منقطع کرلے۔ مگر جب اسمیں انکو کامیابی نہ ہوئی تو علیحدہ ایک درسگاہ کی بنیاد ڈالی اور اسمیں کامیابی ہوئی۔

اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنی استطاعت و استعداد سے زیادہ مالی امداد خلافت تحریک کی کی۔ گاؤں گاؤں سے سینکڑوں، ہزاروں روپیوں کی تعداد میں چندہ آتا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں چندہ وصول ہوا اور خلافت عثمانیہ کی حفاظت میں صرف کیا گیا۔ یا تو صرف ڈیڑھ سال قبل سُرخ پگڑی سے ڈر معلوم ہوتا تھا یا اب جیل جانے کیلئے ہر شخص بے چین اور مضطرب تھا جیلوں میں جگہ باقی نہ رہی تھی اور امیدواروں کی تعداد روز بروز بڑھتی نظر

آ گئی تھی۔ سینکڑوں مسلمانوں نے خطابات واپس کر دیئے۔ وکالتیں چھوڑ دیں
دیہات میں عدالتیں قائم کر لیں۔ اسکول اور کالج چھوڑ دیئے گئے، ہزاروں
لاکھوں سرکاری ملازم ملازمتیں چھوڑ کر باہر آ گئے۔ یہ سب کارنامے ہندوستان
اور اسلام کی آزادی کے لئے تھے جو ہندوستان کے مسلمان ہر مصیبت کا سامنا
کر کے انجام دے رہے تھے۔ چونکہ مسلمان برابر ۱۹۱۱ء سے حکومت برطانیہ
کی مسلم کش پالیسی سے تنگ آئے ہوئے تھے اور یہ تحریک خالص مذہبی تھی
اسلئے ہندوستان کی بساط سیاست پر مسلمان ہی چھائے ہوئے تھے۔ ہندو
بھی مسلمانوں کے ساتھ جیل جاتے اور تکالیف برداشت کرتے تھے لیکن
ہندو عوام جوش عمل اور تکالیف برداشت کرنے میں مسلمانوں سے بہت
پیچھے تھے۔ ہندوؤں کے لبرل اور مہاسبھائی لیڈر سب اس تحریک کے مخالف
تھے اور انکا ان کا ہوا ان کو ہر وقت ڈراتا رہتا تھا۔ مہاتما گاندھی خلافت کے
روپیہ سے علی برادران کی معیت میں دورے کرتے تھے۔

ہندوؤں نے "سوراج فنڈ" اور "تلک فنڈ" میں جتنا چندہ جمع کیا تھا اس سے
کئی گنا چندہ مسلمان خلافت کیلئے جمع کر چکے تھے۔ اسلئے ہندو لیڈر بھی اسی
چندہ کے ذریعہ سفر کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی مولانا شوکت علی کی جیب میں پڑے
ہوئے "ہندوستان بھر میں گھومتے تھے۔ وہ زمانہ بھی عجیب تھا مہاتما جی اردو
لکھنا سیکھتے تھے۔ مسلمانوں کے مکانوں پر قیام کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ہمیشہ مولانا
عبدالباری صاحب فرنگی محلی، دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور میرٹھ میں نواب
اسمٰعیل خانصاحب کے مکانات پر قیام کرتے تھے اور علی برادران کے اشاروں

ہر جگہ جاتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ مولانا محمد علی مسٹر گاندھی کو مہاتما گاندھی بنا رہے تھے۔ لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ یہی مہاتما چند سال بعد خود محمد علی کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دینگے۔

غرضیکہ ہندوستان بھر میں سرحد سے لیکر دکن کے آخری حصے تک علی برادران کا طوطی بول رہا تھا اور ہندوستان میں صرف ایک مسلمان طاقت نظر آتی تھی۔ پولیس کے سپاہی، ہندوستان میں نووارد انگریزی حکام، ہندو بنئے "مسلمان" کے نام سے ڈرتے تھے۔ اور محمد علی کا نام آتے ہی عزت اور خوف سے پریشان ہو جاتے تھے۔

مسٹر ولنٹائن شرل نے اپنی کتاب "اضطراب ہند" میں بالکل سچ فرمایا ہے:—

"مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران کی گردن پر ہے جنھوں نے کانگریس میں داخل ہو کر امن پسند ہندوؤں میں جرأت کے عناصر پیدا کئے۔ اور ادھر مسلمان فوج کو بغاوت پر آمادہ کیا۔"

"سیرت محمد علی" کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:—

"اور اس سلسلے نظام کی محور ایک ذات تھی، محمد علی! جس کی طرف اشارہ کر دیا اُس نے وکالت چھوڑ دی، جس کی طرف دیکھ لیا اُس نے نوکری چھوڑ دی، اور جس سے کہہ دیا وہ جیل خانہ ہو آیا۔"

شہزادہ ولیعہد جب ہندوستان تشریف لائے اُسوقت علی برادران مقدمہ کراچی کے

بعد جیل جا چکے تھے (جسکا ذکر مفصل آئندہ سطور میں ہے) اور ملک میں زبردست آگ پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو وہ ہندوستان وارد ہوئے۔ بمبئی ہی میں اُنکے استقبال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ والنٹیروں نے مخالفت میں مظاہرے کئے آخرکار پولیس نے گولی چلائی اور ۵۳ آدمی مرے اور ۴۰۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ اُسوقت حکومت نے مسلم والنٹیروں کے متعلق جو نوٹ شائع کیا تھا وہ یہ ہے :-

"کانگریس کے والنٹیر اسوقت گھریلو ملازموں کی طرح تھے جو میلوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ لیکن خلافت کے والنٹیر زیادہ فوجی تھے اور وہ باقاعدہ مارچ اور ڈرل کرتے تھے اور باقاعدہ وردیوں میں ملبوس رہتے تھے"[1]

مگر ان سب واقعات سے زیادہ لرزہ خیز داستان ان بہادر عربی النسل مسلمان موپلاؤں کی ہے جنکے ساتھ حکومت نے نہایت بیرحمانہ اور وحشیانہ سلوک کئے۔ مالابار میں بھی اور مقامات کی طرح تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ کلکٹر مالابار نے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا اور سیٹھ یعقوب حسن وغیرہ کو گرفتار کر لیا۔ جس سے موپلوں میں اور اضطراب بڑھ گیا اور جب انکے لیڈر پکڑ لے لئے گئے تو وہ ہزاروں کی تعداد میں کالی کٹ میں جمع ہو گئے مگر پولیس اور فوج نے بہت ظلم و استبداد سے کام لیا۔ ان کو بہت زدوکوب کیا گیا۔ وردیاں چھین لی گئیں اور مسجد کا محاصرہ کر کے بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا یہاں تک کہ ان کے سب سے بڑے

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۳۷۳۔

مذہبی پیشوا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور جب انھوں نے گرفتار شدہ لوگوں کی رہائی پر اصرار کیا تو ان پر گولی چلائی گئی جس سے چار سو موپلے ہلاک ہوئے۔ بدقسمتی سے حکومت کے طرفداروں میں سے ہندو زمیندار اور سپاہی بھی تھے اور مظلومین میں صرف مسلمان تھے۔ موپلوں کے ضبط کی جب حد ہو چکی تو انھوں نے بھی تشدد سے کام لیا اور تار توڑ ڈالے اور ریل کی پٹریاں اکھاڑ ڈالیں۔ اس حالت میں انھوں نے بعض مندر بھی توڑ ڈالے اور ہندوؤں کے مکانات بھی جلا دیے مگر جمعیتہ العلماء کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے صرف اُن ہندوؤں کے ساتھ زیادتی کی جنھوں نے حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ بہت ہندو ریل کی پٹریوں کے گرانے میں موپلوں کے ساتھ شریک تھے۔ حکومت نے پھر انکے ساتھ جو مظالم کئے وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ ہزاروں کو جیل بھیجا گیا ہلاک کئے گئے اور ان کی مالی حالت ہمیشہ کیلئے تباہ و برباد کر دی یہاں تک کہ وہ ابتک سانس بھی نہیں لے سکے۔ مگر ایک دل جلا دینے والا ظلم ان پر حکومت برطانیہ نے ایسا کیا جس نے کلکتہ کے بلیک ہول کے مفروضہ واقعہ کا انتقام لے لیا۔ وہ یہ کہ موسم گرما میں ایک سو موپلوں کو مال گاڑی کے ڈبوں میں بند کر کے بھیجا گیا جن میں سے ستر موپلے ہلاک ہو گئے اور تیس بری حالت میں زندہ پائے گئے۔ حکومت نے ان ہنگاموں کو فرو کرنے میں ۱۵ لاکھ روپیہ صرف کیا مگر ان بیچارے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا انکا پُرسان حال کون ہو سکتا ہے کیا کانگریس یا اس ملک کی کوئی جماعت ایسے ایثار کی ادنیٰ مثال بھی پیش کر سکتی ہے۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کا حصہ تھا کہ انھوں نے اسلام اور ہندوستان کی

خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ کانگریس ہر سال جلیانوالہ باغ کے حادثے کی یادگار اسلئے مناتی رہی ہے کہ اسمیں چند ہندو بھی شامل تھے۔ لیکن چونکہ مولویوں میں اکثر مسلمان شہید ہوئے تھے اسلئے کانگریس کی تاریخ میں بھی ان بیچاروں کیلئے چند سطور سے زیادہ جگہ نہ مل سکی)۔

کراچی کے قیدی | مہاتما گاندھی ابتدائے تحریک سے علی برادران کے ساتھ تھے اور ہندوستان کے دوروں میں مصروف تھے مگر بدقسمتی سے انکے دل میں ابھی تک یہ خوف باقی تھا کہ ہندوستان کے مسلمان دوسرے اسلامی ممالک کی مدد حاصل کرکے ہندوستان کو غلام نہ بنا ڈالیں۔ اسلئے وہ معمولی تشدد سے بھی گھبراتے تھے۔ اتفاق سے ۸ رجولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں زیر صدارت مولانا محمد علی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ: ۔

"کوئی مسلمان نہ فوج میں ملازم رہے نہ بھرتی ہو اور نہ بھرتی میں مدد دے اسلئے کہ کسی بایمان مسلمان کا دوسرے مسلمان پر تلوار اٹھانا گناہ عظیم ہے"

اس رزولیوشن پر مولانا محمد علی نے تقریر کی جو "تقریر کراچی" کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ بھی پاس کیا کہ اگر حکومت برطانیہ انگورہ کی جنگ میں ترکوں کی مخالفت کی تو مسلمانان ہند آزادی کامل کا اعلان کر دینگے اور آئندہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سشن کے موقع پر آزادی پبلک ہندوستان کا جھنڈا نصب کر دینگے۔ مولانا محمد علی کی اس تقریر کراچی پر بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں۔

اُس زمانے میں ترکی کی سیاست بہت کچھ اضطراب بڑھا رہی تھی۔ اب ترکی کی پوزیشن یہ تھی کہ جنگ عظیم کے اختتام پر ورسیلز کی صلح کے بعد ترکی

لڑائی ملتوی کر چکے تھے۔ خلیفہ اتحادیوں کے قیدی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں مئی ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے سمرنا کو فتح کر لیا تھا۔ اور یونانی فوجوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ اس حالت کو دیکھکر مصطفٰے کمال نے اناطولیہ میں ایک عارضی حکومت قائم کر لی۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا تھا اور استنبول میں گھسکر نیشنلسٹ ترکوں پر بہت مظالم کئے گئے۔ خلیفہ تو اتحادیوں کے ہاتھوں میں تھے ہی۔ ان سے مصطفٰے کمال اور خالدہ ادیب خانم کیلئے سزائے موت کا حکم لکھا یا گیا اور شیخ الاسلام نے بھی فتوے دیدیا کہ جو ان آدمیوں میں سے کسی کو قتل کریگا وہ جنت میں جائیگا۔[1] مگر مصطفٰے کمال اب انگورہ آچکے تھے اور ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو گریٹ نیشنل اسمبلی کے نام سے مستقل حکومت قائم کر لی تھی۔

۱۰ر اگست ۱۹۲۰ء کو سیورے کانفرنس منعقد ہوئی اور اسکا فیصلہ بجید توہین آمیز تھا جسکی رو سے تھریس کا ایک بڑا حصہ اور سمرنا یونان کو دیدیے گئے اور بندرگاہ اور استنبول آرمینیا کے علاقہ میں شامل کرکے اتحادیوں نے رلئے ترکی کو کل پندرہ ہزار فوج رکھنے کا اختیار دیدیا گیا اسلئے گویا ترکی ایک معمولی ہندوستانی ریاست کی شکل میں تبدیل کر دیگئی۔ غضب یہ ہوا کہ سلطان وحیدالدین نے اس فیصلہ کو منظور کر لیا لیکن مصطفٰے کمال اس پر کب سر تسلیم خم کرنیوالے تھے انھوں نے دریائے سکیریا پر یونانیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد سے برابر مصطفٰے کمال کی کامیابی ہوتی رہی۔

---

[1] افسوس ہر عہد میں علماء سوء کے اس قسم کے فتووں نے ملت اسلام کو بجید نقصانات پہنچائے۔

بہرحال اُس زمانے میں ترکی کے حالات کی بنا پر سیاست افغانستان پر اور دیگر اسلامی ممالک کی سیاسی حالت پر مولانا محمد علی کو تقریریں کرنی پڑیں۔ جن سے کانگریسی ہندوؤں کے خطرہ میں اضافہ ہوا کہ اسلامی بین الاقوامیت کہیں رنگ نہ بدلے۔ پنڈت مالویہ جی اور سر سپرو وغیرہ نے مہاتما جی کو یہ بھی سمجھایا کہ علی برادران کی تقریروں میں "تشدد" کی بو آتی ہے اور ایسی چند تقریروں کے اقتباسات بھی پیش کئے۔ مہاتما جی "تشدد" کے نام سے بھی گھبراتے تھے ان کے شکوک میں اور اضافہ ہوا۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں مالویہ جی نے گاندھی جی اور لارڈ ریڈنگ میں ملاقات کرائی۔ لارڈ ریڈنگ نے بقول مصنف "تاریخ کانگریس" مہاتما گاندھی کی وفاداری اور سچائی کو فوراً سمجھ لیا اور مہاتما جی کو یقین دلایا کہ وہ ان کی اس پُرامن تحریک ترک موالات میں بالکل حائل نہ ہونگے لیکن ساتھ ہی وائسرائے نے گاندھی جی کی توجہ علی برادران کی تقریروں کی طرف مبذول کرائی اور ثابت کیا کہ وہ ان کے فلسفۂ عدم تشدد کے خلاف ہیں اور ان سے تشدد پیدا ہو سکتا ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے مہاتما گاندھی سے وعدہ کیا کہ وہ خلافت ترکیہ کے اقتدار کے بحال کرنے اور ہندوستان کو آزادی دلانے میں ان کی مدد کرینگے اگر علی برادران اپنی خطرناک پالیسی چھوڑ دیں۔ مہاتما جی سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ افغانستان کا ایک آدمی آکر مولانا محمد علی سے ملا اور انھوں نے امیر افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی ہے (آزادی کی دیوی کے نام نہاد ہیرو اسکو عبرت سے پڑھیں کہ گاندھی کی عدم تشدد کی پالیسی حکومت کی پیشانی پر شکن تک نہ لا سکی اسلئے کہ وہ انکے مل کی حقیقی وفاداریوں کی

گہرائیوں سے واقف تھی۔ برخلاف اسکے علی برادران کی ہر حرکت حکومت کیلئے خطرہ عظیم تھی۔ غضب ہے پھر بھی آزادی کا علمبردار وہی گاندھی ہے اور بیچارہ محمد علی جواہرلال کے الفاظ میں صرف "ایک مجنوں" ہی رہا)۔

بہرحال مہاتما جی نے چاہا کہ علی برادران ان واقعات کی تردید میں ایک بیان شائع کردیں جسمیں اسکا اظہار افسوس کردیں کہ بلا ارادہ ایسے الفاظ ان کی زبان سے نکلے جن سے تشدد کا اظہار ہوتا تھا۔

اس بیان کے متعلق خود مولانا محمد علی نے ایک تحریر میں فرمایا ہے:۔

"ہمارا خیال کبھی بھی نہ تھا کہ لارڈ ریڈنگ اسلام کا بھلا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہم ایک ایسا بیان شائع کرنے سے انکار کریں اور ہمارے ہندو دشمن مہاتما جی کو ہم سے یہ کہہ کر بدگمان کریں کہ یہ مسلمان سوراج چاہتے ہی کب ہیں؟ ان کو تو مسلمان راج مطلوب ہے، اور یہ تشدد اور افغانی مدد سے ہندوستان کو غلام بنانا چاہتے ہیں اسی لئے ایسا بیان دینے سے انکار کرتے ہیں اور یہ تو بہت ممکن تھا کہ مہاتما جی بعد کو کہتے کہ لارڈ ریڈنگ ہندوستان کو سوراج دلاتے دلاتے صرف اسوجہ سے رک گئے کہ ہم نے بیان مطلوبہ نہ دیا۔ اس خیال سے ہم بیان دینے پر اسی وقت راضی ہوگئے مگر میں نے کہا کہ پہلے وہ اقتباسات تو دیکھوں جن کی اسطرح تاویل کیگئی ہے۔ مہاتما جی اسکی معقولیت کے قائل ہوگئے۔ اور وائسرائے کو تار دیا۔"

بہرحال اقتباسات کو دیکھنے کے بعد مولانا محمد علی نے صاف انکار کردیا کہ کسی اقتباس سے بھی تشدد کا پتہ نہیں چلتا البتہ اگر اب بھی کسی کو غلط فہمی ہے تو ہم اظہار افسوس

کرتے ہیں لیکن بیان شائع ہوتے ہی وائسرائے کا تار گاندھی جی کے نام آیا جس سے
پتہ چلتا تھا کہ گویا یہ بیان وائسرائے کے ایما سے دیا گیا تھا اور انھوں نے اس ترمیم
کو منظور فرما لیا تھا۔ اسی روز وائسرائے نے چیمسفورڈ کلب میں ایک تقریر کی جس میں
اسی طرح واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا جس سے تمام ملک میں شور مچ گیا کہ
مولانا محمد علی نے معافی مانگ لی۔ مگر یقین کس کو آتا؟ مولانا محمد علی نے خلافت
کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ایک زبردست تقریر کی اور وائسرائے کی اس
چالاکی کا پردہ چاک کیا۔ اسکے شائع ہوتے ہی وائسرائے نے حکومت بمبئی کو
حکم دیا کہ وہ کراچی تقریر پر مقدمہ چلائے۔ لہذا حکومت نے علی برادران، مولانا حسین احمد
صاحب، ڈاکٹر کچلو، نثار احمد صاحب، پیر غلام مجدد اور سوامی شنکراچاریہ پر مقدمہ
چلایا۔ اصل میں علی برادران پر مقدمہ چلانا منظور تھا مگر ساتھ میں ان سب مقررین
کو لینا پڑا جنھوں نے اس رزولیوشن پر تقریریں کی تھیں۔ مولانا محمد علی کے خلاف
ایک اور ثبوت یہ تھا کہ انھوں نے ۱۲ جولائی ۱۹۲۱ء کو عیدگاہ کراچی کے میدان
میں ایک اور تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:-

"مجھ کو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی امید جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ
آپ کے دلوں میں ہمت ہو، مردانگی ہو اور آزادی کی محبت ہو، اگر آپ کو
غلامی پسند نہیں، اگر آپ آزادی کے متمنی ہیں تو آپ کو ان کے راج سے
اکتا جانا چاہیے اور آپ کے دلوں میں اس طرز حکومت کی طرف سے نفرت
برائی اور بدخواہی ہونی چاہیے، کیا یہاں کوئی وکیل ہے؟ کیا کسی کو دفعہ ۱۲۴
الف کے الفاظ یاد ہیں اگر مجھ سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو تو بتاؤ۔ دفعہ ۱۲۴ میں

نفرت، بددلی اور بدخواہی کا ذکر ہے، اور اگر اس دفعہ میں کچھ اور بھی ہو
تو وہ بھی اس گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے دلوں میں ہونا چاہیئے۔"

کراچی کا یہ مقدمہ دنیا کے ان چند یادگار مقدموں میں سے ہے جو ہمیشہ تاریخ کے صفحات کی زینت رہیں گے اور آئندہ نسلوں کیلئے شجاعت اور بہادری کا نمونہ بنے رہیں گے۔ مولانا محمد علی مرحوم جب عدالت میں تقریر کرتے تھے تو حضرت عمرؓ کی حقگوئی او صحابہ کرام کی صداقت اور لاخوفٌ علیھم کا صحیح نظارہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔

اس مقدمہ میں تقریری بیان دیتے ہوئے آپ نے ملکہ وکٹوریہ اور پارلیمنٹ کے اعلانات سے ثابت کیا کہ ہمارا یہ مذہبی حق ہے کہ ہم ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان پر تلوار اُٹھانے سے روکیں اسلئے ہم مجرم نہیں ہیں ورنہ یہ رواداری کے لمبے چوڑے دعوے کیوں ہیں؟"

آپ نے دوران تقریر میں فرمایا:۔

"ہم آج عدالت کے سامنے قیدیوں اور ملزموں کی حیثیت سے کھڑے کئے گئے ہیں، مگر جس دن خدا کی مسند عدالت کے سامنے جج اور جیوری ملزم اور انکے شرکا وکیل سرکار اور ان کے اسسٹنٹ سب لوگ اور خود بادشاہ کھڑے ہونگے اسوقت خدا سوال کرے گا، لمن الملک الیوم؟ تو بتلائیے آپ کا کیا جواب ہوگا؟"

آخر کار آپ کو ایک جرم میں جیوری نے بری کیا اور دوسری تقریر کے سلسلے میں جج نے دو سال کی سزا بامشقت مولانا محمد علی کو دی اور دوسرے پانچ مسلمان

ساتھیوں کو اعانت کے جرم میں وہی سزا دی۔

سوامی جی چونکہ ہندو تھے اور گورنمنٹ کو ہندوؤں سے مطلق کوئی خطرہ نہ تھا اسلئے ان کو صاف بری کر دیا گیا۔ زمانہ کی ناانصافی اور کانگریسی مورخین کا تعصب دیکھئے کہ ۱۹۲۱ء کی تحریک میں معمولی معمولی سزا کاٹنے پر بھی ہندو لیڈروں کو آزادی کے دیوتا "بنا یا گیا حالانکہ اس زمانے میں اے اور بی کلاس میں جگہ دیجاتی تھی لیکن ان مجاہدین حق کو جنھوں نے تحریک خلافت میں با مشقت قید کی سختیاں سہیں، برسوں زمین پر راتیں گذاریں، خشک غذائیں کھائیں اور حکومت کے پورے جبر واستبداد کا مقابلہ کیا بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنا معمولی بات ہوگئی تھی اسلئے کہ عوام عادی ہو چکے تھے اور ایسے واقعات روزانہ پیش آتے تھے لیکن صداقت کی وہ گرج اور نعرۂ حق کو وہ بلند آواز جو ڈینا خالق ہال کراچی میں محمد علی نے بلند کی تھی اس زمانے میں معمولی بات نہ تھی جبکہ گاندھی جی بھی آئینی حدود سے باہر جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ان مجاہدین حق کی ہمتوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے نہ انکے پاس بھاری توپیں تھیں نہ فضا پیما ہوائی جہاز نہ تباہ کن جنگی آلات مگر ایک نگاہ جلال جس طرف پھیر دی لرزہ آگیا۔ قصر استعمار کی دیواریں لرزنے لگیں، جب کبھی زبان کھول دی حکومت کی تلبیس کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا اور حکومت کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ محمد علی کی تقریر، تحریر اور زندگی کی ہر حرکت میں آزادی ہند، آزادی اسلام، اور آزادی انسان کی وہ صحیح تڑپ اور جنون موجود ہے جو دوسرے لیڈروں یا ستیہ گرہ کے حامیوں کو خواب میں بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اسیران کراچی نے جس مشقت کے

ساتھ جیل کی صعوبتوں کو برداشت کیا ہے ان کو مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے الفاظ میں سنئے :۔

"ورنہ چند سال پیشتر کس انسانی دماغ کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ.

نفیس اور بیش بہا سوٹ پہننے والا جیل خانے کی پھٹی پرانی، میلی کچیلی کملی

توق سے اوڑھے گا۔ مخمل کے کوچ اور پر تکلف مسہری پر لیٹنے والا کھُرّی

زمین کے مرطوب فرش پر چٹّے کے مارے ہنسی خوشی کاٹ دیگا، اور صوبے کے

گورنروں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور امرائے ہند و انگلستان کا وہ عزیز دوست

جسکا ایک دن بھی بغیر سرکاری ضیافتوں اور پارٹیوں کے بمشکل گذرتا تھا

وہ ایک دو وقت نہیں مدتوں وہ غذا کھا کر رزاق مطلق کا شکر ادا کرے گا

جس کی جانب انسان تو الگ رہے ان حکام والا مقام اور امرائے نامدار کے

کتے بھی شاید رُخ نہ کرتے"

علی برادران کے قید ہونے کے بعد ملک میں آگ اور بھڑک گئی جو پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر پوری طاقت کے ساتھ نمودار ہوئی۔ مسلمانوں نے لاکھ کے قریب چندہ جمع کر لیا۔ گھر گھر سے چندہ وصول ہوا۔ محمد علی کی بیوی اور اماں نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ جس رزولیوشن پر علی برادران کو سزا ہوئی تھی اُسکو ملک کے ہر طبقے نے جلسوں میں دُہرایا۔ اور حکومت کو چیلنج دیا کہ صرف علی برادران کو گرفتار کیوں کیا ؟ گاندھی جی نے بارہا سوال کیا کہ انکو باہر کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ لیکن حکومت کی پوزیشن صاف تھی۔ اسکو خطرہ صرف انھیں دو بہادروں سے تھا۔ مہاتما جی کی اتنی پرواہ نہ تھی۔ حکومت خوب جانتی تھی کہ علی برادران کے

بعد تحریک ایک مرتبہ زور شور پکڑ لیگی لیکن جب دولہا ہی نہوگا تو بارات کہاں تک قائم رہے گی۔ جب سرکارواں ہی نہوگا تو مسافروں کا ہجوم کبتک سفر کرتا رہیگا۔ نتیجہ آخرکار وہی ہوا۔

اس زمانے میں جبکہ علیگڈھ یونیورسٹی میں ولیعہد کی آمد پر پکٹنگ کیا گیا مالوی جی نے ہندو یونیورسٹی میں گاندھی جی کو گھسنے بھی نہ دیا اور پرنس آف ویلز کو ڈاکٹری کی آنریری ڈگری عطا کی۔

باب دہم

مسلمانوں کی ایک زبردست سیاسی غلطی اور تحریک خلافت کا حشر

علی برادران کے قید ہوجانے سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بعینہ اُس وقت جبکہ مسلم سیاست اپنی ترقی کے آخری زینہ پر پہونچ چکی تھی اور ہندوستان میں بجز مسلمانوں کی زبردست جماعت کے اور کوئی جماعت انگریزوں کے مقابلہ میں نظر نہ آتی تھی مسلم مدبرین جن میں جمعیۃ العلما کے معزز ارکان بھی تھے اور بحر سیاست کے بہترین شناور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے جسکی تلافی آجتک نہو سکی اور نہ مستقبل قریب میں امید ہے ایک غلطی تو یہ کی ہی تھی کہ رواداری کے غلط اور غیر اسلامی جذبے میں مست ہوکر وہ باتیں کیں جن کی اجازت نہ خودداری دے سکتی ہے نہ اسلام۔

عارضی اتحاد حاصل کرنے کیلئے جامع مسجد کے ممبر پر شردھانند سے تقریریں

کرائی گئیں۔ ایک ٹولی میں قرآن کریم اور گیتا کو رکھ کر جلوس نکالے گئے، مسلمانوں نے قشقے لگائے، گاندھی کی تصویروں اور بتوں کو گھروں میں آویزاں کیا۔ اور بسنت کے موقعوں پر تیوہار ہندوانہ رسم کے مطابق منائے۔ حضرت موسے کو کرشن کا خطاب دیا گیا، مہاتما گاندھی کو امام ہند کہا گیا۔ وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا۔ خان عبدالغفار خاں نے تو چند سال قبل ہی کراچی میں ایک مقدر بر کانگریسی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ گائے کی قربانی کی ممانعت کے فتوے اور نوٹوں کی پشت پر سے تقسیم کرائے گئے۔ ان چیزوں کا خمیازہ اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی ذہنیت ایک طرف مرعوب ہو گئی اور ہندوؤں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ "مسلمانوں کی خاص تہذیب ہے ہی کیا سوائے چند رسومات کے"۔

لیکن سب سے بڑی مہلک غلطی یہ تھی کہ تحریک ترک موالات کے ڈیڑھ سال بعد خلافت کمیٹیوں کے تمام کاموں کو جو داخلی تحریک سے متعلق تھے کانگریس کمیٹیوں کی طرف رفتہ رفتہ منتقل کر دیا گیا۔ اول تو ابتدا میں غلطی یہ ہوئی تھی کہ ۱۹۱۹ء میں "تحفظ خلافت عثمانیہ" کے نام سے علیحدہ کمیٹی مقرر کی تھی۔ مسلمانوں میں مسلم لیگ۔ سب سے بڑی جماعت موجود تھی جو ۱۹۰۶ء سے برابر جد و جہد میں مصروف تھی اور جنگ عظیم کے اختتام پر تو وہ ملک کی سب سے بڑی انتہا پسند جماعت تھی۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔ حکومت مسلم لیگ کو سب سے زیادہ خطرناک جماعت سمجھتی تھی۔ ایسی صورت میں تحریک خلافت مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے شروع ہونی چاہیئے تھی۔ خلافت کمیٹی کے بانی سب مسلم لیگ کے ارکین خصوصی

ستے پھر علیحدہ جماعت بنانے کی کیا ضرورت تھی ہ اس سے نقصان یہ ہوا کہ لوگ مسلم لیگ کو بالکل بھول گئے ۱۹۲۱ء تک مسلم لیگ کی پوزیشن اتنی خطرناک تھی کہ احمد آباد سیشن میں مولانا حسرت موہانی کا خطبۂ صدارت باغیانہ قرار دیکر ضبط کر لیا گیا تھا جسمیں مولانا نے انگریزوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر انھوں نے اپنا طرز عمل صحیح نہیں کیا تو مسلمانوں کو آیۂ "فاقتلوھم حیث وجدتموھم" پر عمل کرنا پڑے گا۔ اسپر مولانا کو بیس سال کی سزا "بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے" کے جرم میں دیگئی تھی لیکن اپیل میں دو سال رہ گئی تھی۔ لیکن اسکے بعد سے مسلم لیگ کی حالت برابر کمزور ہوتی گئی۔ جسکی وجہ یہی تھی کہ خلافت کی تحریک کو مسلم لیگ سے علیحدہ کر لیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترکوں نے خلافت کو خیرباد کہا اور خلافت کی تحریک کمزور ہوگئی تو مسلمان کچھ کانگریس میں چلے گئے اور کچھ گوشہ نشین ہوگئے۔ مسلم لیگ کو خالی سمجھ کر اسپر رجعت پسندوں نے قبضہ کر لیا۔ بہرحال جب خلافت کمیٹی قائم ہوگئی اور ہندوستان بھر میں اس نے شورش بپا کر دی تو اس سے سب کام لیکر کانگریس کے سپرد کر دینا ابوالکلام صاحب کی یہ ایسی غلطی تھی کہ یہ مسلمانوں کے قتل پر دستخط کرنے کے مترادف ہے ۱۹۲۱ء تک ہندوستانی سیاست کے مالک محض مسلمان تھے۔ خلافت کمیٹیاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھیں۔ اس نے کانگریس سے پیشتر اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا اور کانگریس سے اپنی تحریک کو منوا لینا اور اسکا اشتراک عمل حاصل کر لینا خلافت کمیٹی ہی کا کام تھا۔

سلہ جہاں تم ان کو پاؤ قتل کر ڈالو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے خود اسکا اعتراف مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"خلافت کمیٹی نے باوجود نہایت مایوس کن اور مہیب مخالفتوں کے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر ملک کی سب سے بڑی نائب اور سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس سے ترک موالات کا نظام عمل منظور کرا لیا۔ حتے کہ اب ترک موالات خود کانگریس کا موضوع عمل بن گیا ہے اور جو راہ ابتدا میں صرف خلافت کمیٹی کی ایک سیاسی بدعت سمجھی جاتی تھی، وہ اب تمام ہندوستان کیلئے تنہا ذریعہ نجات تسلیم کر لی گئی ہے۔ ابتدا میں صرف مہاتما گاندھی جی خلافت کمیٹیوں کی تجویز ترک موالات میں شریک و معاون تھے، لیکن اب تمام برادران ہنود ہمارے ہم عصر و ہمنوا ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی موجودہ تحریک خلافت ہی کے لئے ہے اور خلافت کی تحریک ہی سے پیدا ہوائی ہے اسکے جو نتائج اسوقت اسکے دامن عمل میں نظر آرہے ہیں وہ بھی فی الحقیقت دعوت خلافت ہی کے برگ و بار ہیں۔ اگر خلافت کمیٹی کی جدوجہد ظہور میں آتی تو کیا ہندوستان کی ملکی جدوجہد کی تاریخ میں یہ عظیم الشان فتحمندی نظر آسکتی تھی کہ گنے ہوئے نوے دنوں کے اندر ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ جمع ہو چکا ہے اور لاکھوں چرخے بیک وقت متحرک ہیں۔"

لیکن اس اعتراف حقیقت کے بعد خلافت کمیٹیوں کی تمام تحریک کانگریس کے سپرد کر دی گئی۔ اسپر ملک بھر میں تشویش پیدا ہوئی کہ اب خلافت کمیٹیوں کا کیا

ؔ ان الفاظ سے حقیقت کس قدر عیاں ہو جاتی ہے کہ ہنود کس طرح ڈر ڈر کر میدان سیاست میں اترے۔

ؔ اسی وجہ سے مسلم کیمپ میں آج گولہ باری کیجا رہی ہے ع جان من خود کردہ خود کردہ را تدبیر نیست

کام باقی رہ گیا ہے۔

اسکو مولانا آزاد نے اسطرح بیان فرمایا ہے:-

"خلافت کمیٹیوں کے بعض کارکن اس سوال کو مرکزی خلافت کمیٹی کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں اس سوال نے اک گونہ پریشانی پیدا کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تحریک خلافت کا سب سے بڑا عملی کام ترک موالات تھا۔ اسکو ہم نے کانگریس کے سپرد کر دیا ہے اور کام کے نظم و انضباط کیلئے ضروری ہے کہ تمام کام ایک ہی مرکز اور نظام سے انجام پائے۔ پس اب خلافت کمیٹیوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ ترک موالات کی دعوت و تبلیغ، قومی پنچائتوں کا قیام، چرخوں کا رواج، سودیشی کی پکار ولایتی کپڑے کا بائیکاٹ، قومی تعلیم کا اجراء، یہی کام خلافت کمیٹیوں کے کرنے کے تھے اور یہی اب ہر جگہ کانگریس کمیٹیاں کر رہی ہیں۔ پس اب خلافت کمیٹیوں کے لئے کیا چیز باقی رہ گئی؟"

اسکے بعد جناب نے فرمایا کہ تحریک خلافت کے سلسلے میں مسلمانوں کے ذمے دو کام ہیں ایک داخلی اور ایک خارجی۔ داخلی سے مراد ہندوستان سے متعلق تمام تحریک اور خارجی سے مراد سمرنا فنڈ کا اکھٹا کرنا اور بیرونی مصائب و آلام کے متعلق جدوجہد کرنا۔

"اگرچند لمحوں کیلئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ داخلی جدوجہد کا تمام نظام کانگریس نے سنبھال لیا ہے جب بھی یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ بیرونی فرائض کا تمامتر بوجھ صرف مسلمانوں کی گردنوں پر ہے۔ اور وہ بار عظیم کیا ہے؟"

"سمرنا فنڈ کا اجرا" ہے۔

یہ ہے ہمارے منصف رہبر کا فیصلہ۔ اسکے بعد جو انجام ہونا تھا ہوا مسلمانوں کی تمام قربانیاں ان کا تمام ایثار ان کا تمام سرمایہ کانگریس کے نام منتقل ہو گیا۔ اس موجودہ زمانے میں ہر چیز کسی نہ کسی پلیٹ فارم یا نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہی کانگریس جو ترک موالات کے پروگرام پر غور کرتی ہوئی ڈرتی تھی اب جبکہ ریگستان کی تمام مسافت طے ہو چکی تھی اور منزل مقصود سامنے دکھائی دے رہی تھی، میدان میں آئی اور جب مجاہدین راہ نے جو تمام مصائب کا شکار ہو رہے تھے اپنی تمام قربانیوں کا خزانہ خود بخود اسکے حوالہ کر دیا تو اسکو اپنی خوش قسمتی پر بجا طور سے ناز ہونا چاہیئے۔ پھر ہم کو "ہسٹری آف دی کانگریس" کے مصنف سے شکایت ہو تو کیوں ہو؟ ہم نے اس کے ہر ہر صفحہ کو ٹٹولا اور ہر سطر کو غور سے پڑھا مگر بد قسمت مسلمان قوم کے ایثار کا ذکر کہیں نہ ملا۔ مولانا حسین احمد صاحب اور ابوالکلام آزاد جیسے مجاہدین کانگریس اور وفادار سپاہیوں کا نام تک جب "تاریخ کانگریس" میں صرف برسبیل تذکرہ ہے تو علی برادران اور حسرت اور ظفر علیخاں کا نام کیوں آئے۔ اور وہ تو آجکل کانگریس کے "باغی اور غدار" ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم کا ذکر باوجود مصائب مالٹا کیوں آئے اسلئے کہ انھوں نے "آزادی ہند" کیلئے کانگریس پلیٹ فارم پر تقریر کر کے یا کسی دوکان پر پکیٹنگ کر کے "تھرڈ کلاس" کی جیل میں کچھ زمانہ نہیں گذارا تھا بلکہ وہ اور علی برادران وغیرہ سب بحیثیت مسلمان ہونے کے حکومت برطانیہ کے سب سے بڑے باغی تھے اور سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ بیرونی اسلامی ممالک سے انکو ہمدردی

تھی۔ اور "آزادی کے پرستاروں" کی صف میں جگہ جب ہی مل سکتی ہے جب کانگریس پلیٹ فارم سے "تھرڈ کلاس" میں سزا محض پائی ہو۔

آج وہی لوگ مسلم لیگ اور مسلمانوں کی بے عملی کے شاکی ہیں اور کانگریس کے حلیف ہیں جنھوں نے کل اس ٹریجڈی کے وقت مسلمانوں کے تمام ایثار کو کانگریس میں مدغم کرنے کی رائے دی تھی۔ یہ سب کانٹے تو خود انھیں کے ہاتھوں سے بوئے گئے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تحریک خلافت کے التواء کے اصل اسباب

اب تحریک کا تمام زور کانگریس کی طرف منتقل ہو چکا تھا اور خلافت کمیٹیاں برائے نام رہ گئی تھیں گاندھی جی ایک طرف مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف زدہ ہوئے جا رہے تھے اور اس خوف کو تشدد کے خوف سے تعبیر کرتے رہتے تھے دوسری طرف مالویہ جی گورنمنٹ کے ایما سے ان کو افغانستان کا ہوا دکھانے میں مصروف تھے اسی زمانے میں ہندوستان کے کسی اخبار نے شاہ افغانستان کی من گھڑت تقریر شائع کر دی تھی کہ "افغانستان میں وہاں کے آدمیوں کیلئے کافی خوراک اور گھوڑوں کیلئے چارہ نہیں ہے لہذا ہم کو دوسری طرف نظر دوڑانی چاہیئے"۔

سوء اتفاق سے اسی زمانے میں لندن پنچ میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی جسمیں دنیا کا نقشہ بنا کر قسطنطنیہ سے ایک تیر پھینکا گیا تھا جو سیدھا دہلی آکر لگتا تھا اس سے یہ دکھایا گیا تھا کہ ترکی فوجیں براہ راست ہندوستان پر یلغار کرتی ہوئی آسکتی ہیں۔ اور مسلمان ان کی کمک کو موجود ہیں ہی۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں ترکوں کی متواتر کامیابیوں کی خبریں آرہی تھیں مصطفیٰ کمال پاشا کی

طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۹۲۲ء کے آغاز ہی میں یونانیوں کو شکست دیجا چکی تھی۔ اور ہندوستان کے مسلمان ان کو "مجاہد اسلام" اور "سیف الاسلام" کے خطابات سے یاد کرتے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینے کو انگریز بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ لارڈ کرزن نے ۱۹۲۲ء کے اوائل میں لارڈ مانٹیگو کو ایک خط میں لکھا تھا:۔

"ان مسلسل واقعات میں ہندوستان نے جو حصہ لیا ہے یا جسقدر حصہ لینے کی اجازت دیگئی ہے وہ میری فہم سے بالاتر ہے۔ کیا مسلمانوں کی اپیل کی آخری دارالقضاۃ ہندوستان کی رائے عامہ ہی ہے"

۱۹۲۲ء کی ابتدا میں مسٹر مانٹیگو کو مسلمانان ہند کی طرفداری کرنے کے جرم میں وزارت سے علیحدہ کیا گیا۔ اس زمانے میں عہدنامہ سیورے پر نظرثانی کیگئی جس کی رو سے خلیفہ پر بہت سی پابندیاں عائد کردی گئی تھیں۔ گورنمنٹ ہند نے لوکل گورنمنٹوں اور وزراء کے مشوروں کے بعد مسلمانان ہند کی رائے کی غلط ترجمانی کرتے ہوئے سکریٹری آف اسٹیٹ کے پاس تار بھیجا تھا جسمیں جزیرۃ العرب کے تخلیہ کے متعلق کوئی ذکر نہ تھا صرف مقامات مقدسہ کو خلیفہ کے حوالے کرنے کی سفارش کی تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا:۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی توقعات کو بہ تمام وکمال پورا کرنا ناممکن ہے"

اگرچہ مسٹر چیمبرلین نے یہ اعلان کیا تھا کہ:۔

"شرائط ترکوں کے بڑے سے بڑے دشمنوں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔"
مسٹر مانٹیگو نے اپنے حلقۂ انتخاب کیمرج میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"صلحنامہ سیورے میں گورنمنٹ ہند کی ایک فریق کی حیثیت تھی اس صلحنامہ سے اگر واقعی امن قائم ہو جاتا تو گورنمنٹ ہند اسکو بلا تامل منظور کر لیتی۔

لیکن جب اسکے بعد یہ ظاہر ہوا جیسا کہ میرا خیال تھا کہ اس سے امن و صلح ہرگز قائم نہیں رہ سکتی تو گورنمنٹ ہند نے اس صلحنامہ پر نظر ثانی کی درخواست کی میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا کناڈا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کی گورنمنٹیں خاموش بیٹھی رہتیں جبکہ نام نہاد صلح سے خود ان کے اندرونی ملک میں امن و صلح برباد کی جا رہی ہو؟"

بہرحال مسٹر مانٹیگو کے استعفے کا مطالبہ کیا گیا اور جب استعفے کا دارالعوام میں اعلان کیا گیا تو بقول رپورٹر "دارالعوام خوشی کے نعروں سے کبھی اس قدر نہ گونجا تھا جتنا اسوقت۔"

استعفے کے بعد مسٹر مانٹیگو نے ایک تقریر میں فرمایا:۔

"میں متعدد بار مستعفی ہونے والا تھا لیکن میں نے صرف اسلئے تامل کیا کہ میں مسلمانان ہند سے یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ وعدے جو ان سے کئے گئے تھے کالعدم ہو گئے۔"

ان الفاظ پر تبصرہ فرماتے ہوئے مولانا محمد علی نے کوکناڈا میں فرمایا تھا:۔

"باوجود اسکے کہ ان کو مستعفی ہونا پڑا اور آج وہ نہ صرف یہ کہ گورنمنٹ میں نہیں ہیں بلکہ دارالعوام میں بھی نہیں ہیں۔ کیا ہم اُن سے سوال کریں

اور کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ وعدے جو ہم سے کئے گئے تھے کالعدم ہو گئے۔ لیکن نہیں وہ کالعدم نہیں ہو سکتے۔ دوستو اللہ کے بھروسے پر اور تمہاری مدد سے ہم ان کو دوبارہ حاصل کرینگے یا اسی جدوجہد میں فنا ہو جائیں گے۔"

بہرحال ان تمام واقعات سے ہندوستان کے مسلمانوں کی بین الاقوامی پوزیشن بہت مضبوط ہو رہی تھی۔ جسکو گاندھی جی اور مالویہ جی جیسے "وطن پرست" لیڈر کب برداشت کر سکتے تھے۔

لہذا ۱۹۲۲ء کے آغاز ہی سے تحریک ترک موالات کو کمزور کرنے کے منصوبے کئے گئے۔ مالویہ جی کا شملہ اور بنارس اور گاندھی جی کی خدمت میں باربار سفر کرنا "راز درون میخانہ" کا پتہ دے رہا تھا۔ ابھی ۱۹۲۱ء کی تجاویز احمد آباد کی روشنائی بھی نہ سوکھنے پائی تھی کہ ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس اس غرض سے کی گئی کہ تحریک کو دبا یا جائے اور کانگریس اور حکومت میں سمجھوتہ کرا دیا جائے۔ بقول مصنف "تاریخ کانگریس" گاندھی جی نے اگرچہ باضابطہ اور باقاعدہ شرکت سے معذوری ظاہر کی مگر بلاضابطہ مدد کرنے کا وعدہ کر لیا[1]۔ لیکن یہ کانفرنس کامیاب نہو سکی اسلئے کہ وائسرائے نے شرائط کو نامنظور کر دیا۔ تحریک ابھی پورے زور کے ساتھ چل رہی تھی۔ ابھی تک تحریک صرف ترک موالات تک محدود تھی اور اب ارادہ یہ کیا جا رہا تھا کہ سول نافرمانی شروع کی جائے جسکے لئے عدم ادائیگی محصول کی تحریک کے

---

[1] آج بھی گاندھی جی باضابطہ کانگریس کی مدد کر رہے ہیں۔

شروع کرنے کی تائید تمام ملک سے ہو رہی تھی۔ لیکن ۱۰ جنوری کو صلح کی امید میں اسکو آغز ماہ تک روک دیا گیا تھا مگر جب صلح سے ناامیدی ہو گئی تو تحریک کا نفاذ جلد از جلد لازمی تھا۔ تمام ملک بے چینی سے منتظر تھا کہ کب گاندھی جی باردولی سے احکامات صادر فرمائیں۔

مسلمان لیڈر مع ابوالکلام آزاد صاحب سب گرفتار ہو چکے تھے۔ عنان قیادت مہاتما جی کے ہاتھوں میں تھی۔ مولانا حسرت موہانی ابتدا ہی سے گاندھی جی کی قیادت کے خلاف تھے۔ ان کی دوربین نظروں نے شروع ہی سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا کہ یہ شخص "درمیان میں لے جا کر کشتی ڈبوئے گا" مگر ان کی کون سنتا تھا۔

تحریک خلافت کا حشر | بدقسمتی سے انجام یہی ہوا۔ ۵ رفروری کو مقام چورا چوری ضلع گورکھپور میں ایک حادثہ پیش آیا جسمیں مقامی کانگریس کے ایک جلوس نے وہاں کی پولیس کے تشدد اور ظلم سے تنگ آکر تھانہ میں آگ لگا دی جسمیں اکیس سپاہی اور ایک سب انسپکٹر آگ کے شکار ہوئے۔

لیکن اس واقعے سے کسی کو وہم وگمان تک بھی نہ تھا کہ پوری تحریک کو ایک مقامی واقعہ کی بنا پر بند کر دیا جائے گا۔ اس سے پہلے مدراس میں بلوہ ہو چکا تھا اور اسمیں کافی جانیں تلف ہو گئی تھیں۔

مگر گاندھی جی اب تحریک سے اسقدر عاجز آ چکے تھے اور مسلمانوں کی رفتار اب اسقدر خطرناک ہوتی جا رہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔ مولانا حسرت نے جب احمد آباد میں آزادی کا رزولیوشن پاس کیا تھا تو گاندھی جی نے

سو قت گھبرا کر کہہ ہی دیا تھا کہ" حسرت صاحب ہم کو اتنے عمیق پانی میں لیجا رہے ہیں جس کی گہرائی کا ہم کو پتہ نہیں" اسلئے وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے۔ اور اس واقعہ نے مالویہ جی اور دوسرے ہندو لیڈروں کو موقع دیدیا کہ گاندھی جی کے خطرہ کو صحیح ثابت کردیں۔ گاندھی جی کو یہ حیلہ خوب ہاتھ آیا اور ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو پوری تحریک باردولی میں ایک رزلیوشن پاس کرکے بندکردیگئی۔ جسکی روسے تمام والنٹیروں کے جلوس، پبلک جلسے اور جیل خانے کے سب پروگرام بند کردیے گئے۔ اور ایک تعمیری پروگرام جسمیں چرخے چلانا، شراب بندکرنا، پنچائتیں قائم کرنا وغیرہ شامل تھے پاس کردیا گیا۔

۲۴ ر ۲۵ر اپریل کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے اس رزلیوشن کو منظور کرلیا۔ اور انفرادی سول نافرمانی کی اجازت دیدی جو محض ایک شکشوئی تھی۔ اس زبردست اور پرجوش تحریک کو جو اپنی ترقی کی آخری منزل ہی نہ پہونچنے پائی تھی اور روز بروز نئی قوت کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی یک لخت بندکردینے سے تمام ملک میں شور مچ گیا۔

یہ واقعہ ہے کہ حکومت ہند نے بعید اطمینان کی سانس لی۔ انگریز اسوقت تک بعید پریشانی کی حالت میں تھے۔ ان کو اپنے ہندوستانی ملازموں تک پر اعتبار نہ رہا تھا۔ ان کو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا کہ نہ معلوم کب انقلاب کی گھڑی آجائے۔ ایسی حالت میں تحریک کا خود بخود بند ہوجانا حکومت کیلئے یقیناً نعمت غیر مترقبہ تھی۔ مسلمان سخت پریشان تھے اسلئے کہ ان سب کے رہنما جیل میں بند تھے اور جب ان اسیران فرنگ نے یہ دلشکن خبر سنی جنھوں نے اپنے خون سے اس پودے کو

سینچا تھا تو ان کی عمر و غصہ سے ناگفتہ بہ حالت تھی۔ علی برادران تو اس صدمہ جانکاہ میں اسقدر مبتلا ہوئے کہ بقول مولانا شوکت علی صاحب "دنیا ہی تاریک نظر آنے لگی" ان مصائب میں جس راستے سے امید کی کرن نظر آجایا کرتی تھی وہ ہی بند ہوگیا۔ جیل سے شیدائیان آزادی نے خطوط لکھے تو ۲۴ فروری ۱۹۲۲ء کو جب ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ان کو ایک بے ضابطہ اجلاس میں پڑھا گیا تو گاندھی جی کے پاس صرف ایک جواب تھا کہ :۔

"جو لوگ جیل جاچکے وہ سول حیثیت سے مُردہ ہیں اور باہر والوں کو مشورہ دینے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے"[1]

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی باقاعدہ نشست میں گاندھی جی پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوئی۔ باردولی رزولیوشن کے ایک ایک لفظ کے چیتھڑے بکھیرے گئے بنگال اور مہاراشٹر نے خاص طور سے مہاتما جی کی خبر لی۔ "آخر بنگال چوراچوری کا ٹیکس کیوں ادا کرے"؟ "ہمالیہ کی ترائی کے ایک گاؤں کی غلطی سے کیپ کیمورن کیوں نقصان برداشت کرے؟"

آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں گاندھی جی کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ رکھا گیا اسکی موافقت میں تقریریں بھی ہوئیں مگر جب ووٹ کا وقت آیا تو سابرمتی کے اس "سامری" کے خلاف صرف وہی ووٹ تھے جنھوں نے تقریریں کی تھیں۔ لہذا نامنظور رہا اور گاندھی جی برطانیہ کی پشت پناہی کیلئے اسی پوزیشن میں محفوظ رہے۔

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۴۰۰۔

آخر کار گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو ملک بھر کا دورہ کر کے رپورٹ کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کیلئے تیار ہے یا نہیں؟ اور آیا تشدد کا ہواسب جگہ تو نہیں پھیل گیا ہے۔ مگر اتنے عرصہ میں تحریک کمزور ہو کر خود بخود فنا ہو گئی۔ جو لوگ ہوا کا رُخ دیکھ کر واقعات کو پہچان لیتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ یہ چورا چوری کا واقعہ نہ تھا جس نے اتنی زبردست تحریک کو بند کرنے پر مہاتماجی کو مجبور کر دیا۔ آزادی کے دیوانے منزل پر پہونچکر قدم پیچھے نہیں اٹھایا کرتے، بلکہ جن کی منزل ہی الگ ہو ان کا راستہ بھی دوسرا ہوتا ہے وہ اس منزل تک اگر پہونچ بھی جاتے ہیں جس کو بادی النظر میں آزادی سمجھا جاتا ہے تو اپنا راستہ وہ فوراً بدل دیتے ہیں۔ لہذا گاندھی جی نے اس تحریک کو بند کر کے اپنے مقصد سے جسکا اظہار تحریک کو بند کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہو گیا۔ سرتابی نہیں کی بلکہ ان کی پوشیدہ منزل تک پہونچنے کا وہی راستہ تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔ جس کی نقاب کشائی ۱۹۴۲ء میں ہو گئی (جسکا ذکر مفصل آگے آئیگا)

سوال یہ ہے کہ کانگریس کے ایک معمولی رزولیوشن کے پاس کرنے سے مسلمانوں نے تمام تحریک کیوں بند کر دی؟ مسلمان خلافت کانفرنس کے رزولیوشن کے مطابق کانگریس سے کئی ماہ قبل ترک موالات کی تحریک شروع کر چکے تھے اور ناگپور سیشن کے وقت ملک بھر میں عدم تعاون کی آگ لگ چکی تھی۔ پھر کانگریس کے بند کرتے ہی خلافت نے تحریک کیوں بند کر دی؟ کیوں نہ اپنی تحریک صرف مسلمانوں میں جاری رکھی؟

یہ ایک افسوسناک داستان ہے، جس پر مسلمان ہمیشہ ماتم کرینگے اور ان وفاداران

کانگریس کے اس احسان کا شکریہ ہمیشہ ادا کرینگے جو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ انکی جماعتی حیثیت کو ختم کرکے اور خلافت کمیٹیوں سے سب حرکت کانگریس کمیٹیوں کی طرف منتقل کرکے کیا تھا۔ اگر آج خلافت کمیٹیاں مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو اسی پیمانہ پر علیحدہ قائم رکھتیں جسطرح ابتدائی سال تحریک میں تھی اور کانگریس میں ضم نہ ہوجاتیں تو چورا چوری کا معمولی واقعہ تو کیا دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کو منزل مقصود تک پہونچنے سے نہ روک سکتی تھی۔ بہرحال مسلمانوں نے خوب دیکھ لیا کہ جس قافلہ کا ساتھ انھوں نے دیا تھا وہ دور تک چلنے والا نہ تھا اور جس "صدائے دردناک" کی رہنمائی کا انھوں نے علی برادران کے جیل چلے جانے کے بعد دھوکہ کھایا تھا اب نہیں معلوم ہوگیا کہ وہ کسی رہبر کی نہیں بلکہ کسی "خودگم گشتہ رہرو درماندہ" کی آواز تھی جس نے جاکر انکو ایسے ریگستان میں چھوڑ دیا جہاں سے وہ اب تک نہ نکل سکے۔ ؎

قافلہ تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا
مشتری و مہر و مہ کو ہم عناں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں (اقبال)

کاش تقلید کورانہ کی روش پر گامزن ہونے والے حضرات غور کرتے کہ اگر واقعی کانگریس ہندوستان کو انگریزوں سے بالکل آزاد دیکھنا چاہتی تھی تو جبکہ انگریزوں کی حیات سیاسی کی اس ملک میں کوئی گنجائش نہ تھی، کیوں ان کے اکھڑے ہوئے پیر جانے میں گاندھی جی نے تمام زور صرف کردیا۔

باب یازدہم

التوائے تحریک کے بعد شدھی اور سنگھٹن جمود و تعطل

کانگریس کی اصلی شکل کا ظہور

کانگریس کی مسلم آزار پالیسی کی ابتدا

تحریک خلافت اور مسلمانوں کے اجتماعی جوش کو بہت گہرا دفن کرنے کے بعد جبکہ گاندھی جی ہتھیار کھول چکے تھے اور پسپا حالت میں قدم پیچھے ہٹا رہے تھے گورنمنٹ نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو انھیں بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ۱۸ مارچ کو مقدمہ شروع ہوا اور چند ایام میں چھ سال کیلئے جیل کا حکم سنا دیا گیا۔ اسکے بعد سول نافرمانی کی تحقیقاتی کمیٹی نے ملک کا دورہ کیا مگر موتی لال جی کی رسلئے اس زمانے میں سول نافرمانی سے داخلۂ کونسل کی موافقت میں بدل گئی اور ذہن "عدم تعاون" سے رفتہ رفتہ "تعاون" کی طرف منتقل ہونے لگا۔ خلافت کمیٹی نے تحریک ترک موالات کو ملتوی نہیں کیا تھا اور اگرچہ اُسکے پروگرام میں اب کوئی جان نہ تھی مگر اُس نے کونسل کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور داخلۂ کونسل کی سخت مخالفت کی۔ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ آخرکار شائع ہوئی اور داخلۂ کونسل کی سفارش کی۔

شردھانند کی رہائی | حالات کی رفتار ابھی یہیں تک پہونچی تھی کہ سوامی شردھانند جی

ترک موالات کے زمانہ میں جیل جا چکے تھے اپنی میعاد اسیری کو ختم کرنے سے بہت قبل بلا کسی شرط کے رہا کر دیے گئے۔ سب کو تعجب ہوا مگر سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا لیکن جب اُنھوں نے رہا ہوتے ہی راجپوتانہ کا رخ کیا اور ملکانہ راجپوتوں کو ہزاروں کی تعداد میں شدھ کر لیا تو مسلمانوں پر راز کا انکشاف ہوا۔ اُسوقت سب کو معلوم ہوا کہ تحریک اسلئے بند کی گئی تھی اور شردھانند کی بلا شرط رہائی کا اصل سبب یہ تھا۔ بعد میں گاندھی جی اور پنڈت موتی لال وغیرہ کی خاموشیوں نے اس راز کو بالکل ہی افشا کر دیا اور مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ اصل میں کانگریس کا صحیح راستہ یہ ہے اور انکے "ہندو راج" یا "اینگلو ہندو راج" کی جسکو "سوراج" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا منزل کا اصل راستہ یہی ہے۔ اسی لئے تحریک خلافت کو یک لخت بند کیا گیا تھا۔

بہرحال مسلمانوں میں اس خبر سے اک آگ سی لگ گئی مگر بدقسمتی سے اُسوقت انکی حالت ایسے راہ گم کردہ مسافر کی سی تھی جسکو منزل کی طرف جاتے ہوئے تیز گامی کی حالت میں اک دم روک لیا گیا ہو اور اسکو پریشانی کی حالت میں ایک قدم آگے بڑھانے کی ہوش و خرد بھی باقی نہ رہی ہو اور نہ کوئی رہبر "صراط مستقیم" پر لگانے کو موجود ہو اُسوقت کی حالت علامہ اقبال نے خوب بیان فرمائی ہے۔ ؎

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف　　آہ وہ تیر نیم کش جسکا نہ ہو کوئی ہدف

اُس نازک دور میں مسلمانوں کی آنکھیں علی برادران کو ڈھونڈھ رہی تھیں مگر وہ جیل کی چہار دیواری میں محصور تھے۔ بقول خود مولانا محمد علیؒ۔ ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے　　کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

عہدنامہ لوازن | اس زمانے تک مصطفےٰ کمال اپنے دشمنوں کو کافی پسپا کر چکے تھے اور انگریزوں کے وحشی ساتھیوں کو سمندر میں ڈھکیل چکے تھے۔ خلیفہ وحید الدین جو انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا بھاگ کر انگریزوں کے جہازوں میں پناہ لے چکا تھا اور عبدالمجید آفندی کو عہدۂ خلافت تفویض کر کے خلافت اور سلطنت کو علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ انگریزوں میں اب ترکوں سے لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ بقول لارڈ کرزن:-

"اب انگریزوں میں ترکوں سے لڑنے کی ہمت نہیں تھی بلکہ بخلاف اسکے برطانیہ کے انتہا پسند نوجوان ترکوں کی جنگجو ئیت سے بہت خائف تھے۔"

لہٰذا برطانیہ نے لوازن کانفرنس میں جو نومبر ۱۹۲۲ء کے اواخر میں منعقد ہوئی جولائی میں ترکوں سے معاہدہ کیا ترکوں نے اس بحث و مباحثہ شرائط میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ جیسے اچھے سپاہی تھے ویسے ہی مدبر بھی تھے۔ انھوں نے جو چاہا اس معاہدہ میں منوایا۔ بقول لارڈ کرزن:-

"یہ معاہدہ سیورے کے معاہدے سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں ترک مجلس صلح میں دوسری سلطنتوں کے ساتھ بالکل مساویانہ حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔"

اس صلح کی رو سے اگرچہ مسئلہ خلافت کو زیادہ تقویت نہیں پہونچی نہ جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا سوال حل ہوا مگر ترکوں کی داخلی آزادی مکمل طور سے حاصل ہو گئی اور یوروپ کا "مرد بیمار" روبصحت نظر آنے لگا جو آج خدا کا شکر ہے یوروپ کا "لائق فرزند" ہے۔

مسٹر لائڈ جارج کی تقریر | اسی زمانے میں ۲ اگست کے اجلاس پارلیمنٹ میں وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہندوستان کو اصلاح دینے کا یہ مطلب نہیں کہ برطانیہ اپنا

دست امانت اعانت ہندوستان کے سر سے اٹھالے اسلئے کہ ہندوستان کا کام بغیر انگریزوں کے نہیں چل سکتا۔

اس تقریر سے ہندوستان میں پھر شور مچا۔ لبرل جماعت کے اصحاب بالخصوص بہت آتش زیرپا ہوئے جو آئینی طریقوں کے بہت حامی تھے۔ سر تیج بہادر سپرو سر نیدر ناتھ بنرجی اور مسٹر چنتامنی وغیرہ لبرل حضرات نے کونسل کی ممبریوں اور وزارتوں سے استعفے دیدیے۔ مگر حکومت کو بالکل پروا نہوئی اور اس نے سرٹیفکیشن کے ذریعہ جس بل کو چاہا پاس کر لیا۔

وزیر اعظم کی اس تقریر اور صلح لوازن میں مسلمانان ہند کی یک گونہ مایوسی نے پھر ان کو مجبور کیا کہ وہ سول نافرمانی کی تیاری کریں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۱۰ر جنوری ۱۹۲۲ء کو پچاس ہزار والنٹیر بھرتی کرنے اور سول نافرمانی کی تیاری کرنے کیلئے ۲۵ لاکھ چندہ کرنے کی تجویز کو پاس بھی کیا مگر بدقسمتی سے کونسل کے داخلہ کے حامیوں اور سول نافرمانی کے حامیوں میں اسقدر اختلاف ہوا کہ سول نافرمانی کی اسکیم کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوئی۔ ادھر سوامی شردھانند کی کوششیں بارآور ہو رہی تھیں۔ اور ہندو مسلم فسادات جابجا ہو رہے تھے۔

ملی اداروں کی مدد | مولانا محمد علی مرحوم جب دو سال کی سزا کے بعد جیل سے باہر آئے تو فضا بالکل بدلی ہوئی تھی جس چمن کو سرسبز چھوڑ کر گئے تھے اب وہ وہ خزاں رسیدہ تھا۔ ؎

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور [illegible] سے تو دنیا بدل گئی

مولانا نے جیل ہی میں یہ شعر کہا تھا جو اب بالکل صادق آ رہا تھا۔

ہوا تھا قید فصل گل میں جو مرغ اس کو گلشن میں
قفس سے چھوٹتے ہی صید غم جور خزاں پایا

جیل سے نکلتے ہی آپ نے نمائندہ اخبار کو بیان دیا:۔

"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیلخانے میں آگیا ہوں مجھے بڑے دا
جیل کی کنجی کی تلاش ہے۔ تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے
حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔"

بدقسمتی یہ تھی کہ خود گاندھی جی ایسی آزادی کے حصول کے سخت ترین دشمن تھے۔
۱۹۲۳ء کے کانگریس سیشن کی صدارت کیلئے مولانا محمد علی کا انتخاب
کیا گیا۔ آپ نے سب سے زیادہ زور خطبہ صدارت میں ہندو مسلم اتحاد اور برطانیہ
کی مخالفت پر دیا۔ ایک جگہ فرمایا:۔

"ماشا وکلا میں کسی انسان کے طریقہ عبادت پر طنز نہیں کرتا مگر میری انتہائی
مایوسی کو کچھ نہ پوچھئے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میرے ہی ہم وطن ایسے
موجود ہیں جو ہماری کھوئی ہوئی آزادی کی واپسی کو بلکہ مذہبی آزادی تک
کو خطرہ میں ڈالنے پر صرف اسلئے باک نہیں رکھتے کہ ان کے نزدیک
پیپل کے درخت کی ان شاخوں کو جو سڑک تک جھک آئی ہوں۔ اور
کسی لمبے سے ڈول بانس کے نکلنے میں مزاحم ہوں کاٹ ڈالنا یا عبادت
گاہوں کے سامنے اوقات عبادت میں ڈھول یا باجہ بجانا اور جلوس کو
روکنا زیادہ مقدم ہے۔ حضرات! اگر ہم اپنا نفع و نقصان اتنا بھی نہیں
سمجھ سکتے [illegible] دوسروں کے ساتھ نہیں تو کم از کم اپنے ساتھ تو دغا [illegible]

صفائی برتیں اور آزادی کے خیال ہی پر فاتحہ خیر پڑھ دیں اور آزادی کامل
تو رہی الگ سوراج زیر سایہ برطانیہ تک کا نام زبان پر نہ لائیں ۔ ہم
غلاموں کو "کنیا" اور "کیا کو" ہم سے واسطہ؟ جب شاہی اصطبل تک ہمارا گذر
ہو نہیں سکتا تو قصر سلطانی میں توقع باریابی کے کیا معنی؟ .. اگر ہمارا
منتہائے نظر صرف علم اور بیل کے درخت اور پرشور جلوس ہی ہیں تو ہماری
ساری کانگریس کمیٹیاں اور خلافت کمیٹیاں محض تمسخر ہیں، بہتر پردہ
گرا دیں کہ تماشہ میں مزہ خاک نہیں ۔"

اس اجلاس میں مولانا محمد علی کی منشا اور خوشی کے بالکل خلاف کونسل کے
داخلہ کی اسکیم پاس ہو گئی۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ گیا کانگریس کے موقع پر جمعیۃ العلما
کا فتوے بھی شائع ہو چکا تھا کہ "داخلہ کونسل حرام نہیں ہے" لیکن خلافت
کمیٹی کی تحقیقاتی کمیٹی داخلہ کونسل کے بائیکاٹ کا فیصلہ صادر کر چکی تھی جس پر
علی برادران اور خلافت کے دوسرے حامیان آخری وقت تک عمل پیرا رہے۔

مولانا محمد علی مرحوم نے ۲۸ء میں "روداد چمن" کے عنوان سے اس زمانے
کے حالات پر بہت مفصل تبصرہ کیا۔ اگرچہ وہ مضامین بہت بعد میں لکھے گئے
مگر چونکہ انکا تعلق اسوقت کی سیاست سے زیادہ ہے اسلیے انہیں سے ایک اہم
اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے برادران وطن کی ذہنیت کی مختصر سی
تصویر سامنے آجائے گی۔

"آجکل دیار غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں، [illegible]
سے چین سے آج ایک ہجو سن رہا ہوں اپنی تعریف میں ہزاروں [illegible]

سن چکا ہوں۔ ہمارے قید ہوتے ہی ہمارے ہندو مہا سبھائی مہاراشٹر نے
عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما جی نے حکومت کو
الٹی میٹم دینے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار
ڈالدینے کے مترادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے۔ انکے
قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آزاد ہوئے
اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے
وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف
یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کیں۔ جنہوں
نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو پھر بھڑکا دیا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔

پنڈت موتی لال اور انکے ساتھیوں کو جو کچھ سوراج۔ کونسلوں اور اسمبلیوں
کی شرکت نے دلوایا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت میں پنڈت جی کو
اتنا اصرار تھا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگریس نے اس
شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگریس کے گرداگرد دو سو میل کے احاطہ
میں بھی قدم نہ رکھوں گا۔ میں نے اس خیال سے طوعاً و کرہاً اپنی پارٹی سے
آج کے خداوندان کانگریس و کنونشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں بردوا
جیل سے نکلکر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگریس
کیوں اتنی بڑی اقلیت کو نکلوا دیا، ورنہ دہلی اور کوکناڈا میں موتی لال
جی کو شکست فاش نصیب ہوتی۔"

ملک کی مذہبی تحریک اور تحفظ خلافت کی تباہی | ہندوستان کی سیاسی بے چینی اور اضطراب کا

بڑا سبب تحفظ خلافت تھا۔ مسلمانان ہند نے صرف خلافت کو محفوظ رکھنے کیلئے
بہت کچھ ایثار کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں یہ خبر ملی کہ ترکوں نے خلافت کو چھوڑ دیا تو ہندوستان
میں غم و افسوس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ زمانہ بھی مسلمانوں کیلئے عجیب تھا۔ جس
خلافت کیلئے مسلمانوں نے اتنی قربانیاں کی تھیں وہی ختم ہو گئی۔ دوسری طرف وہ
شدھی اور سنگھٹن کے بری طرح شکار ہو رہے تھے۔ ان کی سب سے بڑی نمائندہ
جماعت مسلم لیگ ان کی سیاسی غلطیوں کی بنا پر کمزور ہو چلی تھی۔ ادارہ خلافت کے
وجود سے دنیا بھر کے مسلمان ایک رشتے میں منسلک تھے لیکن جب شیخ الاسلام
اور خلافت کا عہدہ توڑ دیا گیا تو وہ آخری رشتہ بھی منقطع ہو گیا۔

ترکوں کے خلاف یہ زبردست الزام رکھا جاتا ہے کہ انھوں نے کامیاب
ہو کر اس مفید اور اسلامی ادارے کو ختم کر دیا لیکن اس مسئلے کے مختلف پہلو ہیں
ترکوں کو مورد الزام ٹھہرانے سے قبل ہر پہلو پر غور کرنا ضروری ہے۔ اول تو
خلیفہ کی طاقت اسقدر محدود ہو چکی تھی کہ وہ ترکستان سے باہر بالکل کوئی اثر
دوسری مسلمان ریاستوں اور حکومتوں میں نہ رکھتا تھا۔ اسلئے دنیا کے مسلمانوں
کو ایک سلسلے میں منسلک کرنا بالکل ناممکن تھا۔ دوسرے ترکوں نے اب تک
صرف خلافت کی بنا پر بہت نقصانات برداشت کئے تھے۔ انھوں نے
جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کیلئے بہت خون بہایا تھا۔ کبھی
انھوں نے فلسطین، حجاز اور عراق کے خراج کو اپنے مصرف میں استعمال نہیں
کیا بلکہ ہمیشہ حرمین میں ہی صرف کر دیا بلکہ اور اپنی داخلی آمدنی میں سے اکثر کی کو

۱۔ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں مفصل طور سے آ چکا ہے۔

پورا کیا۔ اسپر بھی حجاز اور فلسطین میں عربوں نے جو کچھ ترکوں کے خلاف کیا وہ ترکوں کو اس اقدام پر مجبور کرنے کیلئے یقیناً بہت کافی تھا۔ اصل میں جنگ عظیم کے بعد "وطنیت" کی مغربی لعنت سے نے ملت اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا سو

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جسطرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

"عراق عراقیوں کیلئے، حجاز حجازیوں کیلئے" اس نعرہ نے ترکوں کے دلمیں بھی یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب انکے بہادر سپاہیوں کو فلسطین اور عرب کی سر زمین میں ہی عربوں کے ہاتھوں خود ان کی حفاظت کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا تو ان کا تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے داخلی نظام کی ترقی میں مصروف ہو جانا ہی عین سیاسی مصلحت ہے"۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام اور امپیریلزم دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ خلافت کا ادارہ اب سوائے امپیریلزم کے اور کچھ نہ تھا۔ بنو امیہ کے زمانہ سے مسند خلافت شخصی حکومت اور قیصر و کسریٰ کی یادگار بن چکی تھی۔ دمشق اور بغداد کے بعض خلفاء کے استبداد و استعمار اس اسلامی تخیل کے بالکل منافی تھے جو خلافت کی روح ہے۔ ناظرین کو یاد ہو گا کہ کس طرح چند ہی سال قبل خلیفہ وحید الدین نے برٹش امپیریلزم کا شکار ہو کر خود مصطفےٰ کمال اور اسکے رفقاء کو باغی اسلام قرار دیکر ان کے قتل کا فتوےٰ دیدیا تھا۔ ایسے حالات سے مصطفےٰ کمال کو کس حد تک متاثر کیا ہو گا؟۔

علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب "تعمیر اسلام" کے مشہور و معروف "مقدمہ" میں عالمگیر اسلامی خلافت کے متعلق تین نظریوں کو پیش کیا ہے:۔

"(۱) عالمگیر خلافت ادارۂ ربانی ہے اسلئے ناگزیر ہے۔

(۲) محض ضرورت وقت پر مبنی ہے۔

(۳) ایسے ادارہ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

علامہ موصوف کا دوسرا نظریہ ترکی جدید کی سراسر موافقت کرتا ہے۔ ترکوں کا یہ استدلال غالبًا بالکل صحیح تھا کہ :۔

"تاریخ کے گذشتہ واقعات کی روشنی میں یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا نظریہ ہمیشہ ناکام رہا۔ بیشک جبتک اسلامی حکومت مضبوط و مستحکم رہی یہ نظریہ قابل عمل رہا لیکن جب وسعت حدود سلطنت کے بڑھ جانے پر متعدد خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں تو یہ نظریہ قابل عمل نہیں رہا۔ لہذا ایک زمانے میں اسپین کی عربی حکومت نے خلافت عباسیہ سے تعلق منقطع کر لیا تھا۔"

اسمیں کوئی شک نہیں کہ ترقی کی رو میں ترکوں نے بعض وہ کام کر ڈالے جو مغربیت سے مستعار اور وطنیت کے جدید تخیل پر مبنی تھے مثلاً زبان، لباس اور قانون وراثت کا بدل دینا لیکن جب اہل حجاز کی بیوفائیوں اور ذلیل حرکتوں نے ترکوں کے دلوں پر اتنا مخالف اثر ڈالا تو ان کا حد سے زیادہ تجاوز کر جانا قابل معافی ہے۔ یہ اصل میں انکے قوت فیصلہ کی غلطی ہے اور ملائیت (جو اس وقت رہبانیت کی شکل اختیار کر چکی تھی) کا رد عمل ہے اور جبکہ یہ غلطی ایسے لوگوں سے سرزد ہوئی ہو جو زندگی کی کشمکش اور جد و جہد میں بڑی تیز گامی کے ساتھ دوسری قوموں سے سبقت لے جانے کے متمنی ہوں تو یہ غلطی نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال کا یہ ریمارک بالکل بجا ہے :۔

"دیرینہ غلامیت کے طوق وسلاسل سے رہائی کی مسرت وشادمانی میں بعض اوقات لوگ اسقدر کھو جاتے ہیں کہ وہ غیر مجرب طریق کار اختیار کر لیتے ہیں"

بہرحال خلافت کے ٹوٹ جانے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلئے اور بھی صدمہ ہوا کہ غلامی کی حالت میں ان کو اپنے آزاد خلیفہ کی طاقت پر بھروسہ رہتا تھا خلافت کمیٹی نے مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت کمیٹی کے ٹوٹنے پر اظہار افسوس کیا اور اسلامی ممالک کے کسی دوسرے حصہ میں قیام خلافت کی تجویز پاس کی بسنہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں مولانا ابوالکلام صاحب کی صدارت میں خلافت کا اجلاس ہوا جسمیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ صدارت میں ابن سعود کی مذمت کی اور شریف حسین کو خلافت دینے کی رائے ظاہر کی۔ شریف حسین کے متعلق سب کو معلوم تھا کہ وہ انگریزوں کا بنایا ہوا حاکم تھا اور انگریزوں کے زیر اثر تھا اسلئے مولانا محمد علی کی تجویز پر حسرت صاحب کا خطبۂ صدارت خارج کر دیا گیا۔

باب دوازدہم

آزادی کی جگہ "شدھی" اور "سنگھٹن"

ہندوستان میں تحریک ترک موالات کے فیل ہو جانے اور خلافت کے ٹوٹ جانے سے مسلمانان ہند عجیب کشمکش میں تھے۔ اگر یہیں تک ہوتا تو غنیمت تھا۔ اب تک وہ ہندوستان کی آزادی اور بیرون ہند اسلامی ممالک کی

آزادی کے لئے خون بہا رہے تھے لیکن اب اک دم ان کو خود اپنی مذہبی آزادی کو قائم رکھنے کیلئے انگریزوں سے نہیں بلکہ خود برادران وطن سے مدافعانہ جنگ کرنی پڑی۔ اب ہندو لیڈر بجائے انگریزوں کے مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے منصوبوں میں مصروف ہو گئے اور اسی تاریخ کا پھر اعادہ شروع کر دیا جو سنہ ۱۹۱۱ء سے پیشتر ہندوستان میں موجود تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی عارضی فضا جو مسلمانوں کی بیحد کوششوں سے تھوڑے عرصہ کیلئے قائم ہو گئی تھی پھر مکدر ہو گئی اور مسلمان اسیطرح "میر ملکش" سمجھے جانے لگے جیسے پہلے سوامی شردھانند مالویہ جی اور لالہ لاجپت رائے جو سب کانگریس کے مربیان تھے ان منصوبوں میں سرگرم عمل تھے کہ کس طرح مسلمانوں کو ہندوستان سے بھگا کر حجاز میں ادم کا جھنڈا گاڑا جائے اسلئے کہ ایک طرف تو انہوں نے اپنی داخلی تنظیم کیلئے سنگھٹن کی تحریک جاری کی اور دوسری طرف شدھی کی تحریک اسلئے جاری کی کہ جو مسلمان ہندوستان میں باقی رہیں ان کو کسی نہ کسی طرح ہندو بنا لیا جائے اسطرح اگر بعد میں کچھ تعداد مسلمانوں کی رہ بھی گئی تو وہ آٹے میں نمک کے برابر ہو گی اور ان کی حیثیت اچھوتوں جیسی ہو گی۔

شدھی کی غرض و غایت مولانا ظفر علیخاں کے لفظوں میں	اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کیلئے یہ زہریلے سنگھٹنیے جنھوں نے مذہب کو سیاست

کا کھلونا بنا رکھا ہے طرح طرح کے خوفناک منصوبے گانٹھ رہے ہیں جنکا لب لباب یہ ہے کہ روٹی کے لالچ اور پروپیگنڈے کے زور سے غریب مسلمانوں کو ہندو دھرم میں داخل کر لیا جائے جو مسلمان مرتد ہونے سے بچ رہیں گے وہ آٹے میں نمک کے

برابر رہ جائیں گے اور ان کی اقلیت ہندو اکثریت میں دب کر بے اثر رہ جائیگی"[1]

اس تحریک کے اثر سے کوہاٹ میں بہت زبردست ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ گاندھی جی جیل سے اپنی علالت کی وجہ سے باہر آچکے تھے۔ مولانا شوکت علی اور گاندھی جی نے کوہاٹ کا خود جا کر معائنہ کیا۔ مہاتما گاندھی جی مسلمانوں کو قصور وار ٹھہراتے تھے اور مولانا شوکت علی کو ان سے سخت اختلاف تھا۔ لیکن جب ۲۹ مئی ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ایک بیان میں یہ کہا کہ "مسلمان دنگئی ہیں اور ہندو بزدل" تو مولانا محمد علی کو بیحد صدمہ ہوا۔

اسکے بعد تو مہاتما جی نے برابر "ینگ انڈیا" میں اس قسم کے مضامین لکھے اور ہندوؤں کو ان کی عورتوں کی عصمت کی قسمیں دلا دلا کر آمادۂ کارزار ہونے پر اکسایا۔ کانگریس کے ہندو لیڈر کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف تھے۔ اور غضب یہ تھا کہ پنڈت موتی لال، جواہر لال اور گاندھی جی بڑے اہم موقعوں پر خاموش رہتے تھے اور جب ہندوؤں کی طرفداری کرنے کا موقع آتا تو "حقیقت" کے پردے میں سب کچھ لکھ جاتے تھے۔ کانگریس مجموعی طور سے اسقدر جانبدار ہوچکی تھی کہ اسکا ہر لیڈر بھائی پرمانند سے زیادہ کٹر، فرقہ پرست بنا ہوا تھا۔ اور مسلمانوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا۔

اسی زمانہ میں علیگڑھ میں صوبہ متحدہ کی پولٹیکل کانفرنس ہوئی جسمیں وہ معاہدہ بھی زیر بحث تھا جسکی تصدیق و توثیق سری نواس آئنگر نے کلکتہ کی صدارت کے وقت کرائی تھی جسمیں گائے اور باجے کے متعلق ایک فارمولا مرتب کیا تھا۔

---

[1] زمیندار ۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء۔

اس کانگریس کے جلسہ کی حالت اس زمانہ کی کانگریس کی اصل ذہنیت کا نمونہ تھی۔ اسکو مولانا محمد علی نے خود تحریر فرمایا ہے :-

"آمنہ مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھکر جلسہ میں آیا۔ جو باتیں وہاں پہونچکر سننے میں آئیں اُنھوں نے قلب کو اَور بھی مضمحل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سبجیکٹ کمیٹی ہی میں بحث رہی جب سبجیکٹ کمیٹی کی کارروائی کا حال سُنا تو سوچنے لگا کہ آمنہ مرحومہ کیلئے رووُں یا اپنے صوبہ کا غم کروں، یہ جلسہ صوبہ کی ہندو مہا سبھا یا مسلم لیگ کا نہ تھا کانگریس کا جلسہ تھا اگر یہاں بھی باوجود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی و کلکتہ ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں اسقدر شدید اختلاف موجود ہیں۔ اور خود صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں ہندو مسلم اسطرح دست و گریبان ہیں تو اس ملک میں امن و امان کب قائم ہوگا ۔ جونہی کلکتہ والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزولیوشن کا وقت آیا معلوم ہونے لگا کہ اکثریت کی ذہنیت بالکل مہا سبھائی ہے[۲]"

گاندھی جی کی وہ مسلم نواز پالیسیاں سب ختم ہو چکی تھیں۔ جب کلکتہ میں سری نواس آئنگر کی صدارت میں گائے اور باجے کے متعلق فیصلہ کیا گیا تو گاندھی جی سب سے زیادہ حائل بن گئے اسلئے کہ وہ اسکو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی طرح بھی مسلمانوں کو

---

[۱] یہ مولانا محمد علی مرحوم کی لاڈلی بیٹی تھی جسکی علالت کی خبر جیل ہی میں گئی تھی تو آپ نے یہ شعر لکھ کر بھیجدیا تھا ۔ تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اُسکو ۔ نہیں منظور تو پھر ہمکو بھی منظور نہیں۔

[۲] سیرت محمد علی صفحہ ۱۴۴۔

"گائے کی قربانی" کا حق دیا جائے۔ اُنھوں نے فوراً ڈاکٹر انصاری کو بُلایا اور فرمایا:۔

"میں اسلئے آیا تھا کہ کچھ تمھاری مدد کروں اور ہندو مسلم تنازعات کا آخری فیصلہ کراؤں لیکن جب میں نے اس تجویز کو دیکھا۔ جسے مجلس عاملہ نے سبجیکٹ کمیٹی میں پیش کرنے کیلئے تیار کیا ہے اور جسے بمبئی اور کلکتہ کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ اس گائے والے حصہ پر تو میں دکوئی اور ہندو راضی ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے۔ مجھے رات بھر اس خیال کے باعث نیند نہیں آئی۔"

مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۲۵ء میں علیگڈھ میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں اب وہ زور باقی نہ تھا جو ۱۹۱۶ء تک تھا اور نہ اب اسکے اجلاس کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک برابر ایک ہی ساتھ رہے۔

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے لائق مصنف نے مسلم لیگ کی اس دور کی کمزوری اور غفلت پر بہت کچھ نکتہ چینی کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ "کچھ دور تک تو وہ کانگریس کے ساتھ چلی لیکن بعد میں پیچھے رہ گئی۔" بدقسمتی سے مصنف موصوف نے مسلم لیگ کو غلطی سے ایک ایسی دو طمن سمجھ لیا ہے جو خود بخود جب دل چاہے منصہ شہود پر جلوہ گر ہو جائے اور جب دل میں آئے نقاب ڈالکر گوشہ نشین ہو جائے یا وہ اسکو کوئی حرکت کرنیوالا آلہ سمجھتے ہیں جو حسب منشا جدھر دل چاہے حرکت کر بیٹھے۔ وہ عیب جوئی کے جذبے میں یہ بالکل فراموش کر گئے کہ اور جماعتوں کی طرح مسلم لیگ بھی افراد کا مجموعہ ہے اور اسکی سیاسی ترقی و تنزلی ان افراد کی ہی

[illegible]

کوششوں پر مبنی ہے۔ اُس زمانے کے اسباب و واقعات پر مفصل بحث کی جا چکی ہے جن کی وجہ سے مسلم لیگ اور مسلمانوں کی ہر جماعت منتشر حالت میں تھی اسلئے کہ خود مسلمان پریشان تھے۔ جمعیۃ العلماء ہی میں وہ زور کہاں تھا؟ اب وہ شدھی کے جواب میں تبلیغ کے کاموں میں مصروف تھی یہ آزادی کی جنگ " اُس وقت گاندھی جی نے چھوڑی ہی کہاں تھی جو کوئی جماعت بھی لڑتی ۱۹۲۰ء کے بعد کانگریس نے اپنی شکل بالکل بدل ڈالی تو مسلم لیگ کا کانگریس سے علیحدہ ہو جانا لازمی امر تھا مگر جب بھی مسلم لیگ کے ارکان شدھی اور سنگھٹن کرنے والے لیڈروں کی طرح اس قسم کے کاموں میں نہیں پڑے وہ ہندوستان کے بڑے اہم معاملات میں برابر کانگریس کے ہمدوش تھے۔

۱۹۲۳ء کے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے خطبۂ صدارت میں ہندوؤں کے اس خوف پر بہت کچھ اظہار افسوس کیا تھا جو انکو افغانستان سے ہمیشہ رہتا ہے۔

۱۹۲۴ء میں بمقام دہلی ایک " ملاپ کانفرنس " منعقد ہوئی۔ مسلم لیگ کے ارکان نے اتحاد کی بیحد کوششیں کیں مگر مالویہ جی اور لالہ لاجپت رائے کی مسلم کش پالیسی نے سب کوششیں بیکار کر دیں۔

۱۹۲۵ء کے اجلاس میں سر عبدالرحیم نے مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے اُس زمانے کے حالات پر بہت مکمل تبصرہ فرمایا اور شدھی اور سنگھٹن کی خطرناک تحریکوں کی بہت مذمت کی اور بتلایا کہ یہ تحریک اُس عیسائی جہاد سے بھی زیادہ مہلک ہے جو فلسطین کی سرزمین میں صدیوں پہلے ہوا تھا۔ اُنھوں نے ہندوؤں کے اس اعلان پر کہ وہ اسپین کی تاریخ ہندوستان میں بھی دُہرانا چاہتے ہیں سخت

احتجاج کیا اور آخر کار یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد کے بغیر بالکل ناممکن ہے۔

۱۹۲۶ء میں سر عبدالقادر نے اپنے معرکۃ الآرا خطبہ صدارت مسلم لیگ میں پھر ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا اور مشورہ دیا کہ یا تو کوئی نیا پیکٹ ہندو مسلم مل کیلئے ہونا چاہیئے یا ۱۹۱۶ء کے پیکٹ ہی کی اصلاح کر کے اسکی تجدید کر لی جائے تاکہ یہ مکدر فضا درست ہو۔ انہوں نے مسلمانوں کے تناسب کو سرکاری ملازمتوں میں بڑھانے پر بھی بہت زور دیا۔ مگر مسلم لیگ اور خلافت و جمعیۃ العلماء کی متواتر کوششوں کے باوجود کانگریسی حضرات نے کوئی پرواہ نہیں کی اور برابر مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم عمل رہے۔ علی برادران کی تمام منتیں اور اپیلیں بیکار گئیں۔ کانگریسی لیڈر اب اپنی گذشتہ پالیسی "اینگلو ہندو اتحاد" کو استوار کرنے میں کوشاں تھے۔ اور اسطرح مثلث کے دو اضلاع مل کر مسلمانوں کے تیسرے ضلع کو ختم کرنے کے منصوبے کر رہے تھے۔

لالہ لاجپت رائے نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو انبالہ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوؤں سے اپیل کی تھی۔

"ہندوؤ! اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ فلاں شخص حکومت کا گرگا ہے۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اسکے دل میں ہندو قوم کا کتنا درد ہے۔ ہم کو اب ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ہندوؤں کے مفاد کیلئے حکومت سے ملتے رہیں۔"

بھائی پرمانند اپنی تصنیف "ہندو سنگھٹن اور آریہ سماج" صفحہ ۱۰۰ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

---

[۱] ہمدم ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء

"ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح مہربانی حاصل کرنے کی جد وجہد کریں اور سرکاری عہدے اپنے ہاتھ میں رکھیں اور سرکار کے ساتھ مل کر پہلے مسلمانوں کو کمزور کریں اور ہندوؤں کی طاقت بڑھالیں۔ جب اسطرح طاقت بڑھ جائے گی۔ تو پھر سوراج حاصل کرنے کیلئے کوشش کیجا سکتی ہے۔"[1]

اس اقتباس سے ہندوؤں کی پوری پالیسی سامنے آجاتی ہے اور اصل میں اسی مقصد کے حصول کی غرض سے آزادی کی تحریک کو بند کیا گیا تھا۔

مسٹر سی۔ ایس۔ رنگا آئر بھی لاجپت رائے کی طرح کانگریس کے خاص حامیوں میں سے تھے۔ آپ نے پنڈت مالویہ کی مخالفت کانگریس پر نگینہ میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"مالویہ جی کا اعتقاد ہے کہ سوراج ہندو راج ہوگا۔ مگر اسکے باوجود وہ اسی واحد جماعت (کانگریس) کی مخالفت کر رہے ہیں جو دیش میں حصول سوراجیہ کیلئے مصروف کار ہے۔ سوراجیہ کے معنی اکثریت کا راج ہے اور اسلئے ہندو سنگٹھن کی یہی سب سے بڑی خدمت ہو سکتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کو جسمیں ہندوؤں کا غلبہ ہے مضبوط کیا جائے"[2]

اُس زمانے میں کانگریسی ہندوؤں نے علی الاعلان مسلمانوں کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی یہانتک کہ کانگریس کے تمام وفادار دوست مایوس تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے ۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو دربھنگہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"اسلامی حکومت کے زوال پر اگر خدانخواستہ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت

---

[1] پرتاپ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۹ [2] الجمعیۃ دہلی ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء صفحہ ۴۔

قائم ہوجاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی
حالت میں یہ ستم دکھارہی ہے حکمراں بنکر خدا جانے مسلمانوں کے
ساتھ کیا سلوک کرتی؟

(زمانہ کا انقلاب بھی عجیب ہے آج جب ہندو زیر سایہ برطانیہ سات صوبوں میں
حکمراں بنکر مسلمانوں کے ساتھ سختیاں کر رہے ہیں تو وہی مولانا اُن کے بہترین
معاون اور دوست ہیں)۔

اس پُر آشوب اور اندوہناک دور سیاست میں جبکہ خدا دندانِ
کانگریس ملک میں نفرت و عناد کے شعلے بھڑکا رہے تھے اور
کچھ اُن کی ہمت افزائی خوشی کے ساتھ در پردہ کر رہے تھے موتی لال
جی سوراجیہ پارٹی کی قیادت اسمبلی میں فرما رہے تھے۔ اور ہائیکورٹ
میں پریکٹس بھی کر رہے تھے۔ گاندھی جی اپنے آشرم میں خاموش بیٹھے ہوئے
تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر کچلو وغیرہ تنظیم اور جمعیۃ العلما کے کاموں میں
سرگرم عمل تھے۔ مگر صرف علی برادران اور اُنکے رفقا کی جماعت نہ تنظیم و
تبلیغ میں حصہ لے رہی تھی اور نہ خاموشی کے ساتھ گوشہ نشین بنکر تماشہ دیکھ رہی
تھی بلکہ کانگریس کی استواری کے ساتھ وفادار تھی۔ مولانا محمد علیؒ نے خود
گاندھی جی کو سمجھایا ڈاکٹر انصاری اور ابوالکلام کے ذریعہ ان کو پیغام بات
پہونچائے مگر اُن کی مہر سکوت ہرگز نہ ٹوٹی۔ برخلاف اسکے شدھی اور سنگھٹن
کے ہیرو شردھانند جی اُنکے سب سے بڑے محرم راز اور مقرب خاص بنے ہوئے تھے
اور مالویہ جی اور ڈاکٹر مونجے مہاتما کی آنکھوں کے تارے تھے۔ امرتسر پراونسل

کانگریس کے موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے جب مالوی جی کی مسلم آزار پالیسی پر تبصرہ کیا تو گاندھی جی نے فرمایا کہ تم نے آج میرے سینے پر گھونسہ مار دیا۔"

اسی طرح جب سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا تو گاندھی جی کو اسقدر صدمہ ہوا کہ شاید اپنے کسی زبردست عزیز کا ہوتا۔ انکے مرنے کے بعد "یادگار شردھانند" قائم کرنے کیلئے گاندھی جی نے دس لاکھ روپوں کا اپیل کیا سوامی شردھانند کی یادگار سوائے شدھی کی تحریک کو استوار کرنے کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ اسکی اصل غرض اڈیٹر "زمیندار" کے قلم سے سنئیے :-

"دس لاکھ روپیہ کا جو اپیل شردھانند کی وفات کے بعد مالوی جی، لالہ لاجپت رائے، لالہ سرینیدر ناتھ اور گاندھی جی وغیرہ کی طرف سے یادگار شردھانند قائم کرنیکے لئے ہوا ہے۔ اُسکی غایت الغایات یہی ہے کہ دنیا میں تو نہیں لیکن کم از کم ہندوستان میں کوئی مسلمان باقی نہ رہے۔"[۱]

پنڈت جواہر لال نہرو نے تو سوامی شردھانند کو اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں وہ مقام دیا ہے جو محمد علی اور کسی مسلمان لیڈر کو نہیں دیا۔

پنڈت جی کی نظروں میں سوامی جی "شہید قوم" اور انکا قاتل ایک "مذہبی دیوانہ" ہے۔ چونکہ کانگریسی حضرات یہ کہکر تسلی کر لیا کرتے ہیں کہ شردھانند کی سب تحریکیں محض اپنی ذاتی کوشش اور حکومت کے ابھارنے سے تھیں۔ کانگریس کا اسمیں کیا قصور؟ ان کو ان واقعات کو پڑھ کر شرم سے اپنی گردن جھکانا پڑے گی۔

---

[۱] زمیندار ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء

مولانا محمد علیؒ نے مضامین کا ایک بڑا سلسلہ شروع کیا اور تقریریں بھی کیں جس میں یہی ماتم کیا کہ جن لوگوں سے اُمیدیں تھیں وہی آج ملکی آزادی کو دفن کر رہے ہیں۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون میں ان حالات کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

"نہ ہم نے پنڈت مدن موہن مالوی جی اور سوامی شردھانند کی طرح ہندو مہاسبھا کی قائم کردہ سنگٹھن اور شدھی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور اُن کے رفقا کی طرح تبلیغ و تنظیم کے نام سے ڈھنڈھورا پیٹا۔ . . . . مہاتما جی نے کوہاٹ کے نزاع کی خبر سنتے ہی ہم سے خاص طور سے خطاب کرتے ہوئے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم سمجھتے ہیں اسکے بعد تو انھوں نے ہندو مسلم تنازعات اور مناقشات کو چکانے کا کام ہی بند کر دیا۔ اور جب کبھی اُن سے ہم دونوں بھائیوں ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود یا اور کسی نے اس بارہ میں عرض کیا تو انھوں نے اسمیں حصہ لینے سے انکار فرمایا اور اس کام کو کلیۃً خدا ہی پر چھوڑ دیا۔"

کانگریس کی مہاسبھائی ذہنیت کا اندازہ دہلی میں مخلوط انتخاب میں اسمبلی کی نشست کے انتخاب کے موقع پر تو ہو ہی چکا تھا جب مسٹر آصف علی کو ایک ہندو کے مقابلہ پر شکست فاش نصیب ہوئی۔ حالانکہ مسٹر آصف علی ہمیشہ کانگریس کے وفادار سپاہی رہے ہیں۔ اسمبلی میں جب سرحد کی اصلاح کا معاملہ پیش آیا تو موتی لال اور ان کی پارٹی نے تمام ملک میں مساوی حقوق دیے جانے کی مخالفت کی اور اسمبلی میں ووٹ بھی سرحد کے خلاف دیا۔ اس واقعہ سے مولانا

محمد علی اور دوسرے مسلمانوں کو بیحد صدمہ ہوا۔ اسکو مولانا نے اسطرح بیان فرمایا ہے:۔

"میرا ان کا (موتی لال کا) سارا اختلاف اس باعث ہے کہ اول تو انھوں نے مہاتما گاندھی کی قید کے زمانے میں اُنکے خلاف بغاوت کی اور کانگریس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ دوسرے اُنھوں نے ایک ورباغی لالہ لاجپت رسلے کی امداد حاصل کرنے کی امید پر صوبہ سرحد اور سوراج پارٹی دونوں کے مسلمانوں کی حق تلفی کو گوارا کیا اور حق پر ثابت قدم نہ رہے۔"

ہمدرد میں اس واقعے پر اس طرح اظہار بیان کیا ہے :۔

"پنڈت موتی لال نہرو نے جو اپنے سوا صرف ایک دیوتا یا دیوی کی پرستش کرتے ہیں اور اسکا نام اکثریت ہے اور جو لالہ لاجپت رسلے کو سوراج پارٹی کے رفتہ میں مربوط کرنے کی غرض سے صوبہ سرحد کو اصلاحات دیے جانے کی مخالفت کر چکے تھے۔ الا یہ کہ وہ پنجاب میں مدغم ہو کر اپنی ۹۲ فیصدی مسلم اکثریت کو تقریباً ضائع کر دے۔ صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ انتخابات کے زمانے میں اُن سے ہرگز توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ ہندو مہاسبھا اور اُس کی نازیبا حرکات کی مخالفت کریں گے۔"

ان حالات اور واقعات کے باوجود بھی مولانا کانگریس میں نہ صرف شامل رہے بلکہ اسکی فضا کو بہتر بنانے میں مصروف رہے۔ خود مسلمانوں نے ارکان خلافت کو بُرا بھلا بہت کچھ کہا اور اُنکے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کی مخالفت نہ کرنے پر سخت نکتہ چینی کی گئی مگر وہ اپنے راستہ پر جمے رہے۔

۱۹۲۴ء میں راجپال نے "رنگیلا رسول" کے نام سے ایک ملعون کتاب لکھی

جس پر ہندوستان بھر میں شور مچ گیا۔ اس کتاب میں رسول مقبول کی ذات مبارک پر بہت ناپاک حملے کئے گئے تھے۔ کتاب کے خلاف چارہ جوئی کی گئی مگر جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کو بالکل بری کر دیا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں ہندوستان بھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ دلیپ سنگھ کے مستعفی ہونے اور حکومت سے قانون کے بدلنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ہندو مسلم تعلقات اس کتاب کی بنا پر بالکل خراب ہو گئے۔ حیرت یہ تھی کہ اب کانگریس ذہنیت اسقدر ذلیل ہو گئی تھی کہ کسی کانگریسی لیڈر نے ایک حرف بھی اس فیصلہ کے خلاف نہیں کہا۔

ان واقعات پر غور و خوض کرنے کیلئے ہر طرف سے مایوس ہو کر خلافت کانفرنس کا جلسہ دہلی میں ۱۹۲۸ء میں کیا گیا۔ جس کے صدر علامہ سید سلیمان ندوی تھے۔ اس اجلاس کا مقصد بھی یہی تھا کہ امن و اتحاد کی کوئی راہ نکالی جائے۔

مولانا اس کانفرنس کے انعقاد کی غرض اسطرح بیان فرماتے ہیں:۔

"جب پنڈت موتی لال نے ہندو مہا سبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کر دیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر اُن سے صاف کہدیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں جب ہماری سعی لاحاصل رہی اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہا سبھائیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا۔"

اس اجلاس میں خطبۂ صدارت اور تمام تجاویز کے ذریعہ کانگریسی لیڈروں سے التجائیں کی گئیں کہ خدا کیلئے اگر ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے غلام رکھنا نہیں ہے تو آپس میں اتحاد کی کوشش کیجئے۔ مسلمان ہر وقت اپنی دوستی کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھائے ہوئے

ہیں۔ لیکن باوجود اسکے بھی ہندو پریس نے مسلمانوں کو گالیاں دینے میں کوئی کمی نہیں کی تھی اور اس مرتبہ تو حکیم اجمل خاں اور محمد علی مرحوم کو بھی سب کچھ سنا ڈالا گول میز کانفرنس کے بعد جب مولانا محمد علی وفد حجاز کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے تو جو تقریر آپ نے اسٹیشن پر کی اُس کے ایک ایک لفظ سے اُن کی رواداری، تدبر اور قابل قدر قوت برداشت کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ کانگریس پریس ان کو گالیاں دینے میں مصروف تھا۔ مولانا مسلمانوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :-

"یہ ملک کیلئے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے، نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری کھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو"

گاندھی جی اُس وقت بالکل خاموش تھے۔ سو اتفاق سے ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندے نے کتاب راجپال کے فیصلے کے متعلق پنڈت موتی لال سے جا کر سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ "اس معاملہ میں مَیں کچھ نہیں کہنا چاہتا" اس موقع تک پر بھی علی برادران اور رفقا رخلافت خاموش رہے اور غلطی قانون ہی کی بتلائی۔ اور واقعہ بھی یہی تھا کہ غلطی جج کی اتنی نہ تھی جتنی خرابی قانون کے ان مبہم الفاظ کی تھی۔ کتاب کے شائع ہوتے ہی باینہمہ خاموشی مولانا محمد علی کو بے حد صدمہ ہوا۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا :-

"جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے نہ قانون کی ضرورت ہے نہ عدالتوں کی حاجت اگر کوئی ہندوستانی عالی اسقدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس ہوا کر اُس سے متمتع ہونے کے حق سے بیت برداری کا طالب ہے لیکن

انسان جو اشرف المخلوقات ہیں اُنمیں سے سب سے اشرف یعنی کونین سرورِ
کونین باعث تکوین دو عالم کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا
ہے اسکا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اُس برگزیدہ ہستی کی توہین کرکے میرے
قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے تو ہندوستان کو اس غلامی سے
نکالنے کیلئے جسمیں آج وہ مبتلا ہے اور جو گاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے
کہیں زیادہ ہمارے مذہب اور ہماری ملت کیلئے بے حرمتی کا سبب ہے مجھ سے
جہاں تک صبر ہو سکے گا صبر کروں گا اور جب صبر کا جام لبریز ہو جائے گا
تو اُٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل گندہ دماغ گندہ دہن کافر کی جان خود
لے لونگا یا اپنی جان اس کوشش میں کھو دوں گا"

اب مولانا محمد علی اور اُنکے رفقاء کے صبر کا جام لبریز ہو چکا تھا لہذا اُنھوں نے
ارادہ کیا کہ اُن کی روباہ بازیوں کی قلعی کھولی جائے اور انھوں نے مالویہ جی اور
ڈاکٹر مونجے کی مسلم آزار پالیسی پر مضامین ہمدرد وغیرہ میں لکھے جسکا لکھنا تھا کہ
وہ ہی "قوم پرست" "محمد علی" "غدار" اور "قوم فروش" کے خوشگوار الفاظ سے یاد کئے
جانے لگے اور تمام ہندو پریس میں اک آگ لگ گئی۔ مولانا نے نہایت صبر کے
ساتھ اس واقعہ کو ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں "روداد چمن" کے عنوان میں لکھا ہے:-

"مجھے معلوم نہ تھا کہ مہاتما جی "تارکین تعاون" سوراجی جوابی تعاون والے اور
وہ لبرل جنھوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کرکے تارکین تعاون کو معہ
مہاتما جی جیل بھجوایا تھا سب ڈومنین اسٹیٹس اور ہندو مہاسبھائیت پر لٹو
ہو جائیں گے اور وطن دوست اور حامیان اتحاد کہلائیں گے اور سلسلے

ہندوستان میں اگر کوئی تفرقہ پرور، اتحاد کا دشمن اور وطن کے خلاف غدار رہے گا تو اُسکا نام شوکت علی ہوگا یا محمد علی"

غضب یہ تھا کہ مالویہ جی باوجود اپنی تمام مسموم حرکتوں کے کانگریس کی مجلس عاملہ میں دو سال سے شامل تھے اور مولانا محمد علی باوجود اپنی قوم پرستی کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی تک میں کلکتہ میں منتخب نہو سکے تھے۔ اس حقیقت کو مولانا نے کسقدر حیرت اور افسوس کے ساتھ لکھا ہے :۔

"وہی مالویہ جی جنھوں نے مہاتما جی کے قید کر دیے جانے کے بعد پنجاب میں کھادی بیچنے کیلئے جاکر سنگھٹن شروع کر دیا، اور ہندو مسلمانوں کے ۱۹۲۱ء کے حیرت انگیز اتحاد کو توڑ ڈالا اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو خواب و خیال بنوا دیا باوجود اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں شامل ہونے کے اور نام ونہاد نیشلسٹ پارٹی کے (جو دراصل ہندو مہا سبھا پارٹی ہے) صدر ہونے کے کانگریس کی مجلس عاملہ کا دو سال سے ایک عضو ہیں اور آج مہاتما جی کے مشیر خاص ہیں تو مجھ کو حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے اور کبھی کبھی آنکھوں سے دو چار آنسو بھی نکل پڑتے ہیں"[1]

ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں کی حرکات کو دبانے میں مولانا محمد علی اسقدر دیوانہ وار سرگرم تھے کہ یونٹی کانفرنس منعقدہ دہلی میں آپ نے یہانتک فرما دیا تھا :۔

"اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے جب بھی میں اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا، میری ماں کو قتل کرے تب بھی میں عدالت میں مقدمہ نہیں لیجاؤنگا

---

[1] ہمدرد ۱۹۲۹ء۔

لیکن اب اس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہیئے۔ ذرا ذراسی بات پر ہم کو چاہیئے کہ تلواریں میان سے نہ نکال لیا کریں ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے ؏

دہلی کی ملتوی شدہ یونٹی کانفرنس جب شملہ میں ہوئی تو مولانا محمد علی نے اسقدر جان توڑ کوشش کی اور اسقدر منہمک رہے کہ آپ کا حقیقی بھتیجا شاید آپ کے دیدار کیلئے بے چین رہا مگر اُس بدنصیب چچا کو اسقدر فرصت نہ مل سکی کہ اُس کے جنازہ تک میں شرکت کر لیتا۔ مگر بدقسمتی سے ہندو لیڈروں کی طرف سے ایسی عدم توجہی سے کام لیا گیا کہ سب کانفرنسیں بیکار رہوئیں۔ اگر مولانا محمد علی کی طرح کانگریس کے ہندو رہنما بھی مصالحت و مفاہمت میں اسی فراخدلی سے کوشش کرتے تو ہندوستان اتنا بدنصیب کیوں رہتا؟۔

مسلم لیگ نے متواتر تین اجلاس منعقدہ ۱۹۲۴، ۲۵، ۲۶ء میں آئینی تجاویز ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے پاس کیں اور کانگریس سے برابر مفاہمت کی درخواست کی مگر ان سب کا حشر وہی ہوا اور آخرکار ۱۹۲۷ء میں سری نواس آئنگر اور مولانا محمد علی کی کلکتہ اتحاد کانفرنس اور مدراس کانگریس میں سب کوششیں اسی طرح بیکار ثابت ہوئیں۔

باب سیزدہم

مسلم تجاویز دہلی، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ

مسلم لیگ اور کانگریس کا عارضی اشتراک عمل

تجاویز دہلی مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے ارکان کانگریس کی ہندو مہا سبھائیانہ ذہنیت اور ہندو مسلم مفاہمت سے بالکل مایوس ہو کر بھی خاموش نہیں بیٹھے بلکہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں ممبران اسمبلی اور دوسرے مسلم اکابرین پر مشتمل ایک مسلمانوں کا اہم جلسہ مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ کانگریس اور ہندو مہا سبھا اس زمانے میں اس بات پر بہت اڑے ہوئے تھے کہ ہندوستان کا آئینی دستور اساسی مخلوط انتخاب پر مبنی ہو۔ مسلم زعما ہندو مسلم اتحاد پر اسقدر کمر بستہ تھے کہ انھوں نے چند شرائط کے ساتھ جنکو "تجاویز دہلی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مخلوط انتخاب کو بہ تحفظ نشست منظور کر لیا۔ شرائط میں صوبہ سندھ کی علیحدگی صوبہ سرحد میں جدید اصلاحات کا نفاذ، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کا قائم رکھنا، مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلم نیابت کا کم از کم تہائی ہونا وغیرہ تھے ہندو مہا سبھا نے ۲۱ مارچ ہی کو سر ہری سنگھ گور کی صدارت میں ان تجاویز میں سے صرف مخلوط انتخاب کو منظور کر لیا اور باقی شرائط کو رد کر دیا۔

مئی ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان تجاویز کو منظور کر لیا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگریس نے ان تجاویز کو منظور کیا مگر کچھ ترمیمات کے ساتھ اُس زمانے میں قوم پرور مسلم طبقہ نے اُن تجاویز کو پاس کر کے اپنی فراخدلی کا ثبوت دیدیا لیکن اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اسکو اپنی فتح قرار دیا اور آئندہ بڑی مشکلات کا سامنا ہوا۔ آج گیارہ سال بعد جو رسلے قائم کیجاتی ہے اس زمانے میں علامہ اقبال نے اُس رسلے کا اظہار کیا تھا اور مخلوط انتخاب کو مسلمانوں کیلئے ہر صورت میں نقصان دہ بتایا تھا۔ اور اس معاملہ میں اسی لئے علامہ مرحوم نے مسٹر جناح کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ میاں محمد شفیع مرحوم کا ساتھ دیا تھا۔ ایک سال بعد پھر مسٹر جناح ہی کو محسوس ہوا کہ مخلوط انتخاب کے مطالبہ پر سر تسلیم خم کر دینا غلطی تھی۔ لیکن غضب یہ تھا کہ کانگریس نے باوجود آل انڈیا کمیٹی میں پاس کر لینے کے اسکی سخت مخالفت کی۔ علیگڈھ پراونشل کانگریس کے اجلاس میں جس مہا سبھائیانہ ذہنیت کا اظہار کیا گیا اُسکا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے۔

اس موقع پر مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"حقیقتاً یہ مچلکے اور یہ ضمانتیں جو آج ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں وہ مچلکے اور ضمانتیں نہیں ہیں جو ہمارے اجنبی حکمران ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں بلکہ یہ وہی مچلکے اور ضمانتیں ہیں جس کی طرف ہر سچے مذہب کے اس سنہرے قاعدہ نے اشارہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمھارے ساتھ کریں"

اس زمانے میں حالانکہ محمد علی ہو چکے کانگریسی سے تھے مگر حق گوئی کے موقع پر وہ کبھی خاموش نہیں رہے اُن کا مسلک اُن قوم پرور لیڈروں سے بالکل مختلف ہے جو کانگریس کی

ہر مسلم آزار پالیسی پر "ابوالسکوت" بنکر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ نے "دہلی تجاویز" کی تائید میں ایک جگہ تقریر میں فرمایا :-

"یقیناً ہندو جاتی سارے عالم میں اپنی تنگ نظری میں نمایاں ہے دنیا بھر میں کسی ملت نے خود اس تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ خود اپنے ہی فرقوں کو اچھوت سمجھا ہو کہ صدیوں سے سب ہنود نہ ایک دوسرے کو بیٹی دے سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ سب ہنود ایک مندر تک میں یکجا نہیں ہو سکتے نہ سب جگہ سب کے لئے عام سڑکیں ہی کھلی ہوئی ہیں۔ جو جاتی اس درجہ خود غرضی کا شکار ہو اس پر دوسری ملتیں کس طرح اعتماد کر سکتی ہیں۔ جداگانہ حلقۂ انتخاب اسقدر فرقہ بندی کا سبب نہیں بنے ہیں جسقدر کہ ہنود کی فرقہ بندی اسکا سبب بنی۔"

جب برادران وطن "اکثریت کے راج" پر بضد مصر ہوئے اور مسلمانوں کے علحدہ وجود کو تسلیم کرنے سے بالکل ہی منکر ہونے لگے تو آپ نے ایک مضمون میں تحریر فرمایا:-

"اب تک ہندوستان میں اکثریت کی حکومت نہیں ہوئی نہ اشوکا کے وقت میں نہ بکرماجیت کے عہد میں نہ محمود غزنوی کے عہد میں نہ غوری کے دور میں نہ پرتھی راج کی سلطنت اکثریت کی سلطنت تھی نہ اکبر کی نہ اورنگ زیب کی نہ سیواجی کی نہ رنجیت سنگھ کی نہ آج لارڈ اروِن کی ہے۔ آج پہلی بار وہ دستور اساسی بن رہا ہے جس پر نہ سرٹیفکیشن کا اختیار کسی کو ہوگا نہ ویٹو کا بلکہ ہر فیصلہ اکثریت کے موافق ہوگا پھر اسی بدعت حسنہ کی ابتدا کے وقت اگر ایک جاتی جسے برطانوی ہند میں بھی ۶۶ فیصدی کی اکثریت حاصل ہے

اس دستورِ اساسی پر پوری پوری طرح مطمئن ہو، لیکن ایک اور ملت جو باوجود اسکے بھی حقیر تر اقلیت میں ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کر چکی ہو اور ۲۵ فیصدی کی اقلیت میں ہوا سپر پوری طرح مطمئن نہو تو تعجب کی کونسی بات ہے؟"

پھر ۲ اپریل ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں اسی بحث پر ایک زبردست مضمون آپ نے لکھا جسکا ایک مختصر اقتباس مندرجہ ذیل ہے:۔

"جتنی مقبولیت دہلی کی تجاویز کو اور جماعتوں میں حاصل ہو گئی ہے اُسکو نظر انداز کرنا ہی حماقت سے کم نہیں ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ پورے سال بھر کی ان تھک کوششوں کے بعد بھی صرف اسقدر کامیابی کے حصول پر میرا دل کتنا کڑھتا ہے اور خدا شاہد ہے کہ میری صحت کی خرابی ایک بڑی حد تک ان ہی افکار کا نتیجہ ہے جو دن کے چین اور رات کی نیند حرام کئے ہوئے ہیں جنھوں نے بارہا میرے بستر کے تکیہ کو اشک آلود کر دیا ہے لیکن جب خیال کرتا ہوں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کتنی صدیوں تک الگ تھلگ رہے ہیں کب سے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں تو موجودہ حالت کو بھی ناکامی و نامرادی نہیں کہا جا سکتا. . ."

پھر اُسی موضوع پر ۱۰ اپریل ۱۹۲۸ء کے ہمدرد میں رقم طراز ہیں :۔

"وہ اقلیت جو محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور غوری کے حملوں کے وقت، لودی، سوری اور مغل خاندان کے وقت بھی اقلیت میں تھی اور آجکل کی اقلیت کے مقابلہ میں کہیں حقیر تر اقلیت میں تھی وہ یقیناً اسکو نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کیوں انہی ہندوؤں کی اکثریت سے مغلوب ہو کر رہے جن کی اکثریت پر وہ صدیوں حکمراں رہ چکی تھی۔ اسکا ہاتھ کسی امر میں رسالے دینے کیلئے نہیں اُٹھا کرتا تھا

بلکہ جب وہ ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے اُس ہاتھ میں ایک تیغ خارا شگاف ہوا
کرتا تھا جس سے سر کاٹے جاتے تھے یہ سروں کا گننا اُسکی سمجھ میں نہیں
آسکتا تھا وہ مردم شناسی کو سمجھتی تھی لیکن اس مردم شماری کو وہ آسانی سے
نہیں سمجھ سکتی تھی اسلیے اسنے اس نئے دور مردم شماری میں اپنی سیاسی بے وقعتی کو
سیاسی اہمیت کا حکومت سے لقب دلوایا۔ یقیناً انگریز مسلمانان ہند کے ساتھ
سخت ناانصافی کرتے اگر وہ اکثریت کو حکومت سپرد کردیتے اور اکثریت آبادی
کے لحاظ سے ہنود کی ہوتی اور ہنود وہی ذہنیت رکھتے تھے جو سنہ [illegible] میں اکثر
ہنود کی ذہنیت تھی اور آج بھی بہت سے نیتاؤں کی ہے جو ہندو مہاسبھا کے
نیتا ولایت گئے رہتے انھوں نے برطانوی سیاسین خصوصاً لیبر پارٹی کے
لیڈروں پر اپنا جادو چلانا شروع کیا اور اب مسلمانوں کیلیے بظاہر صرف
دو چیزیں تھیں یا انگریزوں کی غلامی کو قبول کیا جائے یا ہنود کی غلامی کو۔
اور جو تجربہ انگریزوں کی غلامی کا ہو چکا تھا اُس نے ہمیں اس کے خیال سے
بھی اب سخت بیزار کردیا تھا لیکن جو تجربہ ہنود کی ذہنیت کا اس بیزاری کے
بعد بھی ہوا تھا وہ ہمیں ہنود کی غلامی سے بیزار کرچکا تھا۔ یہ حالت تھی جبکہ
۴ یا ۵ ہزار مسلمان مختلف الخیال ۲۰ مارچ سنہ [illegible] کو دہلی میں ویسٹرن ہوسٹل
میں مجتمع ہوگئے اور جبکہ دن کے دس بجے سے لیکر شام کے چھ بجے تک
کوئی چیز ایسی نظر نہ آئی جہاں دونوں غلامیوں سے مسلمانوں کو نجات ملتی
لیکن الحمدللہ خدا نے ہماری دعا قبول فرماکے ہمیں وہ تجاویز سمجھا دیں جنہیں
اگرچہ بظاہر ایک بھی نئی چیز نہیں ہے لیکن جو کیفیت مجموعی اس سے پہلے

کسی کے سامنے نہ تھیں اور جن کا انشاء اللہ یہ نتیجہ ہوگا کہ انگریزوں کی غلامی
سے سارے ہندوستان کو نجات ملیگی اور اُس کے بدلے نہ مسلمان ہندؤں
کی غلامی میں آئیں گے اور نہ ہندو مسلمانوں کی غلامی میں۔"

سائمن کمیشن کی آمد

ہندوستان کے باہمی فساد سے انگلستان کے مدبرین نے
فطری طور سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ ۱۹۲۶ء میں لارڈ برکنہیڈ نے بہت توہین آمیز
تقریر دارالعوام میں کی تھی اور لارڈ اِرون نے کئی مرتبہ امن قائم کرنے کی اپیل شائع
کی اور یہ اچھی طرح سے ظاہر ہوگیا کہ ان دونوں قوتوں کے درمیان امن قائم
رکھنے کیلئے ایک تیسری طاقت کی ضرورت ہے اسلئے لیبر گورنمنٹ نے اصلاحات
مانٹفورڈ کے دس سال بعد ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن کا تقرر اسلئے کیا کہ وہ ہندوستان
میں چلکر یہ دیکھے کہ گذشتہ اصلاحات کو ہندوستانیوں نے کتنا کامیاب بنایا اور
آئندہ دستور اساسی کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ اس کمیشن کی سب طبقوں نے
ملکر مخالفت کی مسلم لیگ نے بھی ۱۹۲۷ء کے اجلاس کلکتہ میں اسکے مکمل بائیکاٹ
کی تجویز پاس کی۔ اس کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلہ میں اور تجاویز دہلی کی منظوری
کانگریس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں ایک عارضی اشتراک عمل کی صورت
نکل آئی۔ مدراس کانگریس میں جب کانگریس نے دہلی تجاویز کو منظور کیا اور
مالوی جی نے موافقت میں تقریر کی تو مولانا محمد علی پھولے نہ سماتے تھے انھوں
نے اپنی تقریر میں فرمایا:-

"آخری[1] بات جس کو خاص طور سے کہنے کیلئے میں اسوقت یہاں آکر کھڑا

۱؎ ہمدرد ۱۳ جنوری [illegible]

چاہوں یہ ہے کہ مجھے آج ایک عجیب و غریب تقریر سننے کا موقع ملا ہے
۔ اس سے میری مراد پنڈت مالوی جی کی تقریر ہے اس تقریر کے سننے سے
مجھے وہ واقعہ یاد آتا تھا جو اسوقت مصر میں پیش آیا تھا جب برطانوی حکومت
نے ملک مصر میں لارڈ ملز کمیشن بھیجکر فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنے کی کوشش
کی تھی لیکن اُسمیں ناکامی ہوئی تھی اور اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں
نے جن کی وہاں ۹۵ فیصدی آبادی ہے وہاں کی عیسائی آبادی قبیلوں کے
ساتھ ایسا سلوک اور ایسا برتاؤ کیا تھا کہ جب لارڈ ملز اور اُن کے رفقا کسی
عیسائی کے پاس جاتے اور اُس سے سوال کرتے تو وہ صاف کہدیتا "میں
تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا جو کچھ پوچھنا ہے سعد زغلول پاشا سے
پوچھ لو، تم میرا نام پوچھتے ہو، میں اپنا نام بھی نہیں جانتا میرا نام بھی وہ
بتائے گا" اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ اگر پنڈت مالوی جی اپنی اس عجیب و
غریب تقریر کی سپرٹ میں عمل بھی کریں جو انھوں نے آج فرمائی ہے تو جب
اول ونسٹرٹن یہ فرمائیں کہ ہم اقلیتوں کے امین ہیں تو میں اُن سے صاف
کہونگا کہ تم جھوٹ کہتے ہو اقلیتوں کے حقوق کے امین پنڈت مالویہ ہیں مجھے
صرف اسقدر کہنا ہے میں پنڈت مالویہ پر اعتماد کرنے کا عہد کرتا ہوں اور
مجھے اسکا یقین ہے کہ وہ دھوکہ نہیں دینگے"

مگر افسوس پنڈت جی اور دوسرے زعمار کانگریس نے ایک سال بھی نہیں گذرنے
دیا اور ایسا دھوکہ دیا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔
بہرحال جب ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کمیشن ہندوستان میں داخل ہوا تو ہندوستان بھر

میں جہاں کہیں وہ گیا اُسکا مقاطعہ کیا گیا۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں سے من حیث الجماعت اسکا مقاطعہ کرایا باوجودیکہ شفیع لیگ کا ایک حصہ کمیشن کی موافقت میں تھا اسلئے کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت سے بالکل مایوس تھے مگر مسٹر جناح اور محمد علیؒ نے تمام مسلمانوں کو اپنا ہم آواز بنا لیا اور ہندوؤں کی تمام ستم رانیوں کو درگذر کرکے رواداری اور تدبر کا بہترین ثبوت بہم پہونچایا۔ ایک مضمون میں مولانا نے کمیشن کے متعلق تحریر فرمایا :—

"حقیقتاً برٹش پارلیمنٹ کو نہ از روئے اخلاق ہماری قسمت کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیئے نہ وہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہے یہ جماعت ہندوستان کے متعلق محض جاہلوں کی ایک جماعت ہے۔ ان تقریباً سات سو (ممبران پارلیمنٹ) برطانیوں میں سے ستر بھی مشکل سے نکلیں گے جو ہندوستان کے متعلق کچھ بھی جانتے ہونگے "

ایک تقریر میں مولانا نے فرمایا :—

"اس طرح کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق تفویض نہیں کر سکتی جرمن اگر زیادہ منظم ہوں تو کیا انگریز اپنے ملک کو جرمنوں کے انتظام اور فرمانروائی کیلئے سپرد کر دینگے میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں انگریزوں کے ہاتھ سے حکومت و فرمانروائی کو چھین لینے کی قدرت نہیں رکھتا لیکن ہندوستان کے اندر برطانوی اغراض برطانوی حکومت کے لئے کوئی اخلاقی بنیاد تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں میں ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے دیباچہ ہی کو

سلہ [illegible] جب کمیشن آنے والا ہی تھا۔

نہیں مانتا میرا تو جوری سے کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے۔ اگر کمیشن کے ارکان
تمام تر ہندوستانی ہی ہوتے تب بھی میرا اعتراض باقی رہتا۔ ہندوستان کے
متعلق اگر پارلیمنٹ کے سات سو ممبران میٹرکولیشن امتحان کا کوئی پرچہ حل
کرایا جائیگا تو ان سات سو میں سے ستر بھی اس امتحان کو پاس نہیں کر سکیں گے
(قہقہہ) اور یہ وہ لوگ ہونگے جو ہندوستان کی نمک حلالی نہیں کرینگے۔"

مسٹر محمد علی جناح نے اس کمیشن کی مخالفت میں بیحد کوششیں کیں ہندوستان بھر
میں جتنی مخالفتیں دونوں محمد علیین نے کیں اتنی کسی نے نہیں کی۔ مسٹر جناح نے
ایک تقریر کے دوران میں کہا:۔

"برطانیہ عظمیٰ کے خلاف آئینی جنگ کا اعلان کر دیا گیا ہے تصفیہ کے لئے
گفت و شنید ہماری اپنی جانب سے نہیں شروع ہوگی حکومت چاہے تو صلح
کی درخواست کرے ہیں حق شرکت سے محروم کیا گیا ہے ہم اس جدید اصول
کا اپنے مقدور بھر مقابلہ کرینگے۔ جلیانوالہ باغ میں تو جسمانی طور سے ہماری
خونریزی کی گئی تھی اور سائمن کمیشن ہماری روحوں کی قتل و خونریزی کا
باعث ہے خالصًا سفید رنگ کے لوگوں کا کمیشن مقرر کر کے لارڈ برکنہیڈ نے
حکومت خود اختیاری کے لئے ہماری نا قابلیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے
میں اس جلسہ میں پنڈت مالویہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور میل ملاپ کے
اس ہاتھ کا خیر مقدم کرتا ہوں جو کانگریس اور ہندو مہاسبھائی پلیٹ فارموں
سے ہندو رہنماؤں نے ہماری طرف بڑھایا ہے۔ میرے نزدیک تو ہندو
بھائیوں کا یہ اقدام ان تمام اعلانات سے کہیں زیادہ قیمتی ہے جو حکومت کر سکتی ہے

لہذا ہمیں دوستی اور میل ملاپ کے اس ہاتھ کو پکڑ لینا چاہیئے یہ حقیقت میں نہایت مبارک دن ہے اور اس اتفاق کیلئے ہمارے شکریے کیلئے لارڈ برکن ہیڈ مستحق ہیں۔"

جناح ہال ۹ ستمبر کو بمبئی میں جناح ہال کا افتتاح ہوا یہ ہال مسٹر جناح کی قومی خدمات کے صلہ میں پبلک کی طرف سے بنایا گیا تھا ۱۹۱۸ء میں جب لارڈ ولنگڈن گورنر بمبئی وہاں سے رخصت ہو کر جارہے تھے تو عوام کی طرف سے ایک ایڈریس دیے جانے کی تجویز تھی مگر مسٹر جناح نے سخت مخالفت کی تھی جسپر بہت ہنگامہ ہوا تھا تمام شہر کے باشندوں کی جب رائے لیگئی تو کامیابی مسٹر جناح ہی کی ہوئی۔ اسی سال جناح ہال فنڈ کی بنیاد ڈالی گئی تھی جسکی تکمیل ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ اس ہندو مسلم مناقشات کے زمانے میں مسٹر جناح کی محبوب شخصیت کا پتہ مسٹر نیڈو کے ان الفاظ سے چلتا ہے جو انھوں نے افتتاح ہال کے وقت فرمائے تھے:-

"جناح ہندو مسلم اتحاد کا قاصد ہے اور ایک ایسی خوش نصیب شخصیت ہے جسکے ہموطنوں نے اپنے وطن اور اسکی عین حیات ہی میں قدر کی ہے۔"

ڈاکٹر اینی بسنٹ نے کہا تھا:-

"جناح جیسی شخصیتیں بنی نوع انسان کی آزادی کے گلے کا ہار ہیں جنکی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔"

بیشک دس سال بعد اب وہی زبانیں جناح کی مخالفت میں مصروف ہیں جو کبھی اسکی قصیدہ خوانی میں مصروف رہتی تھیں اسلئے کہ اب وہ ہندوؤں کے

۱ہ ہمدرد ۱۱ ستمبر ۱۹۲۸ء صفحہ ۔

طرزِ عمل سے مایوس ہو کر مسلمانوں کو انکے چنگل سے رہا کرنا چاہتے ہیں اسی تصور کی بنا پر محمد علی مرحوم کو گالیاں سننا پڑی تھیں۔

باب چہاردہم

نہرو رپورٹ اور کانگریس کے منصوبے

کانگریس اپنی اصلی شکل میں

مئی ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کا ملتوی شدہ اجلاس بمبئی میں کیا گیا اُسمیں لارڈ برکن ہیڈ کو چیلنج دینے اور ہندوستان کیلئے ایک دستورِ اساسی بنانے کیلئے ایک کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں بٹھائی گئی جو نہرو کمیٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔ مولانا محمد علی بغرض علاج جون ۱۹۲۸ء میں یورپ تشریف لیگئے۔ ان کی غیر موجودگی کو غنیمت خیال کرکے نہرو کمیٹی نے نہرو رپورٹ شائع کردی اسکے شائع ہونے پر کانگریس کے چہرہ کا معمولی سا نقاب بھی اُتر گیا اور وہ اپنی اصلی شکل میں نمودار ہو گئی۔

نہرو رپورٹ کا مقصد | اس رپورٹ میں کانگریس کی پوری پوری ذہنیت نمودار ہو گئی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ وہ آزادی چاہتی ہے اور نہ اُسے مسلمانوں سے اتحاد کی ہمدردی ہے۔ کانگریس زیر سایہ برطانیہ اکثریت کا راج چاہتی ہے اور انگریزوں سے پہلے مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔

(١) اسکی روسے نصب العین مکمل آزادی نہیں بلکہ زیر سایہ تاج برطانیہ حکومت خود اختیاری قرار پایا۔

(۲) یہ نصب العین بھی محض بطور آئیڈیل مقرر کیا گیا ورنہ اسوقت تو معاملات خارجی، مدافعت، فوج وغیرہ سب پارلیمنٹ اور وائسرائے کے ماتحت تسلیم کر لیے گئے۔

(۳) طرز حکومت وحدانی (مرکزی) مقرر کیا گیا برخلاف فیڈرل اسکیم کے جس سے مسلم اکثریت کے صوبے بھی ہندو مرکزی اکثریت کے ماتحت آ جائیں اور صوبے کی خود مختاری کا خواب بالکل ختم ہو جائے۔

(۴) انگریزی تجارت کو دوسری قوموں کی تجارتوں کے مقابلہ میں گارنٹی دی گئی۔

(۵) سندھ کی علیحدگی کو ہندو مہا سبھا کی شرط کے موافق مشروط کر دیا کہ اگر وہ اپنا بوجھ اخراجات کا خود اُٹھا سکے اور ابتدائی مدد کوئی حکومت سے نہ لے تو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

(۶) جداگانہ انتخاب کو ختم کر کے مخلوط انتخاب بلا تعین نشست مقرر کیا۔

(۷) ۱۹۱۶ء کے میثاق کو جو لیگ اور کانگریس کے مابین ہوا تھا اُس کو کالعدم کر دیا گیا اور اُسکے ذریعہ جو مسلمانوں کو اقلیت کے صوبوں میں پاسنگ دیا گیا تھا اسکو بھی منسوخ کر دیا۔

یہ تھی نہرو رپورٹ کی اصلی شکل جسکی روسے فوجی حاکم اور ملک کے مالک سرکار برطانیہ تسلیم کی گئی اور اندرونی نظام کے حاکم سرکار مہا سبھا، گویا برطانوی سنگینوں کے سایہ میں ہندو راج یا اینگلو ہندو راج کی یہ بہترین اسکیم تھی جسکے متعلق مولانا محمد علی نے بالکل صحیح فرمایا تھا:-

"جسطرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں پکارنے والے منادی راستوں میں اسطرح پکارتے تھے کہ "خلق خدا کی ملک ملکہ کا حکم کمپنی بہادر کا" اسی طرح نہرو رپورٹ کے تجویز کردہ دور میں منادی پکاریں گے کہ "خلق خدا کی ملک انگریز کا اور حکم مہاسبھا بہادر کا"

رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلی آواز جو مخالفت میں بلند ہوئی وہ مولانا حسرت موہانی کی تھی۔ ۲۰ اگست کو آپ نے اخبار کے نمائندے کو ایک مفصل مندرجہ ذیل بیان اس رپورٹ پر دیا۔

"میں مکمل آزادی کی حمایت کرتا ہوں اسلئے ان سفارشات کی تائید نہیں کر سکتا ہوں جنمیں نوآبادیات کا درجہ قبول کیا گیا ہو۔ میرا خیال ہے کہ آئین مرتب کرنے کے معنی لارڈ برکن ہیڈ کی چالاکیوں کی فتح ہے۔ کیونکہ وہ اس بات پر اسلئے زور دے رہے تھے کہ ہندوستان کے لیڈر سلطنت برطانیہ سے تعلق رکھنے کا اعلان کر دیں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں مکمل طور پر آزاد صوبوں کی ایک وفاقی حکومت قائم کی جائے۔ مرکزی حکومت صرف انھیں باتوں پر اختیار رکھے جو صوبوں کو حاصل ہوں مثلاً مواصلات فوج اور معاملات خارجیہ وغیرہ ہندوستان کی ریاستیں وفاقی حکومت میں اپنے نمائندے بہت جلد اور آسانی سے بھیجدینگی اور اُن کو اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کا خدشہ ہوگا جب تک ملک میں سیاسی پارٹیاں نہ بنیں اور وہ مضبوط نہ ہوجائیں جداگانہ طریق انتخاب اور نمائندگی کے تناسب کو ہٹانا ٹھیک نہیں ہے یہ رہنے چاہییں۔ مشترکہ طریق انتخاب کے ذریعہ مسلمان

منتخب ہونگے اُن پر مسلمانوں کا اسی طرح اعتبار ہوگا جس طرح سرکاری نامزد کردہ ممبروں پر کوئی اعتبار نہیں کرتا خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔"

ہندوستان کے ہر طبقہ کے ہندو مع مہاسبھا اور کانگریس اس رپورٹ کے حامی بنے ہوئے تھے۔ مہاتما گاندھی اسکی منظوری پر مصر اور ہندو مہاسبھا دسمبر ۱۹۲۸ء میں مسٹر کیلکر کی صدارت میں باضابطہ اعلان کر چکی تھی کہ "اگر مسلمانوں کے کہنے سے اسمیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ اور ایک کومے کی بھی ترمیم کیگئی تو ہندو مہاسبھا سختی سے اسکی مخالفت کریگی" مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں خود قوم پرور طبقوں میں دو پارٹیاں ہوگئی تھیں۔ مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی صاحبان مع پارٹی کے اس رپورٹ کو مسلمانوں کیلئے سم قاتل سمجھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مع پارٹی کے اس رپورٹ کے حامی تھے جمعیۃ العلما بھی رپورٹ کی مخالف تھی ۲۸ ر ۲۹ر اور ۳۰ر اگست ۱۹۲۸ء کو بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں اسکو پاس کرنے کیلئے کانفرنس کیگئی اس کانفرنس میں بعض مسلمانوں کی خاموشی اور کانگریس کے لیڈروں کی مسلمانوں کی طرف سے قطعی عدم توجہی بالکل نمایاں تھی اسکا نقشہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے مخصوص انداز میں کھینچا ہے جس سے اصل حقیقت بالکل سامنے آجاتی ہے چونکہ اسمیں کافی عبرت پنہاں ہے اسلئے اسکا ایک اہم اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"رپورٹ لکھی آنند بھون میں گئی، منظور قیصر باغ اور بٹلر پیلس کی سفید بارہ دری میں کرائی گئی۔ الہ آباد اور لکھنؤ میں رقابت ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی آج

سلہ ۲۸ و ۲۹ و ۳۰ر اگست ۱۹۲۸ء

آخر ندوہ اور بطلر پالیس میں صلح ہو چکی تھی اور لکھنؤ کی ارسٹوکریسی (امارت) اور الہ آباد کی اوٹوکریسی (قیادت) رشتہ محبت و موالات جوڑ چکی تھی۔ ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام پہلے سے اپنائے جا چکے تھے مسلمانوں سے جو کچھ کام لیا جانے والا تھا انہیں کے ذریعہ سے لیا جا سکتا تھا۔ تحت جان خلافت کمیٹی کے فولاد کو موم بنانے کی ذمہ داری انہیں کے سپرد ہو چکی تھی اور ان کی امداد و اعانت پر یو۔ پی کے پرجوش اور جوان عمر مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا دستہ مقرر تھا۔ ٹرکی کے انور کے مقابلہ کیلئے ایک ناظم پاشا تیار کر لیا گیا تھا یہاں ہندوستان کے انور کے مقابلہ میں شعیب قریشی جو اس کمیٹی کے ایک ممبر تھے چھوٹے بڑے خدا معلوم کتنے ناظم پاشا تیار تھے اس انتظام کے بعد پورا اطمینان تھا اور اب اسکی ضرورت کیا باقی تھی کہ عام مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جاتا اور جو سات کروڑ بندگان خدا کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جانیوالا تھا ان کی خواہشوں کی پروا کی جاتی، جلسہ اپنا تھا، مقررین اپنے تھے، ووٹ اپنے تھے، خلافت کمیٹی کے صدر اور سکریٹری مولوی شفیع داؤدی اور مولانا شوکت علی جمعیۃ العلماء کے صدر اور سکریٹری مفتی کفایت اللہ صاحب و احمد سعید صاحب مسلم لیگ کے صدر محمد یعقوب مرادآبادی شعیب قریشی اور حضرت مولانا حسین احمد آئے اور اس بزم میں مالویہ جی اور موتی لال جی کی طرح "مختار" بنکر نہیں بلکہ الگ مثل گنہگاروں کی طرح بیٹھ گئے۔ ؎

غیر اس بزم میں مختار بنے بیٹھے ہیں ۔۔۔ ہم الگ چور گنہگار بنے بیٹھے ہیں

مسلمانوں کی نگاہیں حسرت و یاس کے ساتھ بار بار محمد علی کو ڈھونڈھ رہی تھیں

اور ان کی نظروں میں ہملٹ کا تماشہ بغیر ہملٹ کے پارٹ کے شروع ہونے کو تھا بہر حال پردہ اُٹھا اور جلسہ شروع ہو گیا...

ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کیا ملک و ملت کا مفاد وہ یقیناً اسی میں سمجھتے ہوں گے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی بھی آزادی اور آزادہ روی کا "ہلال" اسی قیصر باغ کی بارہ دری کے اول بار آج سولھواں سال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کے جلسہ میں طلوع ہوا تھا۔ آسمان کا "ہلال" بدر کامل بنکر مہینہ کی سولھویں تاریخ سے بہت قبل گھٹنے لگتا ہے پھر اگر زمین کا یہ "ہلال آزادی" جس عمارت سے طلوع ہوا تھا سولھویں برس اُسی میں غروب ہوتے ہوئے دیکھا گیا تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں ہے البتہ یہ واقعہ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس میں ان دونوں بزرگوں کی میانہ روی اعتدال پسندی اور نہ خلافت کمیٹی میں تصدق احمد خاں شروانی صاحب کا عضبہ جمہور مسلمین کو رپورٹ کے موافق اور ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ مولانا حسین احمد صاحب شروع ہی سے رپورٹ سے بدظن تھے۔ صدر جمعیۃ العلماء اپنی کوششوں کو بے نتیجہ پاکر بددل ہوکر ختم جلسہ سے پہلے ہی چلے گئے۔ مولوی شوکت علی کے بیان کا استقبال چڑھے ہوئے تیوروں اور غضب آلود نگاہوں سے کیا گیا۔ رہے شعیب اس غریب کا دل جسطرح دکھایا گیا اور اُسے جسطرح خون کے گھونٹ پی پی کر رہنا پڑا اس داستان درد کیلئے ایک مستقل صحبت کی ضرورت ہے۔

بہرحال رپورٹ کانفرنس میں پاس کردی گئی اور مخالف آوازوں کو ہنس کر ٹالدیا گیا مولانا محمد علی ابتک یورپ میں تھے مسلمان منتظر تھے کہ کب محمد علی آئیں اور صحیح

رہنمائی کریں اس زمانہ میں ہر جگہ ان کی کمی محسوس کی جا رہی تھی سے
یہ حالت ہو گئی ہو ایک ساقی کے نہ ہونے سے کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے
مولانا شوکت علی پوری شد و مد کے ساتھ اسکی مخالفت میں سرگرم تھے صوبجات متحدہ آل پارٹیز کانفرنس میں آپ نے ایک تقریر نہرو رپورٹ پر کی اور فرمایا۔

"مجھے یقین ہے کہ مجھ میں مرتے وقت بھی اتنی قوت ضرور باقی رہیگی کہ جو شخص مسلمانوں کو نظر حقارت سے دیکھے گا تو میں اپنی انگلیوں سے اسکی آنکھیں نکال لوں میں چاہتا ہوں کہ دنیا میں اسلام آزاد ہو، میں چاہتا ہوں کہ ہندو مسلمان صلح و آشتی کے ساتھ رہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرا وطن آزاد ہو، شوکت علی دنیا کی کسی طاقت سے خائف ہونے والا نہیں، میں حکومت انگریزی کو تسلیم نہیں کرتا، میں اپنا ضمیر ہندو لیڈروں کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا، میں ان گندم نما جو فروشوں کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتا جو پنڈت موتی لال کو لکھنؤ جیل میں بھجوا کر خود اسی گھر میں ہوم ممبری کی کرسی پر بیٹھیں۔"

مولانا محمد علی مرحوم جب ہندوستان تشریف لائے تو تمام ملک میں شور مچا ہوا تھا اور ہر شخص مولانا کی رائے معلوم کرنے کا خواہشمند تھا آپ نے اسکی مخالفت میں سب سے پہلی تقریر ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس پٹنہ میں ان الفاظ سے کی:

"ہندوؤں کو خوش کرنے کیلئے میں اپنے مذہبی معتقدات کو ترک نہیں کر سکتا ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں منادی کی جاتی تھی تو منادی کرنیوالا پکارتا تھا "خلق خدا کی، ملک ملکہ کا، حکم کمپنی بہادر کا" لیکن نہرو رپورٹ کا مقصد محض یہ ہے

سلہ ہمدرد ۳۰ر نومبر ۱۹۲۸ء سلہ ہمدرد ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۸ء

کو خلق خدا کی، ملک وایسرائے کا یا پارلیمنٹ کا ہے علم ہمارا بھسادر کا،
توار یہ مستثنیات" کو تسلیم کر لینے اور اُسمیں بھی مسلمانوں کے تحفظ حقوق سے انکار
کر دینے کے یہی معنی ہیں کہ ہم اس حالت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔
واضعان رپورٹ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق کسی قسم کی مفاہمت
ناممکن ہے کیونکہ اس قسم کے مطالبات فرقہ وارانہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن پنڈت
موتی لال نہرو نے سر سپرو، مہاراجہ محمود آباد اور سر علی امام سے مفاہمت کی
اور درپہ مستثنیات منظور کر لیا۔"

پھر اسکے بعد دسمبر ۱۹۲۸ء ہی میں مسلم کانفرنس بہار میں خطبۂ صدارت میں مولانا نے فرمایا[1]
"مجھ کو نہرو رپورٹ سے غرض نہیں وہ صحیح ہو یا غلط لیکن میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں اور آپ اچھی طرح سن لیں کہ میں انگریز کی حکومت کو پسند نہیں کرتا
میں ہرگز اس پر راضی نہیں کہ انگریز کا غلام ہوں یہ خلاف اسلام ہے پس جو
انگریز کی حمایت چاہتے ہیں وہ ضرور ہمارے خلاف ووٹ دیں میں نہ ہندو
راج چاہتا ہوں نہ مسلم راج بلکہ میں سوراج چاہتا ہوں، میں اسوقت شام،
فلسطین، ترکی اور عراق وغیرہ کو دیکھ کر آرہا ہوں، حجاز تو پہلے ہو آیا تھا
انمیں سے اکثر ممالک اب دوسروں کے قبضہ میں ہیں اگر آپ اسلام کو زندہ
رکھنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی ممالک اسلامی رہیں تو خدا کے لئے
ہندوستان کو جس کی بدولت وہ غلام بنائے گئے ہیں آزاد کرائیں۔"

اس تقریر سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ مولانا کو اس منحوس رپورٹ سے زیادہ تر

---

[1] ہمدرد ۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء۔

اسلئے شکایت تھی کہ وہ غلامی کو اور مضبوط بنارہی تھی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس ہوئے اور نہرو رپورٹ پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک کنونیشن بھی منعقد ہوا جسمیں ہر جماعت کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دیگئی۔ مولانا محمد علی کانگریس کے مربی ہونے کے باوجود اب اُسکی جہاں بھائی ذہنیت سے اسقدر تنگ آگئے تھے کہ انھوں نے اُسکے اجلاس میں شرکت بھی گوارا نہیں کی، لیکن کنونیشن میں خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلما کی طرف سے تنہا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے شرکت کی وہاں آپنے تقریر کی جسمیں صرف آزادی کے پہلو پر تقریر کی درمیان تقریر میں آپنے یہ کلمات بھی فرمائے کہ "جو لوگ آزادی کامل کے مخالف ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں" ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ کانگریس کے شیر دل گھبرا اُٹھے اور جو آج آزادی کے اجارہ دار ہونے کا دعوے کرتے ہیں آزادی کامل کے نام سے بھی گھبرا گئے اور اسقدر ہنگامہ کیا کہ مولانا کو سخت تکلیف دوران تقریر میں پہونچی آخرکار مولانا کی غیر موجودگی میں جبکہ وہ نماز مغرب کو تشریف لیگئے آزادی کامل کو مسترد کرکے درجہ مستعمرات پاس کر دیا گیا۔ اسکے بعد خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے آپنے ایک زبردست تقریر کی جسکا ایک اہم اقتباس مندرجہ ذیل ہے:۔

"میں اور میرے بعض دوستوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تھی
اسکے بعد میں چند دائرہ میں نظر بند تھا مجھے مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا اور
اور، دسمبر ۱۹۲۱ء میں میری اور مولانا شوکت علی کی رہائی کیلئے اسی کلکتہ
میں دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ تار ملک کے اطراف و اکناف سے پہونچ گئے۔

اُس زمانے میں میں نے ایک غزل کہی تھی اُسکا مقطع یہ تھا۔ ؎

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہرؔ لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

تو بھائیو سمجھ لو کہ میں یہاں بھی تمہیں خوش کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ میرا مقصد آپ کی خدمت اور اظہار کلمۃ الحق ہے۔ میرا بھروسہ نہ مسلم اکثریت پر ہے نہ ہندوستان کی اکثریت پر نہ دنیا کی اکثریت پر بلکہ میرا عقیدہ توحید پر مبنی ہے میں جو کچھ کہونگا اللہ کی خوشنودی کیلئے کہونگا، میں کنونشن میں ذاتی طور پر شرکت کیلئے گیا تھا وہاں میں نے اپنے نقطۂ خیال کو وضاحت سے بیان کر دیا لیکن میری تقریر کے دوران میں کیا ہوا مجھے قدم قدم پر روکا جاتا تھا میرا دامن کھینچا جاتا تھا (شرم شرم کی آوازیں) شرم! کس کی شرم! کیا وہ ہمارے بھائی نہیں ہیں اُن کی شرم ہماری شرم ہے اگر کوئی غیر ہوتا تو اُسکے لئے یہ الفاظ استعمال کر سکتے تھے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی عناصر یہاں شرم شرم کی آوازیں لگائیں[1]، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہاں کیا تھا کتنے لوگ ڈومین اسٹیٹس کے حامی تھے بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہاں تقدیر سے زیادہ امام تھے، آج جو طریقے نہرو رپورٹ کو زبردستی منوانے کے لئے روا رکھے جا رہے ہیں وہ بیحد مضر ہیں یہ طریقے ہندوستان کو آزادی تو نہیں دلا سکتے بلکہ ان اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو جائے گی۔

---

[1] آہ، یہ ہے وہ اخلاق اسلامی کہ دنیا دیوانی ہے آج لا رہے مگر ان کی نظروں میں سب بھائی ہیں کیا دنیا سے عبرت بالکل ختم ہو گئی کانگریس میں سے جانیوالے رہنما کیا بالکل غور نہیں کرتے کہ جب ایسی ہستی کی یہ بے قدری کی گئی تو ان کی کونسی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

کہا جاتا ہے کہ ہم اور چنتامنی وسر علی امام اور سرسپر داس رپورٹ کے ذریعہ ایک ہی نقطہ خیال پر متحد و متفق ہو جائیں گے لیکن اتحاد و اتفاق کے بدلے اتنی بڑی بے انصافی پھیل جائے گی جو سارے ملک میں کبھی نہ پھیلی تھی[1]"

کنونیشن مذکورہ بالا میں مسلم لیگ کے ساتھ بھی یہی حشر ہوا۔ مسٹر محمد علی جناح اور مرحوم مہاراجہ محمود آباد کانگریس کے ہمنوا اور نہرو رپورٹ کے حامی تھے لیکن کانگریس نے اپنے طرز عمل سے ان حضرات کو بھی مایوس کر دیا۔ مسٹر جناح نے کنونیشن میں نہرو رپورٹ کو کچھ ترمیمات کے ساتھ تسلیم کرنے کا اعلان کیا وہ ترمیمات دہلی تجاویز پر مبنی تھیں مگر کانگریس رام راج کے نشہ میں اسقدر سرشار تھی کہ کنونیشن میں کانگریسی حضرات نے مسلم لیگ کے مطالبوں کو بے توجہی سے ٹال دیا جس سے مسٹر جناح اور مہاراجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر چھاگلہ تک سب مایوس ہو گئے۔ کانگریس کی ذہنیت کا اب یہ حال تھا کہ کلکتہ کانگریس میں جب مجلس عاملہ کا انتخاب ہو رہا تھا تو مدراس کے ایک صاحب نے محمد علی مرحوم کا نام پیش کر دیا نام پیش کرتے ہی مخالفتوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ افسوس یہ وہی محمد علی تھے جن کا سینچا ہوا پودا اب پروان چڑھ کر نیشنل کانگریس کی بجائے ہندو کانگریس بن گیا۔ آخر کار یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو مسلمانوں نے ملکر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں سر آغا خاں کی صدارت میں منعقد کیا اسمیں تمام مسلمانوں نے ملکر متحدہ آواز سے مسلمانوں کے مطالبات مرتب کئے جو بعد میں چودہ نکات کے نام سے موسوم ہو گئے[2]۔ انکی تائید کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے فرمایا :-

---

[1] ہمدرد ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء [2] یہ چودہ نکات بہت مشہور ہیں۔

"ہندو ہم کو ایک مکھی کی حیثیت میں رکھنا چاہتے ہیں اور اُس مکھی کی حیثیت میں جو کھانے کے اوپر آکر بیٹھتی ہے اور خراب کر دیتی ہے، ہم مکھی بننا منظور کرتے ہیں لیکن شہد کی مکھی بننا چاہتے ہیں تاکہ شہد تیار کرکے ہندوؤں کو فائدہ پہونچائیں لیکن اسکے ساتھ ہی اگر کوئی ہمیں ستانا چاہے اور ہمارے چھتے کو چھیڑنا چاہے تو ڈنک سے مزہ چکھا دیا جائے گا۔"[1]

ان مطالبات کو مرتب کرنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۲۹ر مارچ ۱۹۲۹ء کو دہلی میں زیر صدارت مسٹر جناح منعقد ہوا جسمیں نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا گیا اور اُن چودہ نکات کو "مسلم لیگ کی بنیادی قرارداد" کے نام سے منظور کیا گیا۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد صاحب مع پارٹی کے آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے نہ اس اجلاس لیگ کونسل میں۔ انکے اس طرز عمل پر سب مسلمانوں کو حیرت تھی کہ وہی عظیم المرتبت انسان جو تحریک خلافت میں مسلمانوں کیلئے اپنے خون کے آخری قطرہ کو بھی بہانے کا مدعی تھا آج اہل ہنود کی تمام سختیوں اور مظالم کو برداشت کر رہا ہے اور پھر خاموشی نہیں ٹوٹتی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ان کی خاموشی کو "سُد داد بیمن" کے عنوان میں ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء کے ہمدرد میں اس طرح لکھا ہے:-

"پنڈت مالوی جی نے الہ آباد جاتے ہوئے کانپور سے ایک تار ہمارے نام بھیجا جسمیں ہم سے درخواست کی گئی کہ ہم سے علحدگی اختیار نہ کریں اور جو کچھ مسلمانوں کے مطالبات ہوں انکو پیش کریں۔ اسکا جواب انکو یہ دیا گیا کہ ہم کو جو کچھ کہنا

---

[1] ہمدرد ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ء

اور کرنا تھا وہ کر چکے اور کہہ چکے اب اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا
مقصود ہے تو غیر متعصب لیڈر اٹھیں اور متعصب ہندو کو سمجھا دیں۔ اس بار
بیچارے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے بھی دستخط ثبت تھے جو ہندو کی زیادتیوں
کے بارے میں عرصے سے دہن مبارک پر مہر سکوت لگا کر "ابوالکلام" کی جگہ
"ابوالسکوت" بنے بیٹھے ہیں اور جنھوں نے واللہ اعلم بالصواب بقول "ادیان"
آل پارٹیز کنونیشن کے تماشہ کے ختم ہونے پر فرمایا کہ "مسلمان احمق تھے کہ وہ کنونیشن
کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے آئے اور ہندو احمق تر تھے کہ انھوں
نے ایسے مطالبات کو قبول نہ کیا" جس کے یقیناً یہ معنی ہیں کہ مولانا ابوالکلام
آزاد عقلمند ترین شخص ہیں کہ بالکل خاموش رہے اور امام الہند بولے بھی تو
ایک مشہور لطیفے کے امام کی طرح جسکے سارے مقتدی نماز میں بول اٹھے
تھے اور جس نے بالآخر کہا تھا کہ "شکر خدا نہ من ولیدم"
دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس نے اس نہرو رپورٹ کو اس الٹی میٹم کے ساتھ پاس کیا
تھا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک حکومت ہند نے اسکو منظور نہیں کیا تو یکم جنوری
۱۹۳۰ء سے آزادی کامل کا اعلان کر دیا جائیگا اور تحریک عدم ادائگی لگان شروع
کر دیجائیگی لیکن حکومت نے اسپر غور کرنے کی پرواہ تک بھی نہ کی برخلاف اسکے
اسی سال آرڈیننس کا اجرا کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب جو اسوقت تک
کانگریس میں وفاداری بشرط استواری کے ساتھ موجود تھے زیر دفعہ ۱۲۴ گرفتار
کئے ہی جا چکے تھے آخر کار میعاد ختم ہونے سے ایک ہفتہ قبل گاندھی جی اور
کانگریس کے کئی نمائندے وائسرائے سے ملے اور اس بات کا یقین چاہا کہ اگر

گول میز کانفرنس میں شرکت کیگئی تو وہاں ڈومنین اسٹیٹس کے متعلق کچھ طے کیا جائے گا
لیکن وائسرائے نے ایسا کرنے سے گریز کیا اب کانگریس سخت پریشانی کی حالت میں
تھی "آزادی کامل" کا رزولیوشن پاس کرنا ہی کار مشکل تھا گاندھی جی اور مالوی جی ایسی
کسی تجویز کے موافق ہرگز نہ ہوسکتے تھے اسوقت تک کانگریس کی تمام دھمکیاں صرف
ان امیدوں پر مبنی تھیں جو اُن کو غلطی سے لارڈ ارون سے وابستہ ہوگئی تھیں لیکن
عین وقت پر معلوم ہوا کہ یہ سب چکنی چپڑی باتیں محض پھسلانے کیلئے تھیں اسلئے
مجبوراً اور طوعاً و کرہاً لاہور میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں آزادی کامل
کی تجویز پاس کیگئی مگر اسمیں چالاکی یہ کیگئی کہ آزادی کامل کے صاف اور واضح
الفاظ کے بجائے پورنیہ سوراج کے الفاظ اصل تجویز میں رکھے گئے اور بریکیٹ
میں انگریزی میں مکمل آزادی لکھدی جس سے ہمیشہ گاندھی جی اور کانگریس کو
یہ فائدہ رہا کہ جسطرح دل چاہا پورن سوراجیہ کے معنی پیدا کرلئے[1]۔ میعاد گذر جانے
اور اس رزولیوشن کے بعد نہرو رپورٹ خود بخود منسوخ ہوگئی اور مسلمانوں کے
خوش کرنے اور انکے سادہ لوح رہنماؤں کو جو ظاہری چمک سے ہی متاثر ہونے کے
عادی ہوگئے ہیں پھانسنے کیلئے اسکا اعلان بھی اس اجلاس میں کردیا گیا اسکے
اسکے بعد ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منایا گیا اور ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء سے سول نافرمانی
کا آغاز نمک سازی کے ذریعہ گاندھی جی کے ڈانڈی کے مشہور پیادہ سفر کے
بعد ہوا جسمیں اُنھوں نے اعلان فرمایا تھا کہ یا تو سوراج لیکر آؤنگا یا سمندر کی
موجوں میں ڈوب کر مر جاؤں گا[2]۔

---

[1] اسکو مفصل طور پر آئندہ صفحات میں آزادی کی بحث میں بیان کیا گیا ہے [2] اسکی صداقت اب ظاہر ہو رہی ہے

مسلمانوں کا طرز عمل | اس تمام تحاد آزادی جنگ میں مسلمانوں نے کانگریس کے ساتھ کوئی
اشتراک عمل نہیں کیا جن جماعتوں نے جنگ میں حصہ لیا وہ بھی اپنی علیحدہ جماعتی حیثیت
سے کانگریس پلیٹ فارم پر صرف چند مسلمان تھے اسکی وجہ یہ تھی کہ علی برادران
اسمیں شامل نہ تھے۔ علی برادران اس جنگ میں کیوں شامل ہوئے؟ کیا برٹش استعمار
سے انھوں نے کوئی سمجھوتہ کرلیا تھا؟ - یہ سوالات اور شکوک تھے جو کانگریسی پلیٹ
فارم سے ان مجاہدین حق کو بدنام کرنے کی غرض سے پیدا کئے جا رہے تھے لیکن
جن باخبر اصحاب نے ہندوستان کی سیاست کا ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک تحقیق اور
انصاف سے مطالعہ یا مشاہدہ کیا ہو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ کانگریس کا ساتھ اس
جنگ میں دینا حقیقت میں برطانیہ کے خلاف نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے ان مطالبات
کے خلاف تھی جو کلکتہ کنونشن میں ٹھکرائے جا چکے تھے حماقت سے کم نہ تھا کانگریس
کے ہر قدم سے یہ ظاہر ہو چکا تھا اور بالخصوص اس جنگ کی بنیاد تو محض انہیں
حالات پر رکھی گئی تھی کہ ایک طرف وہ مسلمانوں کو سیاسی جنگ سے بالکل ختم کر دینا
چاہتی تھی اور دوسری طرف انگریزوں کے سائے میں رہکر اکثریت کی حکومت حاصل
کرلینا اسکا مقصد تھا۔ مسلمانوں کے کسی طبقہ نے نہرو رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا تھا اور
وہ مسلمانوں کیلئے خودکشی کی مترادف قرار دیدی گئی تھی پھر اگر اسکو حکومت برطانیہ
کچھ ترمیمات کے ساتھ منظور کرلیتی تو مسلمانوں کی کیا پوزیشن رہتی اور انکی سیاسی
اہمیت کہاں باقی رہتی؟ لیکن جب اسکو حکومت نے منظور نہیں کیا اور صلح کا زمانہ
ختم ہو کر جنگ کا زمانہ آیا تو پھر مسلمانوں سے اشتراک عمل کی توقع کیوں؟ اسکا
تو صاف مطلب یہ تھا کہ خود مسلمان بھی اپنی قبر کو کھدوانے میں ہندوؤں کے ساتھ

شامل تھے اور جب وہ شکست کھا گئی تو دونوں ملکر (مقتول مسلمان اور گورکن کانگریس)
ایک ساتھ جنگ شروع کر دیتے دوسرے مسلمان اسقدر منتشر حالت میں تھے اور
سلسلہ میں انکا واحد سیاسی پلیٹ فارم ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ اسقدر بے راہروی
کے ساتھ گامزن تھے کہ انکو ایسی جنگ میں بغیر منظم کئے ہوئے شریک کرنا انکے
انتشار کو اور بڑھانا تھا علاوہ اسکے یہ جنگ آزادی کی جنگ ہرگز نہ تھی اگر
آخری لمحہ میں بھی وائسرائے ڈومنین اسٹیٹس کا یقین دلا دیتا تو جنگ کا نام بھی نہ لیا
جاتا اور اسکا پورا ثبوت گاندھی ارون پیکٹ میں خوب ملگیا۔ بالخصوص ایسی
صورت میں جبکہ جنگ شروع کرنے سے قبل مہاتما گاندھی جی مولانا محمد علی کو
صاف جواب دے چکے تھے کہ "وہ مسلمانوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں
ہیں۔ اگر مسلمان نہیں شریک ہوئے تو ان کی بالکل پرواہ نہوگی اور جنگ
کی جائے گی جنگ ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے مطالبات پر غور کیا جا سکتا ہے"
مہاتما جی کے اس فاتحانہ اور حاکمانہ جواب سے مولانا مطمئن نہ ہوئے تھے
اور انھوں نے اس جنگ میں شرکت کرنا غیر مشروط ہتھیار ڈال دینے کے
مترادف خیال کیا تھا لیکن وہ بہرحال خاموش نہیں بیٹھے بلکہ ہندوستان بھر کا دورہ
کیا اور مسلمانوں کو اس تحریک میں شرکت کرنے سے روکا۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں
خلافت کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کی طرف سے بہت طویل بیان شائع کیا گیا جس میں
بہت واضح طور سے مسلمانوں کی عدم شرکت کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی
جسمیں ۱۹۱۹ء کے ابتدائی حالات سے لیکر اسوقت کی سیاست پر مختصر تبصرہ کیا گیا
اور بتلایا گیا کہ کس طرح ابتدا میں کانگریس اور مہاتما گاندھی ترک موالات کی

تحریک میں شامل ہونے سے گھبراتے تھے اور کس طرح مسلمانوں نے اس زمانہ میں ملک کو آزاد کرانے میں قربانیاں کیں پھر کس طرح خود غرضیوں کے سامنے سنگھ کو تحریک کو بند کیا گیا اور ہندو مسلم فسادات کی بنیاد ڈالی گئی اور باوجود سیکڑوں درخواستوں کے مہاتما جی نے اپنی خاموشی کو نہیں توڑا۔ خلافت پارٹی نے کس طرح ہندو مسلم اتحاد کیلئے ان تھک کوششیں کیں لیکن آخرکار ہندو کانگریس لیڈروں نے مدراس تجاویز تک کو رد کر کے مسلم آزار پالیسی پر عمل کیا پھر یہ ثابت کیا کہ مسلمان تحفظات طلب کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں مہاتما گاندھی نے کس طرح پانچ سال قبل بلگام کانگریس میں صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندو مسلم اتحاد ہماری زندگی ہے اور جب تک فرقہ وارانہ رقابت موجود ہے اقلیتوں کا شک کرنا حق بجانب ہے اکثریت کو چاہیئے کہ ایثار کا نمونہ پیش کر کے اعتماد حاصل کرے" لیکن اب پانچ سال بعد ینگ انڈیا میں کس طرح تبدیل ہو کر فرما رہے ہیں "آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا کوئی سوال ہی نہیں" پھر یہ ثابت کیا گیا کہ اگرچہ ظاہری طور سے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا گیا ہے لیکن کیا حقیقت میں یہ مسترد ہو گئی ہے[1]؟ اگر یہ واقعی مسترد ہو گئی ہے تو صرف اس لئے کہ وائسرائے نے (مسلمانوں کے قتل نامہ پر) دستخط کرنے سے انکار کر دیا ابھی تک جو چیز منسوخ نہیں کی گئی ہے وہ تنگ ہندو ذہنیت ہے اور اگر اسکو دل سے مسترد کر دیا گیا ہے تو گاندھی جی نے یا ورکنگ کمیٹی نے یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے

---

[1] اصل میں نہرو رپورٹ کا تخیل ابتک موجود ہے مسٹر پرین کے یہ الفاظ اسی تخیل کیطرف اشارہ کر رہے ہیں "ہم ہر اس تصفیہ کو قبول کرینگے جو اصول قومیت سے مطابقت رکھتا ہو" (خطبہ صدارت ہری پورہ کانگریس)

کیوں ایک مرتبہ بھی اعلان نہیں کیا کہ "چونکہ یہ رپورٹ مسلمانوں کو پسند نہیں ہے اسلئے اسکو مسترد کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے مطالبات پر صلح کرنیکی کوشش کی جائے گی"۔ برخلاف اسکے فروری ۱۹۲۹ء میں گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں لکھا کہ باوجودیکہ سکھ اور مسلمان نہرو رپورٹ سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اسکو منظور کرانا لازمی ہے ترمیم اور تبدیلی ممکن ہے لیکن سنگین کے اشاروں پر اب ترمیمات قبول نہیں ہونا چاہیئے بلکہ جب رپورٹ میں اتنی قوت آجائے کہ ہر شخص اسکے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے"۔ جو شخص ۱۹۲۲ء میں باردولی میں تحریک ترک موالات کے پروگرام کو ایک دم بند کر سکتا تھا وہ ہی اب بھی اتنی ہی تیزی سے سول نافرمانی پھر شروع کر سکتا ہے لیکن کیا ضمانت ہے کہ پھر وہ ایک دم تمام حرکت کو نہیں روک دیگا؟" آخر میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ خاموش نہ بیٹھیں بلکہ پچاس ہزار والنٹیر اور پچاس لاکھ ممبر خلافت کے بنالیں تاکہ جب بھی جنگ کا الٹی میٹم دیا جائے وہ کام آسکیں۔ ایک دوست کے نام خط میں مولانا محمد علی نے اسی مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے :-

"آج وہ (جمعیۃ العلماء کے مقتدر لیڈر) محض ہندو کی دیکھا دیکھی انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے پر تلے بیٹھے ہیں مگر تیاری آجتک بھی نہیں کر رہے ہیں محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں یا کھڑے ہو کر یا گشت لگا کر انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے ہیں ابھی انقلاب بیچارہ پیدا بھی نہیں ہوا تو زندہ باد کی دعا فقرۂ لغو ہے۔ میں مسلمانوں کی نقالی اور قوالی سے سخت شرمندہ تادم اور مایوس تک ہونے لگتا ہوں امریکہ اور یورپ کے

نامہ نگار جو بیسیوں کی تعداد میں آئے ہوئے ہیں کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ان سے ملک ان کی رہنمائی کر دے اور بتا دے کہ یہ جنگ آزادی کی جنگ نہیں ہے محض انگریزوں کے زیرسایہ ہندو راج کی جنگ ہے کہ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم ہندو مہاسبھا بہادر کا اس وقت یورپ کا تمام پریس مسلمانوں کے خلاف ہے مگر نہ ... کچھ کر رہے ہیں۔ مسز بسنٹ اور ٹیگور تک ہندوؤں کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔"

جمعیۃ العلماء ہند نے امروہہ میں اجلاس منعقد کر کے سول نافرمانی میں حصہ لینے کا فیصلہ کر دیا جس سے مولانا محمد علی کو بہت صدمہ ہوا اسلئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مرعوب ذہنیت کی بنا پر یہ لوگ کانگریس کیمپ کی تقلید کر رہے ہیں جمعیۃ العلماء کے لیڈروں نے محمد علی اور اُنکے رفقاء کے خلاف جو طرز عمل اختیار کیا اُس نے مولانا کو بیحد رنجور اور غمگین بنا دیا جہاں کہیں وہ گئے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب وغیرہ نے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی بغیر کمانڈر کی فوج سے ان کی مخالفت کرائی۔ مولانا محمد علیؒ نے بمبئی میں اسی زمانے میں انڈین ڈیلی میل کے نمائندہ کو ایک مفصل بیان دیا جسمیں بتایا کہ :-

"اس وقت جتنے علماء اور لیڈر جمعیۃ العلماء کے کانگریس سے اشتراک عمل کر رہے ہیں وہ ملک و ملت کیلئے بہت مضرت رساں ہیں وہ سب لوگ خود غرض اور شہرت چاہنے والے ہیں میرے خیال میں بلا تیاری کے اس وقت جنگ کا اعلان غیر ضروری ہے جبکہ دونوں فرقے آپس میں اسقدر دست و گریبان ہیں ۱۹۲۳ء میں باردولی میں لارڈ ریڈنگ کے الٹی میٹم دیکھنے کے

بعد جبکہ سول نا فرمانی کیلئے ملک بالکل تیار تھا۔ سائمن کمیشن کی طرح کانگریس
نے بھی تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر کے معاملہ التوا میں ڈال دیا اور پھر کونسلوں
میں داخل ہو گئے ..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور کانگریسی لیڈر
طاقت کی ٹوپی اپنے اپنے سروں پر رکھنے کیلئے ایک دوسرے سے
سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لارڈ برکن ہیڈ اور سائمن کمیشن
نے اس ٹوپی کو اپنے سروں پر رکھ لیا تھا مگر مسٹر بین اور لارڈ اردن نے
اسکو اتار پھینکا اور رسل برہنہ سر کیوں رہتے؟ فوراً انھوں نے پہن لی۔ پنڈت
موتی لال اور گاندھی جی اسکو کب تک دیکھتے رہتے آخرکار انھوں نے بھی
۲۳ دسمبر کو ارسل کے سر سے چھین کر اپنے سروں پر رکھ لی۔"
محمد علی مرحوم کے ان بیانات سے مسلمانوں کی پوزیشن اور کانگریس کی نام نہاد
جنگ کی اصلیت کا پورا پتہ چلتا ہے۔

باب پانزدہم
گول میز کانفرنس

مولانا محمد علی اپنی علالت اور اغیار کی مخالفتوں کی وجہ سے اسقدر کمزور
تھے کہ اتنا طویل سفر کر کے گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا انکے لیے بالکل ناممکن
تھا لیکن جہاں آزادیٔ ہند کا معاملہ ہوتا تھا ان کی حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی
تھی اور وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اس سفر کا اختیار کرنا اور وہاں پہونچکر اس قدر

مصروف رہنا جان سے کھیلنا ہے مگر وہ اسکو بھی خوب سمجھتے تھے کہ انکی شرکت کے بغیر ہندوستان کی نمائندگی مکمل نہ ہوگی اسلئے آخرکار انھوں نے باوجود تمام رکاوٹوں کے اس سفر کو اختیار ہی کیا۔ آزادی ہند کے ہیرو کا یہ سفر انگلستان اس غلام ملک سے آخری سفر تھا جہاں کی تنگ اور غلامانہ ذہنیت اور بے مہری یاران وطن سے وہ بالکل تنگ آچکے تھے اس سفر کے وقت اگرچہ ان کی کمزوری کی یہ حالت تھی کہ وہ جہاز میں اسٹریچر پر لیٹ کر پہونچ پائے تھے۔ اور جب ایک اخباری نمائندے نے آپ سے سوال کیا کہ "آپ ایسی حالت میں کیوں جارہے ہیں" تو آپ نے جواب دیا کہ "میں مرنے جارہا ہوں" اور اگرچہ روانگی سے چند ایام قبل تک وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں برطانیہ کی پوری مخالفت اور آزادی کی سب سے زیادہ حمایت میں ہمہ تن مصروف رہے لیکن ہندوستان کی مقتدر جماعت علماء نے جن کو حجروں سے باہر لانے والا بھی یہی آخری مہاجر تھا جو دلشکن اور شرمناک مظاہرے ان کے خلاف سے یقیناً ہندوستان کی سرزمین میں اُڑنے والا ایک ایک ذرہ ان کی ان حرکتوں پر لعنت کر رہا ہوگا۔ انگلستان پہونچکر وہ برابر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے اور ہندوستان اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر سب کو سمجھاتے رہے۔ لندن میں پارلیمنٹری سب کمیٹی آف انڈیا کا ایک جلسہ ہوا جسمیں مولانا اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے مگر ایک خط سکریٹری کے پاس لکھ کر بھیجدیا جسمیں لکھا تھا کہ:-

"شاید میں ہی گول میز کانفرنس کا وہ واحد نمائندہ ہوں جس نے ہندوستان کیلئے درجہ مقبوضات سے زیادہ مکمل آزادی پسند کی ہے میں نے اسکو ۱۹۲۱ء میں کانگرس میں

پاس کرلیا تھا اور ابھی تک اسپر قائم ہوں جسپر میں پہلے تھا۔ ...میں نے اپنے
لیبر پارٹی کے دوستوں سے کہدیا ہے کہ میں درجۂ مستعمرات کے حصول کے لئے
بھی کوشش کرونگا۔ زندگی نہایت ہی تھوڑی ہے اس زندگی کے سفر کو ختم
کر رہا ہوں لہذا کم از کم میں یہ چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے خاتمے سے پہلے
ہندوستان اپنی سیاسی منزل مقصود تک پہونچ جائے اور میں امید کرتا ہوں
کہ آپ کی لیگ اسکی کوشش کریگی کہ گول میز کانفرنس صحیح معنوں میں
درجۂ مستعمرات حاصل کرے مجھے یہ ڈر ہے کہ انگلستان میں کوئی ایسا مدبر نہیں
جو ایسی قربانی کرسکے لہذا ایسا سمجھے کہ پارلیمنٹری پارٹی ہی ایک ایسی جماعت
ثابت ہو جو ہندوستان کیلئے مجلس عوام میں پولنگ بوتھس در انتخاب گاہ میں
اور عمومی انتخاب میں شکست کھائے اسکے امید افزا ثابت ہونے کا قرینہ
نہیں تاہم میں امید کرتا ہوں کہ مجلس عوام کے سب ممبر اسکے لئے تیار رہیں
کہ وہ دنیائے انسانیت کے ۱/۵ حصہ کے ساتھ جو ہندوستان میں بستا ہے انصاف
کرنے کیلئے اپنے کو سیاسی تاریکی کے غار میں گرا دینگے اور پھر اسکے بعد
برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان ایک ابدی صلح اور راستی ہو جائیگی۔"

پھر گول میز کانفرنس میں جو تقریر مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کرتے ہوئے مولانا نے
کی وہ دنیا کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائے گی اسمیں جس آزادی کا مطالبہ
کیا گیا تھا حقیقت میں وہی آزادی کا ایک تخیل ہے جو سراسر اسلامی ہے اور جو اس
تخیل سے زمین و آسمان کا بُعد رکھتا ہے جسکو اب تک کانگریس نے اپنا نصب العین
بنا رکھا ہے وہ آزادی یہ تھی :-

"آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دینگے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کیلئے جگہ دینی پڑے گی، میں وہ ہی اختیار چاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جرم کے مرتکب ہوں تو میں انھیں جیل بھیج سکوں، میں آپ سے دریوزہ مستعمرات لینے نہیں آیا ہوں میں ڈومنین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں میں کامل آزادی کے عقیدہ کا پابند ہوں"[۱]

کسقدر صاف اور غیر مبہم توضیح ہے اپنے نصب العین کی اور کتنا بُعد ہے اس تخیل میں جو کبھی تو سوراج کبھی پورنیہ سوراجیہ اور کبھی رام راجیہ کی مختلف شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل تک مولانا اپنی جدوجہد اور سرگرمیوں میں مصروف رہے جس رات کو انتقال ہوا اس سے تھوڑے عرصہ قبل تک وزیراعظم کے نام اس اسکیم کا مسودہ ٹھیک کرتے رہے جو ہندو مسلم مسئلہ پر آپ نے تیار کی تھی اس خط کے ابتدائی کلمات سے ان کی نیم جانی اور اس پر جدوجہد کی پوری حالت نمایاں ہو جاتی ہے:۔

"جیسا کہ میں نے کانفرنس کے اجلاس میں کہا تھا میری صحت اتنی خراب ہے کہ میں گول میز کی شرکت کیلئے سفر کرنے کے کسی طرح قابل نہ تھا جیسا کہ میرے ڈاکٹر آپ کو بتا سکتے ہیں، ۱۹ر دسمبر کو میں بیہوش ہو گیا اور ۲۴ گھنٹے سے زیادہ

---

[۱] روزنامہ خلافت ۱۱ر اپریل ۱۹۳۱ء۔

بیہوش رہا اس حالت میں بھی جس کام کیلئے میں یہاں آیا ہوں اُسکے کرنے
کی خواہش میرے اندر اسقدر قوی تھی کہ میں نے لارڈ چانسلر کو ۹ بجے
شام کو ناشتہ کی دعوت دی یعنے شام کے وقت کو صبح کا وقت سمجھا "

پھر آپ نے لکھا :-

"ہم انتخاب جداگانہ یا ویٹج لیکر ہندوستان نہ جائینگے ہمارا اصلی مقصد ایسی
آزادی کا حصول ہے جمیں مسلمان بھی آزاد ہوں اور ہندوستان بھی آزاد ہو
اگر ہمارا مطالبہ پورا ہوا تو میں وزیر اعظم کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان دوڑ
موجودہ قومی تحریک میں شامل ہو جائیں گے "

اسکے بعد آپ نے مخلوط انتخاب کی ایک نئی اسکیم پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ :-

"ہر امیدوار کیلئے ضروری ہوگا کہ کم سے کم ۴۰ فیصدی ووٹ اپنی جماعت سے
حاصل کرے اسکے علاوہ اگر وہ اقلیت جماعت کا ممبر ہے اسکے لئے لازمی
ہوگا کہ وہ ۵ فیصدی ووٹ دوسری جماعت سے حاصل کرے اور اگر وہ
اکثریت سے تعلق رکھتا ہے تو اُسکو ۱۰ فیصدی ووٹ دوسری جماعت سے حاصل
کرنے چاہئیں - یہ ہی ایک ایسی اسکیم ہے جس پر کاربند ہو کر فرقہ وارانہ جذبہ
کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے اور پھر صحیح طور پر جذبہ قومیت کے پیدا ہونے
کی اُمید کی جا سکتی ہے "

مولانا محمد علی کی وفات | مولانا محمد علی کی گول میز کانفرنس کی ابتدائی تقریر کا ہندوستان
میں بہت زور شور سے استقبال کیا گیا تھا اس سے وہ طبقہ جو اُنکے نئے طرز عمل کا
معترض تھا بالکل خاموش ہو اور انگشت بدنداں رہگیا۔ تقریر کے کچھ دنوں بعد جب

مولانا کے انتقال کی خبر ہندوستان پہونچی تو تمام ملک میں ماتم برپا ہو گیا ہندوستان کا بچہ بچہ آنسو بہانے میں مصروف تھا اور ان کے دشمن اپنے کارناموں پر نازاں تھے۔

مولانا کی وفات سے ہندوستان کی اسلامی سیاست کو سب سے زبردست نقصان پہونچا اس سے پھرے ملاح کی موت نے پوری کشتی اسلام کو ڈگمگا دیا اگرچہ کشتی باہمی رزم آرائیوں اور ملاح کے احکام کی مخالفت کی وجہ سے پہلے ہی سے شکستہ ہو چکی تھی مگر اس حادثے نے تو اسکو بالکل ہی موجوں کی کشمکش میں مبتلا کر دیا اسکے بعد سے عرصہ تک وہ کشتی اسیطرح ڈانوا ڈول رہی۔ اور کون نہیں جانتا کہ اگر پانچ سال بعد اُسی کا ہمنام محمد علی جناح اسکی رہنمائی پر باوجود مخالفت کے کمربستہ نہوتا تو اس کشتی ملت کا اب تک کیا حشر ہوا ہوتا۔

دوسری گول کانفرنس میں مہاتماجی کی شرکت

سول نافرمانی کی تحریک کچھ عرصہ تک چلی پہلی کانفرنس میں گاندھی جی نے شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن تحریک جبکہ اپنی معمولی قوت سے جاری تھی مہاتماجی نے پھر ۱۹۲۲ء کا سبق دہرایا اور مولانا محمد علی کی دونوں پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوگئیں۔ ہزاروں آدمی جیل جاچکے تھے اور لاکھوں روپیہ کی جائدادیں ضبط ہو چکی تھیں لیکن جب کہ سب سیاسی قیدی جیل ہی میں بند رہے مہاتماجی نے لارڈ ارون سے فیصلے پر ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی ارون پیکٹ پر مع دوسرے ممبران ورکنگ کمیٹی کے دستخط کر دیئے اور تحریک کو ملتوی کر دیا اور گول میز کانفرنس میں جانا منظور کر لیا حالانکہ اُنکے لندن جانے سے قبل ہی لارڈ ارون لارڈ ولنگڈن کو چارج دے چکے تھے اور لارڈ ولنگڈن نے آہنی ڈنڈے سے حکومت کرنی شروع کر دی تھی لارڈ ارون کے تمام وعدوں کو مسترد کر دیا تھا لیکن

گاندھی جی کی فیرت[1] نے ان تمام باتوں کے باوجود کانگریس کے فیصلے کے مطابق لندن جانا گوارا کیا اور تمام دنیا کو اپنے خالی منصوبوں پر مضحکہ اڑانے کا خوب موقع دیا مسلمانوں نے چاہا کہ گاندھی جی کے لندن جانے کے قبل ہی ہندو مسلم مسئلہ کو طے کر لیں لیکن گاندھی جی کی ہمیشہ ایسے موقع پر یہ چال ہوتی ہے کہ جب وہ سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے تو خود مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑا دیتے ہیں لہذا انھوں نے مسلمانوں کے مطالبات کو یہ کہکر رد کر دیا کہ میں کیا کروں مسلمان قوم پرست لیڈر مثلاً ڈاکٹر انصاری وغیرہ اسکو منظور نہیں کرتے ہیں گاندھی جی کا یہ طرز عمل ہمیشہ قائم رہتا ہے آجکل مولانا ابوالکلام صاحب سے بھی وہی کام لیا جا رہا ہے۔ گول میز کانفرنس میں بھی انھوں نے ڈاکٹر انصاری کو نامزد کرانا چاہا مگر اسمیں انکو کامیابی نہوئی۔ گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے جس فرقہ وارانہ اور تنگ ذہنیت کا ثبوت دیا وہ قابل عبرت ہے۔ وہاں جاکر انکے بینک چیکوں کے تمام وعدے بالائے طاق رکھدیے گئے، مسٹر محمد علی جناح نے جو اس کانفرنس میں سب سے بہترین ڈیبیر تسلیم کئے گئے تھے اپنی کمال سیاست دانی اور فراخ حوصلگی سے اقلیتوں کے سوال کو حل کرنے کی کوشش کی اور ان ہی کی کوششوں سے ایک مینارٹی[2] کمیٹی (اقلیتوں کی کمیٹی) بنائی گئی جسکے ذریعہ تمام اقلیتوں نے ملکر کانگریس سے مفاہمت کی کوشش کی مگر سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور ہندو کانگریس لیڈروں کی تنگ نظری کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی۔ گاندھی جی نے آخر میں تسلیم کیا کہ۔

---

[1] مسلمانوں کا مستقبل کے مصنف نے افسوس ہے اس معاملہ میں تصویر کے غلط پہلو کو دکھایا ہے۔

"میں اپنی ذات سے تو مسلمانوں کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں جو وہ چاہتے ہیں اور میں رات کے [illegible] بجے تک ہندوؤں اور سکھوں کو آمادہ کرتا رہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔"

مگر یہ بھی گاندھی جی کی سخن طرازی تھی جب مسلمانوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ وہ ہر جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے شرائط کو قبول کرلیں، تو گاندھی جی نے صاف انکار کر دیا اور صرف اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ مسلمان دوسری اقلیتوں بالخصوص اچھوتوں کی جداگانہ انتخاب کے معاملہ میں مدد نہ کریں بجز سکھوں کے اور ایسے ہندوؤں کے جو اپنے صوبوں میں اقلیت رکھتے ہیں مگر مسلمانوں نے یہاں بھی اپنی فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا اور اچھوتوں کے ساتھ خود غرضی کو گوارا نہ کیا۔ آخرکار گاندھی جی کے طرز عمل سے مجبور ہو کر تمام اقلیتوں نے باہمی معاہدہ کر لیا۔ گاندھی جی نے اس معاہدہ کو توڑنے کی بھی کافی کوشش کی اور ۱۴ر نومبر کو مسلم ڈیلیگیٹوں سے ملاقات کر کے ان کو اس پر آمادہ کرنا چاہا مگر مسلمانوں نے انکار کر دیا تھا تو گاندھی جی نے ایک الگ جلسہ بھی طلب کیا اس جلسہ میں سر سپرو بھی شریک تھے آپ نے اس جلسہ کی کارروائی پر ۱۹۳۳ء میں ایک بیان کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں :-

"گاندھی جی نے ۲۰ یا ۲۱ اشخاص کا ایک جلسہ طلب کیا جو قصر سینٹ جیمس میں ہر رات جمع ہوتے تھے۔ اگر میں بعض ان حضرات کے طرز عمل کا تذکرہ کروں جنہوں نے اس جلسہ کی تمام کارروائیوں میں حصہ لیا تھا تو گویا مسئلہ کے بہت ہی نازک پہلو کا انکشاف ہوگا۔ ان کارروائیوں کی ابھی مکمل تاریخ تو لکھی جانی ابھی باقی ہے

لیکن میں بلا خوف تردید یہ بیان کرونگا کہ اس آخری رات کو جب جلسہ ہوا
تو ذہنی اضطراب کے آثار (ان کے دگا ندھی جی) چہرہ سے عیاں تھے ہم
بغیر کچھ حاصل کئے ہوئے اُٹھے اور اُسوقت ایران کے شاعر اعظم (فردوسی) کا
قول مجھے یاد آگیا جو اُس نے تاریخ ایران کے ایک مشہور واقعہ کے متعلق کہا تھا
"نشستند و گفتند و برخاستند" میں نے اس تاثر کو اپنی ڈائری میں اُسیوقت قلمبند
کیا اسکا اندراج اسطرح ہے "تمام نام نہاد ہندوستانی قومیت کا جنازہ نکلتے دیکھا
جس کے کندھا دینے والوں میں . . . تھے کیا وہ پھر بھی زندہ ہوگی؟"

آخرکار کانگریس کے مقتدر لیڈروں نے وزیراعظم سے خود درخواست کی کہ وہ اپنے انصاف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کر دیں اس درخواست پر مہاراجہ دربھنگہ مسز سروجنی نائیڈو ماسٹر تریندر ناتھ سیٹھ برلا مسٹر آئنگر اور دوسرے چند ہندوؤں نے دستخط کئے تھے خود مہاتما جی نے وزیراعظم کو ایک علیحدہ خط میں اس درخواست کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ "اگرچہ میں نے دستخط نہیں کئے ہیں لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ میں اسکے خلاف ہوں" لیکن جب کچھ عرصہ بعد وزیراعظم نے کمیونل اوارڈ کے نام سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا فیصلہ دیا تو انہی دستخط کرنیوالے ہندوؤں نے شور مچانا شروع کر دیا مسلمانوں نے ابتدا ہی سے اس درخواست پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہندوؤں کو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب "بیداری ہند" کے شائع ہونے کی وجہ سے شروع ہی سے کچھ امیدیں تھیں اسلئے باوجود مسلمانوں کے دستخط نہ کرنے کے ہندوؤں نے دستخط کر دیے اور بعد میں انھوں نے ہی اسکے خلاف شور مچایا اس کمیونل اوارڈ میں اچھوتوں کو علیحدہ نمائندگی اور انکو حق جداگانہ انتخاب

مسلمانوں کی طرح دیدیا گیا تھا لیکن مہاتما جی اسکو کب برداشت کر سکتے تھے انہوں نے اسکو ہندو مذہب کے منتشر کرنے کی ایک مہلک اسکیم سے تعبیر کیا اور اسکے خلاف تا اختتام زندگی روزہ رکھکر گورنمنٹ کو چیلنج دیدیا اسپر حکومت نے انکے مطالبہ کو منظور کر لیا کہ اگر اچھوت راضی ہو جائیں تو یہ معاہدہ منظور کر لیا جائیگا لہذا پونہ پیکٹ کے نام سے وہ معاہدہ کیا گیا اور بیچارے اچھوتوں کی قسمت پر پھر مہر لگادیگئی۔ مہاتما جی نے لندن سے ناکام نامراد واپس آکر ہندوستان میں تجدید تحریک کی کوشش کی مگر وہ خود گرفتار کر لیے گئے اور تحریک بہت جلد مردہ ہوگئی۔ پھر گاندھی جی نے دوبارہ "اپنی ہمالہ جیسی غلطی" کا اعتراف کیا اسکے بعد سے وہ عام انتخابات تک ہندوستان کی سیاست سے علحدہ ہوکر یہانتک کہ کانگریس کی چار آنہ کی ممبری سے بھی علحدہ ہوکر صرف اچھوت ادھار کے کاموں میں مصروف ہوگئے ۔ ۱۹۳۳ء میں کیمونل اوارڈ کے متعلق ہندو مسلمانوں نے باہمی سمجھوتہ کی کوشش کی مگر وہی تنگ ذہنیت حائل ہوئی اور کوئی نتیجہ حسب معمول برآمد نہ ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ

حصہ دوم

سیاست امروز

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
(اقبالؒ)

باب اوّل

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی آمد

کانگریس کا وزارت کی کرسیوں پر قبضہ

گذشتہ واقعات پر اگر گذشتہ واقعات سے کوئی عبرت حاصل کی جا سکتی ہے اور
ایک سرسری نظر آئندگان کیلئے تاریخ ماضی مشعل راہ کا کام کر سکتی ہے تو
گزشتہ صفحات کا مفصل اور مکمل نقشہ مسلمانان ہند کی آئندہ سیاسی عمارت کی
تعمیر میں پوری طرح سے معاون ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ سیاسی تاریخ
اسقدر غیر مبہم، صاف اور واضح ہے اور واقعات کی ناقابل انکار حقیقت اسقدر
نمایاں اور آئندہ کیلئے اسقدر رہنمائی پر آمادہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی سیاسی راہ کے
تعین میں مطلق کوئی دقت نہونی چاہیئے۔ گذشتہ واقعات نے بالکل ثابت کر دیا ہے
کہ برادران وطن کے دل میں آجتک وہ تخیل آزادی کا نہیں پیدا ہوا جسکی اسلام
اور ہندوستان کو ضرورت ہے۔ تاریخ کا ہر صفحہ شاہد ہے کہ وہ ہندوستان کی سرزمین
میں مسلمانوں کے وجود کو برابر کے حقدار کی حیثیت سے دیکھنا قطعی گوارا نہیں کرتے
میدان سیاست میں ان کا جو تیر بھی ترکش سے نکلتا ہے اُسکا ہدف مسلمانان ہند
کا سینہ ہی ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی حربہ انھوں نے بغیر آزمائے نہ چھوڑا جو مسلمانوں
کو ختم کرنے میں کام آ سکتا تھا اگرچہ بسا اوقات ان کی زنجیریں خود ان کے

پیروں میں پڑکر رہ گئیں اور ان کے منصوبے اکثر بیکار رہے ہیں شدھی کی تحریک جاری کرکے انھوں نے خود مسلمانوں میں تبلیغ کا احساس پیدا کیا اور مسلمانوں کی آبادی میں کافی اضافہ کر دیا مخلوط انتخاب تعین نشست کو اپنی طاقت کے نشہ میں نامنظور کرکے اس سے کہیں زیادہ شرائط کو انھیں مجبور ہو کر ماننا پڑا حکومت برطانیہ پر امن جنگ ضرور کی گئی لیکن عدم تشدد کے اصول پر اعتدر سختی کے ساتھ عامل ہو کر کہ اُسکے خلاف عمل کرنے پر پوری تحریکوں کو روک دیا گیا لیکن مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے افسوس! خود مہاتما جی کو تشدد کی ترغیب دینی پڑی ۱۹۲۳ء کے ہندو مسلم فسادات کے سلسلہ میں مہاتما جی نے ینگ انڈیا میں ہندوؤں کی بزدلی کا ماتم کیا اور مسلمانوں کے خلاف عدم تشدد اور پر امن جنگ کے اصول کو بالکل بھول گئے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال لینے شردھانند کی یادگار کی اپیل شائع کرنے اور نہرو رپورٹ کے ذریعہ اسلامی سیاست کو ہندوستان سے بالکل ختم کر دینے میں ایک بار نہیں متواتر گاندھی جی اور دوسرے زعماء کانگریس نے علے الاعلان حصہ لیا لیکن انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دینے کیلئے کبھی ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہ نکلا محمد علی کے جن الفاظ نے ایوان پارلیمنٹ اور قصر بکنگھم میں زلزلہ ڈالدیا اور ہندوستان کی سرزمین میں بارہا انقلاب پیدا کر دیا کبھی اُسکی معمولی صدائے بازگشت بھی کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلند نہوئی جتنی قوت مسلمانوں کے خلاف استعمال کی گئی کبھی اسکا عشر عشیر بھی حکومت برطانیہ کے خلاف صرف نہوا برٹش امپیریلزم اور کانگریس (جو خود اسی امپیریلزم کا ایک باضابطہ بچہ ہے) آپس میں اگر دست گریبان ہوئے بھی تو وہ کبھی تان اور بجا یا

تھا وہ بیوی کی خانگی ضدوں اور ہٹوں سے آگے نہیں بڑھے جب کبھی کانگریس
کی ضد پوری نہوئی تو اُس نے نہایت پُر امن طریقوں سے احتجاج کیا۔ اور
عدم تشدد کا اتنا خیال رکھا کہ ظل بارگاہ سلطانی کو کوئی صدمہ نہ پہونچ جائے۔[1]
اور جب وہ ضد پوری کردیگئی کانگریس کی وفاداریاں حکومت کے ساتھ ہوگئیں اس
طرح بیچاری کانگریس کبھی پوزیشن پارٹی سے آگے نہیں بڑھی جو اُس کے
مخالفین اول کا حقیقی مقصد تھا۔

وہ نوخیز[2] مسلم نوجوانان سرفروش اور گرفتاران دام سیاست جو جذبات کے
اسقدر متاثر اور تعصب کی عینک نے ان کی بینائی اسقدر کمزور کردی ہے کہ
تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت اُنکے لیئے چراغ رہگذر کا کام دے رہی ہے اور وہ
آگ کے طوفان میں کودنے پر آمادہ[3] کیلئے اپنی عقل و فراست کو گذشتہ
حالات سے وابستہ کرکے ایک لمحہ کیلئے غور فرمائیں کہ وہ کس بنا پر تاریخ کے
اسی غیر خوشگوار تلخ دور کا اعادہ کرنے میں معاون ہیں جس کی ضرب سے اب تک
مسلم ہندی نیم جاں ہے۔ وہ رہنمایان ملت اور اُنکے بے دست و پا مقلدین کا
گروہ ہوش و خرد سے کام لیکر سوچیں کہ انکا کانگریس کے خوش نما قلعہ اور اپنی
شکستہ مگر پختہ بنیاد عمارت سے مرعوب ہوکر اور یہ جانتے ہوئے کہ اس قلعہ کے کسی
گوشہ پر بھی قبضہ کرلینا امر محال ہے اسیں داخل ہوکر انھیں کی فوجوں میں شامل
ہوجانا کہاں کی دانشمندی ہے جبکہ وہ فوج ہمیشہ مسلم کیمپ پر گولہ باری کرنے کیلئے

---

[1] اسی لیئے گاندھی جی کو ایک جرنلسٹ نے کہا تھا کہ برطانیہ کے بہترین پولیس مین ہیں"

[2] سرکش نوجوان۔ [3] ملے سادہ لوح۔

ترتیب دی گئی ہے اور جس کو اب مغربی فراہمی و آلات سیاست سے آراستہ اور
مسلح کر دیا گیا ہے۔

نئے قانون کے نفاذ کے وقت ہندستان کی عام حالت

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وقت اور اس سے قبل مسلمانان ہند کا شیرازہ منتشر، ان کی سیاسی حالت ابتر اور ناگفتہ بہ
تھی ان کا کوئی متحد اور متفق پلیٹ فارم نہ رہا تھا۔ اپنی سیاسی غلطی کی بنا پر
وہ اپنی تنظیم کو بالکل کھو چکے تھے ان کی حالت اس گم کردہ کارواں جیسی ہو گئی
تھی جو پندرہ سال سے بے آب و گیاہ صحرا میں بغیر نشان منزل بھٹکتا پھرتا ہو۔
ان میں طوائف الملوکی کی طرح انجمنیں اور جماعتیں ہزاروں ہو گئی تھیں لیکن
رہنما باہمی رزم آرائیوں میں مصروف رہتے تھے، ہر ایک کا راستہ جدا اور منزل
علیحدہ، اقبال نے خوب کہا تھا۔ ؎

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

ابتدائی دور انتشار میں مولانا محمد علی کی شخصیت اس راہ گم گشتہ قافلہ
کے امیر کارواں کی حیثیت سے برابر اس کو سرگرم سفر رکھتی رہی اگرچہ کارواں میں ضبط
اور نظام ختم ہو جانے کی وجہ سے اور قافلہ سالار کے احکامات کی تعمیل نہ ہونے
کی وجہ سے تمام منتشر گروہ ایک مرکز پر نہ آ سکا تھا مگر بہر حال مسافت طے
ہوتی رہتی تھی بقول اکبر مرحوم ؎

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد سہی

لیکن محمد علی کی وفات کے بعد یہ تمام اضطراب و جوش ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر قوم پرور مسلمانوں نے یونٹی بورڈ قائم کر کے انتخابات میں حصہ لیا اور مسٹر جناح کی سرکردگی میں اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک پارٹی بنائی گئی۔ خدا کو ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی عزت رکھنی منظور تھی کہ اُس نے مسٹر جناح کے ہاتھوں وہ کام لے لیا کہ کسی کو توقع بھی نہ تھی ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں کرنا، مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے ملک کا دورہ کرنا اور مسلم لیگ کے ذریعہ عام انتخابات میں حصہ لینا ایک نئی عمارت کی بہت مضبوط بنیاد تھی جو خدا کا شکر ہے روز بروز روبہ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہندوؤں کی ذہنیتوں میں اب تک کوئی تغیر نہیں ہوا تھا ہندو مہا سبھائیوں کا ذکر نہیں خود کانگریس کے ہائی کمانڈ مسلمانوں سے مصالحت پر راضی نہ تھے وہی گاندھی جی جو ایک زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے کوشاں رہتے تھے اور زمانہ خلافت میں اُردو لکھنا سیکھا کرتے تھے اور حکیم اجمل خاں صاحب وغیرہ کو جیل سے خطوط لکھا کرتے تھے (جنکی تصویریں اکثر شائع ہوئیں)، جنھوں نے مولانا عبدالباری صاحب کے مکان پر مسلمانوں کی مقدس کتاب کے ترجمہ کی تلاوت بھی فرمائی تھی اب وہ اُردو کو فنا کرنے کا بیڑہ اُٹھا چکے تھے اور اب صرف ہندوؤں کے سیاسی مہاتما بنکر رہ گئے تھے اب اُنکے دل میں ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوئی جگہ نہ تھی بلکہ انکو صرف یہ خیال تھا کہ کہیں اچھوت مسلمان نہ ہو جائیں انکی علیحدہ اقلیت نہ تسلیم کر لی جائے مبادا ہندوؤں کی چھ کروڑ تعداد کم ہو جائے۔

---

[1] خدا کا شکر ہے اب حکومت سی پی نے ان کو باقاعدہ ما تو تسلیم کر لیا ہے۔ پانیر ۔ ستمبر ۱۹۳۸ء

کانگریس اور مسلم مطالبات

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

جب انگلستان کی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی رو سے کیا تھا تو ہندوستان کے ہر شخص نے اُسے ٹھکرایا اور ہندوستان کے متحدہ اور متفقہ مطالبے سے بھی بہت کم سمجھا تھا کانگریس کا دعوے تھا کہ وہ مکمل آزادی چاہتی ہے مگر جب ہندوستان کی موجودہ تاریخ مرتب کی جائے گی تو کانگریس کی موجودہ پالیسی جو وزارتوں کو قبول کرنے میں عمل میں آئی ہے تاریخ کے صفحات میں نہ مٹنے والا دھبہ ثابت ہو گی اور ملک کو بھی بہت جلد محسوس ہوگا کہ کانگریس نے اپنے حقوق کی بنا پر آزادی کی تحریک کو برسوں پیچھے ڈال دیا ہے کانگریس اسکو خوب جانتی ہے کہ اسکے اصل مقصد کیلئے یہ طریقہ بالکل مناسب ہے کیونکہ اسکو معلوم ہے کہ وہ انقلاب کی خواہاں نہیں ہے بلکہ اُسکی آخری تمنا برطانوی سنگینوں کے سائے میں "کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی" کا قیام ہے جسکے ماتحت اکثریت اقلیتوں پر حکومت کر سکے مگر وہ بیچارے مسلمان جو کانگریس کو آزادی کا علمبردار سمجھ رہے ہیں ابھی تک اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ یہ وزارت کی کرسیاں آزادی کے راستہ کی ایک منزل ہے۔ الیکشن سے پیشتر کانگریس کا یہ دعوے تھا کہ وہ اس نئے قانون کو توڑنے کیلئے کونسلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے پنڈت جواہر لال نے ایک مرتبہ نہیں سیکڑوں مرتبہ علانیہ کہا کہ وزارتیں کسی صورت میں

بھی قبول نہیں کی جا سکتیں اسلئے کہ وہ ہم کو آزادی کے راستہ سے بہت دور کر دیگی
لکھنؤ میں جب کانگریس کا اجلاس ہوا تو پنڈت جواہر لال نہرو ہی اسکے صدر تھے
خطبۂ صدارت میں انھوں نے بحیثیت صدر کے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہ
یہ ہیں جنکو انکے خطبۂ صدارت سے نقل کیا جاتا ہے :-

"انھیں وجوہ کی بنا پر مجھ کو یقین کامل ہے کہ کانگریس کیلئے عہدے قبول کرنے
کی تائید کرنا یا اس معاملہ میں پس و پیش کرنا ایک زبردست غلطی ہوگی اس
زبردست گڑھے میں گرنے کے بعد ہمارا ابھرنا مشکل ہو جائے گا عملی سیاست
اسکے خلاف ہے اور اسیطرح وہ کانگریس کی روایات اور ذہنیت بھی جسکو
ہم عوام میں پھیلانا چاہتے ہیں اسکی مخالف ہے نفسیاتی حیثیت سے اس قسم کی
رہنائی ممکن ہے کہ ہلاکت خیز نتائج پر ختم ہو اگر ہم انقلاب انگیز تغیرات کے
حامی ہیں جیسا کہ واقعہ ہے تو ہم اپنے ابنائے وطن میں ایک انقلاب انگیز
ذہنیت پیدا کریں اسکے خلاف جو تجویز بھی ہوگی مضرت رساں ثابت ہوگی"

یہ بیان اس شخص کا ہے جو کانگریس کا محبوب ترین لیڈر ہے اور جسکی ابرو کے
اشارہ پر کروروں ہندو جان دینے کو تیار ہیں ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے کہ
پنڈت جی پورے ایمان اور یقین کی قوت کے ساتھ وزارتوں کو آزادی کے
راستہ میں زبردست کانٹا سمجھ رہے ہیں اور اصل آزادی کی راہ اسمیں سمجھ رہے
ہیں کہ عوام میں انقلاب کی ذہنیت پیدا کی جائے بجائے اسکے کہ انکو گورنمنٹ
ہاؤس کا مہمان بنایا جائے لیکن جب الیکشن ختم ہوئے اور چھ صوبوں میں کانگریس
کی اکثریت ہو گئی تو وہ انقلابی ذہنیت ختم ہو گئی اور وہ مشروط طریقہ پر وزارت

قبول کرنے کو تیار ہو گئے یعنے اگر صوبوں کے گورنر تحریراً یقین دلا دیں کہ وہ وزیروں
کے داخلی اختیارات میں حائل نہ ہونگے تو وہ وزارت مرتب کر سکتے ہیں۔ کانگریس
کا خیال تھا کہ گورنمنٹ اسکی الکشن کی کامیابی سے مرعوب ہو کر ضرور اس قسم کا
یقین دلادیگی اور عہدے قبول کر لئے جائیں گے لیکن گورنمنٹ جو اس قسم کے
سودے چکانے میں بہت شاطر ہے خوب سمجھتی تھی کہ کانگریس کی ذہنیت میں
آزادی کی جنگ کا خیال بھی نہیں ہے وہ حقوق کی طالب ہے اور صرف خود بخود
عہدوں کیلئے جھکیگی صاف انکار کر دیا کہ اس قسم کا کوئی یقین نہیں دلایا جا سکتا
کانگریس اس طرز عمل سے سخت پریشان ہو گئی، اب اسکے لئے کوئی راستہ نہ تھا
وہ پچھتاتی تھی کہ یہ کیا ہو گیا گاندھی جی اپنے بیان کی تاویلات پیش کرتے کرتے
تھک گئے تھے بار بار اعلان کرتے تھے کہ میرا مطلب تو یقین سے صرف اتنا ہے کہ
روزانہ کے معمولی معاملات میں وزراء کے کاموں میں کوئی مداخلت نہ کیجائے،
دنیا کا ہر اخبار کانگریس کے اس مضحکہ خیز طرز عمل پر ہنس رہا تھا کہ یہ کیسی آزادی
کا دعوے ہے کہ روزانہ گورنمنٹ کے سامنے جھکتے جا رہے ہیں کہ جس طرح بھی
ہو عہدے مل جائیں ورنہ ظاہر ہے آزادی کی راہ تو سامنے موجود تھی کونسلوں کا
بائیکاٹ کرنا آزادی کی جنگ کیلئے سب سے پہلا فرض تھا لیکن ان تمام خوشامدوں
کے باوجود گورنمنٹ نے کوئی تحریری اطمینان نہیں دلایا مگر پھر بھی جو اس قوم کو
کرنا چاہیئے تھا جو جنگ بعض حقوق کیلئے کیا کرتی ہے وہی کیا گیا اور جولائی میں
گاندھی جی کے مشورے کے بعد عہدے قبول کرنے پڑے اسکے بعد ہی جواہر لال جی
جو ان کو قوم کیلئے سم قاتل سمجھتے تھے ان کو شیریں گھونٹ سمجھ کر چڑھا گئے اور

یہ فرمایا کہ مجلس عاملہ کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ ذہنیت جو تمام دنیا کے سامنے ہے مگر غریب عوام کی نظروں سے چھپائی جا رہی ہے۔ کانگریس کی ایک خاص جماعت آخری وقت تک عہدوں کے خلاف رہی اس سلسلہ میں جو بیان عہدوں کے قبول کرنے کے فیصلہ کے بعد آنریبل رفیع احمد قدوائی صاحب موجودہ وزیر مالیات نے اُسوقت دیا تھا وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کانگریس نے آزادی کی جنگ کو کتنا گہرا دفن کر دیا ہے انھوں نے عہدوں کو مکڑی کے جالوں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ہم کو اپنی مکمل شکست کا پورے طور سے اعتراف کر لینا چاہیئے۔ برٹش ڈپلومیسی پورے طور سے ہمارے خلاف کامیاب ہو گئی۔ اب گورنمنٹ کو کانگریس کا کوئی خوف نہیں رہنا چاہیئے، اسلئے کہ وہی کانگریس جو عوام میں انقلابی ذہنیت پیدا کرنا چاہتی تھی اب سرکار برطانیہ کی دوست ہو گئی"

اس بیان کو وہ مسلمان پڑھیں اور سر دُھنیں جو اپنی مصیبتوں کا علاج اسی جماعت میں سمجھتے ہیں جو صرف ہندوؤں کے چند حقوق کی حفاظت میں سرگرم ہے۔ غضب یہ ہے کہ الیکشن سے پیشتر تک تمام لیڈروں کی تقریریں ان الفاظ سے بھری پڑی تھیں کہ ہم اسمبلیوں میں موجودہ قانون کو توڑنے اور ختم کرنے جا رہے ہیں لیکن جب وزارتیں قبول کی گئیں تو جو شخص بھی وارد ہا میں گاندھی آشرم سے باہر آیا وہ قانون کو چلانے کی ترغیب دے رہا تھا اب ختم کرنے کے بجائے چلانے کا لفظ زبان زد عوام ہو گیا ہے اور اسکے بعد کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں تو پنڈت جواہر لال صاحب نے بیانگ دہل فرما دیا کہ "میرا خیال تھا کہ قبول عہدہ کار

کا فیصلہ مضر ہوگا مگر میں اپنی غلطی کو اب محسوس کرتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ عہدے قبول کرنے کے بعد کانگریس کے نظام میں کتنی قوت آگئی ہے۔" ع

نغز بر تو اے چرخ گردوں نغز

لیکن باوجود کانگریس کے جائز اور ناجائز پروپگنڈوں کے بے شمار روپیہ صرف کرنے اور حکومت کی تمام مشینری کانگریس پروپگنڈے میں صرف کرنے اور ترقی و اصلاح دیہات کے پورے محکمہ کو کانگریس کا اثر بڑھانے کیلئے استعمال کرنے کے اس سال کی ممبری کی حالت حسب بیان وزیر اعظم[1] یو۔ پی گزشتہ سال سے زیادہ تو کیا خلاف امید نسبتاً بہت ہی کم ہے۔

کانگریسی صوبوں میں مسلم مفاد کا تحفظ

ہر وہ قوم جو آزادی چاہتی ہے متحدہ محاذ قائم کرکے بیرونی تسلط کا مقابلہ کرتی ہے اور دوسری قوموں کو اپنے ساتھ لینے کی حتے الامکان کوشش کرتی ہے تاکہ دشمن کے خلاف جتنی آوازیں متحد ہو سکیں اتنا ہی مفید ہے اسی طرح اگر اسمبلی میں جاکر کانگریس کا مقصد آزادی کی منزل کو قریب تر لانا تھا تو ہر اُس جماعت سے وہ اتحاد قائم کرتی جو اپنے مقاصد اور نصب العین میں اُس سے قریب ترین تھی اسکو اقلیت پارٹی کی تمام شرائط منظور کرکے اُسکو اطمینان دلانے میں خود آگے بڑھنا چاہیئے تھا تاکہ سب قومیں ایک ساتھ جمع ہوکر حکومت کا مقابلہ کر سکتیں مگر کانگریس کا جو طرز عمل اس معاملہ میں رہا وہ حد درجہ پست ذلیل اور قابل افسوس ہے۔

ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے مسلم چیف منسٹروں نے اپنے

---

[1] پانیر مورخہ ۲ ستمبر [illegible]

اجنہ میں بعض فرا خدلی سے چند ہندو وزراء کو ہندو پارٹیوں کا نائندہ تسلیم کرتے ہوئے مقرر کیا۔ بنگال میں پہلے کانگریس سے اشتراک عمل کرنے کی کوشش کی گئی مگر ناکام ہونے پر دوسری جماعتوں کے ارکان کو وزارت میں شامل کیا گیا۔ بنگال میں دو اچھوت وزیر پنجاب میں آٹھ میں سے تین اچھوت پارلیمنٹری سیکریٹری مقرر کئے گئے جبکہ کانگریس نے اپنے کسی صوبہ میں کوئی وزیر اچھوت نہیں بنایا۔ آسام میں ایک عیسائی کو بھی کیبنٹ میں لایا گیا پنجاب میں نصف سے زیادہ اور بنگال میں نصف غیر مسلموں کو وزارت میں لیا گیا مگر کانگریس نے اس معاملہ میں بھی نہایت تنگ نظری سے کام لیا۔ اڑیسہ میں ایک مسلمان بھی وزارت میں نہیں لیا گیا اگر مطالبہ کیا گیا تو مولانا آزاد نے (جنکو اسی لئے مسلم وزارتوں کا انچارج بنایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات کا جواب ایک مسلمان ہی دے اور ہندوؤں کو یہ زحمت بھی گوارا نہ کرنی پڑے جسطرح بیورو کریٹک گورنمنٹ کے زمانہ میں حکومت ہندوستانیوں ہی سے ہندوستانیوں کا جواب دلایا کرتی تھی) جواب دیا کہ کوئی قابل آدمی قابل اکال نہیں ہے۔ صوبہ متوسط میں صرف ایک مسلمان وزیر مسٹر شریف کا تقرر کیا گیا مگر مسٹر شریف کو جس صورت سے علیحدہ کیا گیا وہ کانگریس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا کامل ثبوت ہے۔ انہوں نے ایک مسلمان کو جو زنا بالجبر کے جرم میں ایک سال قید محنت کاٹ چکا تھا اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ ادا کر چکا تھا ایک سال قبل میعاد رہا کر دیا۔ جس پر شور مچ گیا تحقیقاتی کمیٹی نے اپنے فیصلہ میں بھی یہ تسلیم کیا کہ وزیر کو اسکا پورا حق تھا اور وہ شخص بھی یقیناً قابل رحم تھا اسکو پہلے ہی کافی سزا مل چکی تھی مسٹر شریف کی دیانتداری اور خوش نیتی پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا مگر صرف

اس جرم میں کہ یہ انصاف کا غلط استعمال تھا ان کو استعفا دینے پر صرف اسلئے مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمان تھے ورنہ بہت سے صوبوں میں ڈکیتی اور تشدد کے قیدیوں تک کو سیاسی قیدی بناکر چھوڑ دیا گیا اور کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔ خود مسٹر شکلا نے سی۔ پی کا وزیر اعظم ہوتے ہی فسادات جبلپور کے ملزموں کو رہا کر دیا (مدینہ ۱۸ اگست ۱۹۳۸ء) ڈاکٹر کھرے کے خلاف رشوت، غبن وغیرہ کے الزامات جب کانگریسیوں نے ہی لگائے تھے تو گاندھی نے یہ کہکر معاملہ ٹال دیا تھا کہ کانگریس بہرحال معمولی انسانوں پر مشتمل ہے جو ہمہ خوبیوں اور برائیوں دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جنکی نمائندگی وہ کر رہے ہیں۔ بمبئی اور بہار میں صرف ایک مسلمان لیا گیا یو۔ پی میں سات میں سے دو کل صوبوں میں سے ایک میں بھی کسی مسلمان کو وزیر اعظم نہیں بنایا گیا حالانکہ انمیں بعض مثلاً سید محمود وغیرہ تو کانگریس کے اتنی وفادار ہیں جو اس حد تک کانگریسی ہیں کہ وہ ڈونٹی دار لوٹے کے بجاے لٹیا استعمال کرتے ہیں اسلئے کہ لوٹے میں فرقہ وارانہ بو آتی ہے جو ہندوستان میں مذہبی ناموں تک کے مخالف ہیں اور اکبر کی طرح دین الٰہی جیسے مذہب کے قیام کے متمنی ہیں لیکن صرف ایک کمی کی وجہ سے انکو یہ عہدہ نصیب نہ ہوسکا کہ ابھی تک کانگریس نے اتنی وسیع النظری بھی اختیار نہیں کی ہے کہ کم از کم ایسے شخص کو تو مذہبی تعصب سے بری کر دے جو عقائد کے لحاظ سے اور عملی حیثیت سے اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھتا ہو لیکن نام ابھی تک مسلمان باقی ہے۔ پھر ان مسلم وزراء کا تقرر بھی جن جن صورتوں میں عمل میں آیا وہ خود انکے لئے اور عام مسلمانوں کیلئے صدرجہ شرمناک ہے، جو مسلمان کانگریس حکومت میں وزیر

بنائے گئے ان کو مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کرکے یا کسی مسلم پارٹی سے صلح کرکے
نہیں بنایا گیا بلکہ انفرادی حیثیت سے ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ کانگریس کے اقرار
نامہ پر دستخط کریں یعنے ان کو اسکا کوئی حق نہوگا کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت
کی طرف سے کوئی مطالبہ پیش کر سکیں بلکہ کانگریس کے پروگرام کے مطابق ہر کام
انجام دینا ان کا فرض عین ہوگا۔

وزرا کی کابینہ ایک ایسی جماعت ہوتی ہے جسکی تمام کارروائیاں خفیہ
ہوا کرتی ہیں اسلیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ہدایت نامہ میں صاف
بالفاظ ہیں کہ وزارت مرتب کرتے وقت اقلیتوں کی نمائندگی کا [illegible] برابر
رکھا جائے یعنے کابینہ میں ایسے آدمیوں کو حتے الامکان شامل کیا جائے جو
اقلیتوں کی صحیح نمائندگی کرتے ہوں اور ہاؤس میں اقلیتوں کا اعتماد بھی انپر
ہو تاکہ اگر کابینہ میں کوئی مسئلہ ایسا پیش ہو جو ان کی جماعت کے مفاد کے
خلاف ہو تو وہ احتجاج کر سکیں اور اپنی جماعت سے مشورے لے سکیں۔ مثلاً اگر
وزارت ودھیا مندر جیسی تعلیمی اسکیم نافذ کرے اور اسلامی مکاتب جو ابتک قائم
قائم ہیں انکے علحدہ وجود کو ختم کر دیا جائے جیسا کہ اب عنقریب عمل میں آنیوالا ہے
تو ان مسلم وزرا کو جو کانگریس پلج پر دستخط کر چکے ہیں کوئی حق نہیں رہا کہ وہ کسی
جماعت کی طرف سے اسکے خلاف آواز اٹھا سکیں ایسی صورت میں زیادہ سے
زیادہ وہ انفرادی طور سے اپنا اختلافی نوٹ درج کرا سکتے ہیں جو بالکل بیسود
ہے یہ انفرادی حیثیت سے وزرا کے تقرر کا طریقہ اسلیے اختیار کیا گیا کہ دوسری
صورت میں اور جماعتوں کے ساتھ کانگریس کو صلح کرنا پڑتی جسکو کانگریس پہلے

کسر شان سمجھتی ہے۔

مسلم وزراء کے تقرر کے معاملہ میں جو تنگ نظری کانگریس نے دکھائی ہے اسمیں گورنر اور حکومت ہند بھی اتنی ہی ذمہ دار ہے۔ گورنر بمبئی کا یہ ارشاد کہ اقلیتوں کے آدمی کا ہونا کیبنٹ میں ضروری ہے لیکن میں اسکی گارنٹی نہیں دے سکتا کہ وہ آدمی اقلیتوں کا نمائندہ بھی ہو قطعی ہدایت نامہ کی اسپرٹ کے خلاف ہے اور بعض صوبوں میں تو اسپر بھی عمل نہیں کیا جا رہا ہے اسوقت سی۔ پی اور اڑیسہ میں کوئی مسلمان وزیر نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے لائق مصنف کی یہ دلیل سامنے آتی ہے جسمیں اُنھوں نے فرمایا ہے کہ:-

"مسلم لیگ کی تمام توجہ ملکی امور سے ہٹ کر وزارتوں کے حصول میں مبذول اور صرف ہو گئیں، مانا کہ وزارتوں میں حصہ ملنا ایک عمدہ چیز ہے مگر یہ خود مسلم لیگ کے شایان شان نہیں کہ وہ ایسی جماعت سے وزارتیں مانگے جسکا مسلک اور نصب العین اسکے نصب العین سے مختلف ہے، انگلستان میں جہاں کی پارلیمنٹ کی نقل ہندوستان میں کیگئی ہے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ دو مختلف اصول رکھنے والی جماعتوں کے درمیان اس بناء پر جھگڑا ہو سکتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو اپنی وزارت میں شامل نہیں کیا۔"

بدقسمتی یہ ہے کہ ملکی سیاست میں داخلی نظام و انصرام میں برابر کا شریک ہو کر حصہ

سه چند ماہ قبل لیگ پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے گورنر بمبئی نے یہ اعلان کیا تھا [illegible] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۴۲۱

لینا موجودہ جمہوری انقلاب میں دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی وجود کو تسلیم کرا لینا اور آئندہ کے انقلاب کیلئے زمین صاف کر کے اپنی جماعتی بنیاد کو استوار کرنا حصول وزارت کے گمراہ کن اور بادی النظر میں خود فرضی اور جاہ پسندی کے غلط ناموں سے تعبیر کرنے کی ناجائز کوشش کی جاتی ہے سوال محض ایک یا دو وزارتوں کا نہیں ہے جو انفرادی طور سے کسی کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ سوال مسلمانوں کے سیاسی وجود کو جماعتی حیثیت میں تسلیم کرا لینے کا ہے اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے مسلمان حکومت انگلشیہ یا کانگریس کے سامنے دست سوال دراز نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس حق کو اپنی سیاسی طاقت کے ذریعہ منوانے کی جدوجہد کرنا اُن کا عین فرض ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر جھگڑا صرف وزارتوں کے حصول کا ہوتا تو لیگ اور کانگریس میں کشمکش قائم نہ رہتی ابھی حال ہی میں جو صلح کی گفت و شنید صدر لیگ اور زعماء کانگریس کے درمیان ہوئی وہ صاف بتا رہی ہے کہ کانگریس وزارتوں میں تبدیلی کیلئے تیار ہے لیکن لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے سے منکر ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے حصول کیلئے لیگ مصروف جدوجہد ہے نہ کہ محض حصول وزارت کیلئے علاوہ اسکے وزارتوں کے معاملہ میں سوال صرف ستدہی کا نہیں ہے بلکہ داد وستد دونوں کا باہمی تبادلہ ہے اگرچہ صوبوں میں کانگریس لیگ کے نمائندوں کو جگہ دیگی تو پانچ صوبوں میں انشاء اللہ لیگ بھی کانگریس کو وہی مراعات دینے کے قابل ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کی مثال دیکر وہاں کے حالات کا تطابق یہاں کے حالات سے کرنا سیاسی دور بینی کے افلاس کا نتیجہ ہے انگلستان میں بیشک ممکن ہے کہ ایک پارٹی دوسری پارٹی کو

نظر انداز کر کے اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ کے اصول پر عامل ہو کر حکومت پر قبضہ کر لے اسلئے کہ وہاں کی اکثریت یا اقلیت مستقل حیثیت نہیں رکھتی وہاں جماعتوں کی تقسیم سوشل یا اقتصادی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے جو اصولوں کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے لیکن ہندوستان میں جہاں کی اکثریت اور اقلیت مذہبی تفریق کی بنا پر ہیں اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ملک کی مختلف پارٹیاں بالخصوص جو قریب الخیال ہوں آپس میں سمجھوتہ کر کے ایک متحدہ پارٹی بنا کر مخلوط وزارت قائم کریں یہ بالکل ناممکن ہے کہ تمام پارٹیاں ایک ہی پارٹی میں جذب ہو کر اپنے مذہب و کلچر کو ختم کر دیں بالخصوص جبکہ وہ پارٹی کسی خاص فرقہ کی ذہنیت اور اکثریت پر مبنی ہو بقول ایچ جی ویلز پارٹی سسٹم کا طرز حکومت تاریخ سیاست کا سب سے بڑا وہم اور موجودہ ضروریات کے لئے بالکل ناموزوں اور ناکافی ہے اور جو طریقہ کبھی اینگلو سیکشن قوم کیلئے ضروری قرار دیا گیا ہو کوئی ضرور نہیں کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں وہی طریقہ حکومت موزوں اور منصفانہ ہو۔ انگلستان میں بارہا بالخصوص ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں مخلوط وزارتیں مرتب کی گئیں خود کانگریس نے سرحد میں اسی اصول پر عامل ہو کر وزارت مرتب کی اور بنگال میں اسی حصول مقصد کیلئے تمام کوششیں صرف کر دیں لیکن ناکامی ہوئی۔ سندھ میں اسی مقصد کیلئے ابتک کانگریس ریشہ دواں ہے اسلئے یہ کہنا بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک پارٹی کا دوسری پارٹی سے اپنا حق طلب کرنا یا اشتراک عمل کرنا خلاف اصول نظام جمہوری ہے جہاں تک لیگ اور کانگریس کے بعید الخیال ہونے اور اختلاف نصب العین کا تعلق ہے اسپر مفصل بحث آئندہ سطور میں کی جائیگی۔

یو۔پی مسلم لیگ کی ناکام کوشش مصالحت

کانگریس کی صحیح پوزیشن اور اصل شکل یو۔پی کے واقعات سے بے نقاب ہوجاتی ہے۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے فاضل مصنف نے کانگریس اور لیگ کے موجودہ اختلاف کے دو اسباب بتلائے ہیں اور انھیں اسباب کی بنا پر دونوں جماعتوں کو مختلف الخیال جماعتیں ثابت کیا ہے۔ ایک سبب یہ ہے کہ مسلم لیگ نے یکم اپریل کو ہڑتال میں حصہ نہیں لیا دوسرے صدر پارلیمنٹری بورڈ یو۔پی نے ضمنی وزارت میں شرکت اختیار کرلی یہ دلائل بالکل ایسے ہی پُر لطف ہیں جیسے کہ صاحب موصوف نے سود کو جائز ہونے کا فتوے ارشاد کرتے ہوئے فرمائے تھے انھیں واقعات کو کانگریسی علما اپنی تقریروں میں بیان کرکے عوام کو بہکانے کی کوشش کیا کرتے ہیں لیکن خود ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے غلط گمراہ کن اور لچر دلائل ان حضرات کی زبانوں سے نکلتے ہیں جو خود رہنمائے ملت اور ناخدائے کشتی اسلام ہونیکا دعوے کرتے ہیں۔

جہاں تک یکم اپریل کو ہڑتال نہ کرنے کا معاملہ ہے لیگ بالکل حق بجانب تھی اسلئے کہ وہ ہڑتال حقیقت میں نئے قانون کے خلاف نہ تھی بلکہ کمیونل ایوارڈ کے خلاف تھی کانگریس الیکشن سے قبل ہی کمیونل ایوارڈ کو نامنظور کرچکی تھی لیکن لیگ نے منظور کرلیا تھا اور لیگ کے اس فیصلہ سے ہر مسلمان کو اتفاق تھا اسلئے ہڑتال میں حصہ لیکر خود اپنے فیصلہ کی مخالفت کا مظاہرہ کرنا حماقت سے کم نہ تھا دوسرے جب اس قانون پر عملدرآمد کرنے کا ارادہ ہوا اور اسکو موجودہ صورت میں قبول کرلیا گیا تو جہانتک صوبائی حکومتوں کا تعلق ہے تو اس قسم کے مظاہرے اجتماع ضدین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ رہا صدر پارلیمنٹری بورڈ مسلم لیگ کا وزارت

قبول کرنا یہ ایک بہت صاف معاملہ ہے۔ راجہ صاحب سلیم پور نے ضمنی وزارت میں شرکت کر کے بیشک غلطی کی لیکن اسکی ذمہ دار لیگ اسوقت ہو سکتی تھی جب انکے اس اقدام کی تائید لیگ کیطرف سے ہوتی برخلاف اسکے انکے اس اقدام کی فوراً مذمت کیگئی اور انکا استعفار صدارت فوراً منظور کر لیا گیا آجتک وہ لیگ سے بالکل علیحدہ ہیں جسکا حقیقتاً بہت ہی افسوس ہے مسلمانوں کے مفاد کیلئے جتنی خدمات اور ایثار مالی راجہ صاحب نے کیئے ہیں وہ ہمیشہ یاد رہینگے یہ سیاست کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ ایک معمولی لغزش تمام گذشتہ خدمات پر پانی پھیر دیتی ہے لہذا ان دونوں واقعات نے لیگ اور کانگریس میں کوئی اختلاف پیدا نہیں کیا بلکہ برخلاف اس کے یو۔ پی مسلم لیگ نے آخری وقت تک کانگریس سے مصالحت کرنے کی فکر کی انتخابات ختم ہونے کے فوراً بعد لیگ پارٹی نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو یہ تجویز پاس کی کہ "لیگ اسمبلی میں کانگریس کے ہر مفید پروگرام کی تائید کریگی" پھر جب کانگریس نے وزارت مرتب کرنے سے انکار کر دیا اور ضمنی وزارت قائم ہوئی تو لیگ پارٹی کے لیڈر خلیق الزماں صاحب اور نواب اسمٰعیل خانصاحب دونوں نے اس وزارت کی شمولیت سے صاف انکار کر دیا انکے اس مستحسن اقدامات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ لیگ کانگریس سے تصادم نہ چاہتی تھی لیگ پارٹی کے لیڈر نے اپریل سے جولائی تک مصالحت کی ہر ممکن کوشش ختم کر دی لیکن آخر کار ناکامی ہوئی۔

کانگریس نے جو جو شرائط مسلم لیگ کے سامنے پیش کی تھیں وہ حد درجہ ذلیل اور توہین آمیز تھیں بقول مولانا آزاد صاحب وہ شرائط حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مسلم لیگ ایک علیحدہ اور مستقل پارٹی کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔

(۲) مسلم لیگ پارٹی کے ممبر کانگریس پارٹی میں شامل ہو جائیں گے اور مسلم لیگ پارٹی کانگریس پارٹی میں ضم ہو جائے گی۔

(۳) کانگریس ورکنگ کمیٹی کی پالیسی اور احکام و ہدایات کی تمام ممبر پیروی کریں گے۔

(۴) مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یو۔ پی توڑ دیا جائیگا اور آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کوئی اپنا نمائندہ نہیں کھڑا کرے گی بلکہ تمام ممبر جو مسلم لیگ ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں آئندہ کانگریس کے امیدواروں کی تائید کیا کریں گے۔

(۵) کانگریس پارٹی کے ضوابط کی پابندی کریں گے۔

(۶) اگر کانگریس پارٹی اسمبلی سے استعفا دینے کا فیصلہ کرے تو تمام مسلمان ممبر بھی اس حکم پر استعفا دیدینگے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب آگے فرماتے ہیں کہ "یہ امید کی جاتی تھی کہ اگر ان شرائط پر اتفاق ہو گیا اور مسلم لیگ پارٹی کے ممبران اسمبلی کانگریس پارٹی کے ممبر بنگئے تو مسلم لیگ پارٹی ایک علٰحدہ گروپ کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی صوبائی کابینہ وزارت کی ترتیب میں ایسی صورت میں یہ مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ ان کو کچھ نمائندگی ملنی چاہیئے"۔

لیگ نے مندرجہ بالا چھ شرائط کو تسلیم کر لیا لیکن صرف ایک شرط رکھنی چاہی کہ جہاں تک کمیونل اداروں، زبان اور مذہب کا تعلق ہے مسلم لیگ کے ممبران آزادی سے بہ حیثیت جماعت کے رائے دے سکیں گے مگر جواہر لال صاحب

اسوقت اپنی جماعتی مطلق العنانی میں اسقدر سرشار تھے کہ انھوں نے اس شرط کو
بھی اسلئے منظور نہیں کیا کہ اس طرح مخلوط وزارت کے قائم ہونے کا امکان نکلتا تھا
اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو بلا شرط حوالہ کردیں آخر کار چودھری صاحب
کو بصد ہزار افسوس اعلان کرنا پڑا کہ جو گفت و شنید آج سے تین ماہ پیشتر شروع ہوئی
تھی ۲۰ر جولائی کو اسطرح ناکام ثابت ہوئی اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میں ایک ناممکن
چیز کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا تھا یوپی لیگ پارٹی کا اتنا گر کر صلح کی کوشش
کرنا اور کانگریس کا ٹھکرا دینا مسلمانان ہند کیلئے باعث عبرت ہے یہی پارٹی ڈکٹیٹر
شپ کا بھوت تھا جس نے کانگریس کو اس متکبرانہ طرز عمل کے اختیار کرنے پر
مجبور کیا تھا نہ کہ وہ معمولی بھر دلائل جنکو "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں دکھایا گیا ہے
واقعہ صرف یہ تھا کہ انتخابات عام سے پہلے کانگریس کا اندازہ تھا کہ بعض
صوبوں میں بالخصوص یوپی میں بغیر لیگ پارٹی کی مدد کے وزارت مرتب نہو سکیگی
اسلئے دوران انتخابات میں لیگ سے گفت و شنید جاری رکھی گئی وہ اشتراک عمل
بھی محض عارضی اور مجبوری حالت میں تھا اسلئے کہ ہندوستان بھر میں کہیں بھی
کانگریس کو مسلمانوں میں کامیابی کی امید نہ تھی اسلئے وہ لیگ کے ساتھ بظاہر
اشتراک عمل کر رہی تھی اگرچہ بعض مقامات پر اپنے امیدوار بھی کھڑے کردیے گئے
تھے یوپی میں تقریبا سترہ آدمیوں کو لیگ کے مقابلہ میں کھڑا کردیا تھا بالخصوص لکھنو
میں عورتوں کی نشست پر تو بہت زبردست مقابلہ ہوا لیکن کانگریس کو ہر جگہ
شکست کھانی پڑی مگر الیکشن کی غیر متوقع کامیابی نے کانگریس کو یکسر نازی
اور فیسسٹ پارٹی میں بدل ڈالا اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ کے نشہ نے اسکو مدہوش

کر دیا جسکا اظہار الیکشن کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا جس نے رفتہ رفتہ لیگ اور کانگریس کو دشمنوں کے مختلف کیمپ میں تقسیم کر دیا "پارٹی ڈکٹیٹر شپ" ایسی لعنت ہے جسکی موجودگی میں دوسری پارٹیوں سے گفت و شنید کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اسلئے اُس زمانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مسولینی اور ہٹلر کی طرح خواب دیکھنے شروع کئے (اگرچہ اس طاقت کی ایک جھلک بھی انکے پاس نہ تھی) اور پھر دوسری پارٹی کو چڑھے ہوئے تیوریوں سے دیکھنا شروع کیا اور بین الملی مفاہمت کے بجائے "پارٹی ڈکٹیٹر شپ" اصول بنگیا اور کلکتہ میں ایک تقریر میں فرما دیا کہ "اسوقت ملک میں دو جماعتیں ہیں ایک کانگریس دوسرے انگریز ہر تیسری جماعت کو کسی ایک نہ ایک جماعت میں مدغم ہو جانا چاہیئے" یعنے اگر آٹھ کروڑ مسلمان کانگریس میں شامل نہوں اور علیحدہ جماعت قائم رکھ کر بھی انگریز سے جنگ کریں تو بھی انکا کوئی وجود نہیں ہے۔

اصل میں ان کی یہ تقریر جنگ کا الٹی میٹم تھا اور مسلمانوں کیلئے خطرہ کی گھنٹی تھی اب ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کا سیاسی وجود خطرہ میں ہے اسکے بعد پھر پنڈت جواہر لال نے ایک تقریر کے دوران میں کہہ ڈالا کہ "ہزار جناح اور ہزار لیگ ہمارے راستہ میں روڑے اٹکائیں مگر ہم آزادی کی طرف بڑھتے جائیں گے" اُس زمانے میں کانگریس کے موجودہ صدر (جو اُسوقت مجوزہ صدر تھے) مسٹر سوبھاش چندر بوس دانتا میں مقیم تھے اٹلی اور جرمنی کی استبداد سے بھری ہوئی حکومتوں کی سیر کر کے واپس آئے تھے اور مطلق العنانی کے نظارے اُنکے دماغ میں تھے اُنھوں نے اُس ہی زمانے میں حسب ذیل بیان اخبار میں دیا جو کانگریس کی اصل شکل کو سامنے لانے

میں بہت معاون ہوتا ہے :۔

"اتحاد کے غلط خیال کو ہمیں خیرباد کہنا چاہیئے جنگ جیتنے کے بعد سیاسی طاقت سے دستبرداری کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا کانگریس کی فتح کے بعد کانگریس کو توڑ دینے کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا "پارٹی ڈکٹیٹر شپ" سوراج سے پہلے اور سوراج کے بعد ہر دو حالتوں میں اب آئندہ کیلئے ہم لوگوں کا نعرہ اور آواز ہوگا"[1]

ہمارے کانگریس زدہ مسلمان اسکو بغور پڑھیں اور یہ سمجھ کر پڑھیں کہ یہ اُس شخص کا بیان ہے جنکو صدر بنانے کیلئے تمام ہندوستان کے ہندو بے چین تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد تک کو ان کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے اپنا نام واپس لینا پڑا تھا، یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے کلکتہ کارپوریشن میں مسلم حقوق کی سخت مخالفت کی تھی اور جسکے جواب میں مسٹر داس نے سوراج پارٹی سے استعفا دینے کی دھمکی دی تھی جنھوں نے ۱۹۲۳ء میں اتحاد کانفرنس کلکتہ کی تجویز کے متعلق گلے کی قربانی کی سخت مخالفت کی تھی لیکن افسوس پارٹی کی طاقتیں؛ اصول سیاست اور "بلا شرط" حوالہ کی دھمکیاں صرف مسلم لیگ کیلئے تھیں یوپی میں لیگ کی ایک شرط کو بھی تسلیم نہ کیا گیا اور ایک سے کہیں زیادہ شرائط کے سامنے سر جھکا کر سرحد میں ایک پارٹی کے نہیں بلکہ دو پارٹیوں "انڈی پینڈنٹ" اور "ڈیماکریٹک" سے صلح کر کے اور اُنکے وجود کو علٰحدہ قائم رکھتے ہوئے وزارت قائم کرلی جو انشاءاللہ عنقریب لیگ کے قبضہ میں آنے والی ہے مسلم لیگ کو ایک طرف فرقہ وارانہ

---

[1] منقول از خطبہ صدارت استقبالیہ مسٹر راغب احسن ایم اے (کلکتہ مسلم لیگ کانفرنس ۱۹۳۷ء)

جماعت کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے احتراز کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہندو مہا سبھا کے ساتھ ہر صورت سے یک جہتی اور ہم آہنگی برتی جا رہی ہے اور آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا کے متعدد عہدہ دار کانگریس کے عہدہ دار ہیں۔ صوبہ بہار میں بابو جگت نرائن لال صاحب سکریٹری آل انڈیا ہندو مہا سبھا کانگریسی وزارت میں پارلیمنٹری سکریٹری ہیں۔ صوبہ بنگال میں ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نائب صدر آل انڈیا ہندو مہا سبھا بنگال کونسل میں کانگریس پارٹی کے لیڈر ہیں حالانکہ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے آل انڈیا ہندو ویدک (یوتھ) کانفرنس لاہور کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبہ میں اعلان کیا تھا کہ:۔

"ہندوستان کو تھیوری اور پریکٹس دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کی کلچر ہندو اور جسکا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو"

صرف یہی نہیں بلکہ اصولی حیثیت سے بھی ان دونوں جماعتوں میں کوئی فرق نہیں رہا ہندو مہا سبھا کی طرح کانگریس بھی مسلمانوں کی علحدہ حیثیت کو گوارا نہیں کرتی اور فرقہ وارانہ سوال ہی کو خارج از بحث سمجھتی ہے بھائی پرمانند کا وہ خط جو انھوں نے گذشتہ سال پنڈت جواہر لال کو لکھا تھا اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ علاوہ ان متعدد تقریروں اور تحریروں کے جو کانگریس اور ہندو مہا سبھا کے پلیٹ فارموں سے نکلتی رہتی ہیں:۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کانگریس بھی ہندو مہا سبھا کے اس اصول کا اقرار کر رہی ہے کہ نہ کوئی مسئلہ اقلیات ہے اور نہ اسکے حل کرنے کی ضرورت ہے

"نہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے اور نہ فرقہ وارانہ مفاہمت اور معاہدہ کی ضرورت ہے"

دونوں جماعتوں کا مقصد ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا قیام ہے بعض
اوقات ہندو مہا سبھا کانگریس کی فوج کا کام کرتی ہے جب کبھی کانگریس کو
ہندو مسلم سمجھوتے کا کام کرنا ہوتا ہے تو ڈاکٹر مونجے اور پرمانند پردہ سے
باہر نکلکر گاندھی جی اور کانگریس کو چیلنج کرنے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کی نمائندگی
کا ان کو کوئی حق نہیں ہے اور آخر کار کانگریس انکے اعلانات کا لحاظ کرکے خاموش
ہو جاتی ہے جب کبھی مسٹر جناح یا کسی دوسرے مسلم لیڈر نے کانگریس کی
مخالفت کی تو مسٹر ساورکر بھی اسکی ظاہری مخالفت پر اتر آتے ہیں تاکہ عوام یہ کہہ سکیں
کہ دونوں کی مخالفت فرقہ وارانہ حیثیت کی بنا پر ہے۔

دونوں جماعتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ بقول مسٹر جناح "ہندو
مہا سبھا جس چیز کو صاف صاف اور کھلم کھلا کہتی ہے کانگریس اسی کو چھپا چھپا کر
کہتی ہے" ہندو مہا سبھا جس کام کو ہندوؤں کے نام سے کرتی ہے کانگریس اسی
کو ہندوستانیوں کے نام سے انجام دیتی ہے کانگریس رابطہ مسلم عوام (مسلم
ماس کنٹیکٹ) کے ذریعہ مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کو ہندو تہذیب میں "قومیت"
کے لباس میں ختم کر سکتی ہے اسمبلیوں میں پارٹی سسٹم کی رو سے وزارت بنا سکتی
ہے اور اسکو قومی وزارت کہہ سکتی ہے لیکن ہندو مہا سبھا ایسا نہیں کر سکتی نہ اپنے
نمائندوں کے متعلق یہ دعوے کر سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے بھی اتنے ہی نمائندے
ہیں جتنے ہندوؤں کے۔ ہندو مہا سبھا کے کسی رکن کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی
جسطرح کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک ممتاز رکن ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیا کہہ سکتے ہیں

"یہ ایک مشتبہ امر ہے کہ آیا مسٹر جناح اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہیں جسطرح مہاتما گاندھی پوری ہندوستانی قوم کی طرف سے بول سکتے ہیں کل سے اپنے جز پر آپ سے آپ مشتمل ہوتا ہے مہاتما گاندھی جو کل کے نمائندے ہیں اسلئے وہی اس جز کے مفاد کا بھی تحفظ کرتے ہیں جس کی نمائندگی مسٹر جناح کر رہے ہیں[1]"

اسطرح کانگریس ہندو مہاسبھا سے بھی زیادہ مسلمانوں کیلئے سخت خطرناک اور مضر ہے

کانگریس کا دور حکومت | زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی (اقبالؒ)

جو لوگ اپنی خداداد عقل و بصیرت سے کام لے سکتے ہیں اور خس و خاشاک کے اس انبار کی طرح نہیں ہیں جو ہوا کے رخ کی طرف اڑنے اور سیلاب کی ہر تیز موج کے ساتھ بہنے لگتا ہے جسکے متعلق علامہ اقبال نے خوب فرمایا ہے ؎

یہ دھر کہن کیا ہے انبار خس و خاشاک | مشکل ہے گذر اسمیں بے نالۂ آتشناک

وہ کانگریس کے قلیل زمانہ حکومت سے معلوم کر سکتے ہیں کہ پانی کا بہاؤ کس طرف کو ہے وزارت کی ان کرسیوں کو کہاں تک آزادی کی منزل قریب تر لانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے اور کانگریس کی وہ انقلابی ذہنیت کہاں دفن ہو گئی جسکے بلند بانگ دعوے ہمیشہ کئے گئے۔ کانگریسی حکومت پر معمولی تبصرہ بالکل واضح کر دیتا ہے کہ کانگریس نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے برطانوی آقاؤں کے احکامات کی تعمیل میں مصروف ہے اور انھیں احکامات کی نقل کرنا اسکا شعار ہو گیا ہے جس پر

---

[1] ٹریبون یکم مئی ۱۹۳۸ء

دو سال پہلے تک سخت نکتہ چینیاں کی جاتی تھیں۔

گذشتہ عام انتخابات میں کانگریس نے اور بالخصوص صدر کانگریس نے اپنی متعدد تقریروں میں یہ شکایت کی تھی کہ بیوروکریٹک حکومت کے وزرا انتخابات میں اپنی پارٹی کی تائید کرتے ہیں اور حکومت کا دباؤ ڈالکر عوام کو متاثر کرتے ہیں لیکن حکومت آجانے کے بعد کانگریس نے انتخابات میں جو طرز عمل اختیار کیا وہ صد درجہ شرمناک ہے، بالخصوص حافظ ابراہیم صاحب کے بجنور کے الیکشن میں وہ سب کچھ کیا گیا جس کی ہمت گذشتہ بیوروکریٹک گورنمنٹ کو بھی نہوئی تھی یو۔پی کے وزرا، پارلیمنٹری سکریٹری، بہار کے اسپیکر اور وزیر تعلیم مع اپنے سرکاری اسٹاف کے عوام کی ذہنیت کو مرعوب کرنے کیلئے ہر قسم کا انتخابی کام انجام دینے میں مصروف تھے جلوس کے ساتھ آنریبل وزیر مالیات یو۔پی کی سواری مع سب انسپکٹران اور حکام کے ماتحت نکلتی تھی عجیب لطف یہ تھا کہ خود وہ امیدوار جو انتخاب کی مہم میں مقابلہ پر تھا۔ وزارت کی تلوار ہاتھ میں لیکر مقابلہ سے پہلے اپنی اخلاقی شکست تسلیم کر چکا تھا جن آنکھوں نے اس الیکشن کا تماشہ دیکھا ہے وہ اقبال کے اس شعر کی اصلیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ٹھیکوں اجارہ داریوں کی دھمکیاں، پٹرول اور تانگہ والوں کے لائسنس کی ضبطی کے ڈراوے، غرضکہ وہ سب کچھ جو اس حکومت میں ہو سکتا ہے جسکی بنیاد استبداد اور استعمار پر قائم ہو وہ وہاں تھا اسکے بعد کے انتخابات میں بھی "اقوام غالب" کی جادوگری اور "حکمران کی ساحری" کے نظارے خوب دیکھے گئے۔ سہارنپور کے الیکشن میں

تو جواہر لال نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر بدتمیزی سے کام لیا تو لاٹھی چارج کرا دیا جائے گا۔

ان انتخابات میں جدید قومیت کے نو ایجاد مگر بڑے مہلک حربات کو بھی دیکھا۔ کانگریس جھنڈوں پر بجائے چرخے کے "اللہ اکبر" لکھا دیکھا گیا کانگریسی علماء کی تقریروں میں تین چوتھائی حاضرین میں ہندوؤں کو دیکھا گیا جو مسلمانوں سے زیادہ باآواز بلند اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے اور انھیں علماء کی زبانی گالیاں کھا کر خوش ہوتے تھے اسلئے کہ وہ گالیاں سادہ لوح مسلم عوام کے لئے دام پُر فریب سے کم نہ تھیں[1]۔ یہ تمام واقعات خود بخود بتا رہے تھے کہ ؎

دستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے
وہی فطرت اسد اللہی، وہی مرحبی وہی عنتری

الیکشن کے وقت کہا گیا تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ بند کر دیا جائیگا ۱۲۴ الف کرمنل امنڈ منیٹ ایکٹ کو منسوخ کر دیا جائیگا سیاسی حلقوں میں سے سی آئی ڈی ہٹا لیجائیگی مالگذاری کم کر دیجائیگی لیکن ان سب پر عمل کس طرح کیا گیا مالگذاری میں تخفیف کے بجائے اضافہ کی فکر ہے حالانکہ دو سال قبل یو پی کانگریس نے ۵۰ فی صدی تخفیف کا مطالبہ کیا تھا ۱۴۴ اور ۱۲۴ الف کا نفاذ پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ عمل میں لایا جا رہا ہے اب کرفیو آرڈر معمولی بات ہے خود اپنی جماعت کے مخالف گروپ یعنے سوشلسٹوں کے منہ بند کرنے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ مزدوروں کی

---

[1] اس سلسلہ میں تیج اخبار کا وہ کارٹون بھی قابل درس ہے جسمیں مسلم لیگ کی بجنور الیکشن میں شکست کے بعد اسلامی جھنڈے کو جسپر اللہ اکبر لکھا تھا سرنگوں کیا گیا اور کانگریسی جھنڈے کو بلند۔

حمایت میں سب کچھ کہا جاتا ہے کانگریس کو کسانوں اور مزدوروں کی جماعت کہا جاتا ہے لیکن احمد آباد اور کانپور میں مزدوروں کے ساتھ اُسی طرح تشدد سے کام لیا گیا جسطرح پہلے ہوتا تھا گولی بھی چلائی گئی گرفتاریاں ہوئیں اور لاٹھی چارج تواب معمولی بات ہوگئی ہے اسلئے کہ پہلے اس قسم کی حرکتوں پر شور مچ جاتا تھا اور مہینوں تک حکومت سے جواب طلب کئے جاتے تھے مگر اب خود پنڈت جواہر لال ایسے موقعوں پر تشدد کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ گاندھی جی ہریجن ۱۲ اگست ۱۹۳۸ء میں صاف اور واضح الفاظ میں تشریح کر دیتے ہیں کہ "کارخانہ داران کے خلاف پولیس کی امداد کرنے میں اور کانگریسی حکومت ایسی مدد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہوگی" اب شولاپور میں متعدد آدمیوں کو گرفتار کر کے ایک شخص کو تازیانے کی سزا ایک دیجاتی ہے۔ مسٹر باٹلی والا پر مدراس میں بغاوت کا مقدمہ چلایا جاتا ہے مدراس میں ہندی زبان سے ناراض باشندوں پر اسی طرح سختیاں کی جارہی ہیں سی آئی ڈی کا تقرر مسلم لیگ کے جلسوں میں اسیطرح جاری ہے جسطرح پہلے کانگریس کے جلسوں میں ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کے خاص خاص آدمیوں مثلاً حسرت موہانی صاحب کی نقل و حرکت کے جانچنے کیلئے ہر وقت سی آئی ڈی کے آدمیوں کا تقرر موجود ہے، سول لبرٹی اور پریس کی آزادی کے نام سے کتنا شور مچایا گیا تھا مگر اب مسلمان اخبارات کا روزانہ گلا گھونٹا جا رہا ہے باوجود (Popular Govt) کے دعوے کے اپنی مخالفت میں ایک آواز کا سننا بھی گوارا نہیں اسٹار الہ آباد کے ایڈیٹر کو حال ہی میں چھ ماہ قید محنت کی سزا دیگئی اور ایسی سزاؤں کے لئے "ہز مجسٹی کے دو فرقوں میں نفرت پیدا کرنے" کا وہی پرانے الزام کا حربہ اختیار

کیا جاتا ہے، اخبار الناظر آگرہ سے ضمانت طلب کی گئی جو بند ہو گیا مہاشہ
عبد الکریم کا رسالہ معلومات جو تبلیغ اسلام کے متعلق تھا اسی ضمانت پر بند ہو گیا
کانگریس کی اس قلیل مدت حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ حکومت اور ہندو عوام
نے ملکر جو مظالم کیے وہ کانگریس کے دامن پر ایک بدترین دھبہ ہیں ان مانے
میں کانگریسی صوبوں میں جتنے ہندو مسلم فسادات ہوئے وہ شدھی اور سنگٹھن
کی تحریکوں کے زمانے میں بھی نہیں ہوئے تھے اب فسادات اسلئے ہیں کہ
آجکل ایک معمولی سے معمولی ہندو چپڑاسی بھی اپنے آپ کو حاکم اور مسلمان کو
محکوم سمجھتا ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں گاؤکشی اور اس قسم کی دوسری رسوم
کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا اب وہ پہلی سی بغیر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلے
ہوئے لطف نہیں اٹھا سکتا اور یہ ذہنی انقلاب کانگریس نے قصداً پیدا کیا ہے
وزیر اعظم مدراس کا یہ اعلان کہ کانگریس کے ہر والنٹیر کو اپنے تئیں وزیر سمجھنا چاہیے
اور وزیر کی ذمہ داری میں ہاتھ بٹانا چاہیے" اور یو پی کانگریس حکومت کا یہ
سرکلر کہ مقامی حکام ضلع کانگریس کمیٹیوں سے مقامی معاملات میں مشورہ کیا
کریں اور انپر اعتماد کریں" ان ذہنیتوں کے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں پھر مسلمانو
پر ان کے ہاتھوں مظالم کا ہونا کون تعجب کی بات ہے یہ اسی سرکلر کا نتیجہ ہے
کہ عدالتی مقدمات تک میں کانگریس کمیٹیاں مداخلت تک کرتی ہیں اور حکام پر
اپنا اثر ڈالنا چاہتی ہیں۔ ابھی ۲۴ ستمبر کو الہ آباد ہائیکورٹ نے فتحپور کی منڈال
کانگریس کمیٹی کے صدر اور سکریٹری کو اکیس روز کی سزا محض اس جرم میں دی ہے
جو ہزاروں واقعات میں سے ایک واقعہ ہے مثال کے طور پر چند خاص واقعات کا

مختصر تذکرہ بیان کیا جاتا ہے۔
ضلع لکھنؤ میں خان بہادر احمد حسین صاحب رضوی کے باغ کو ایک رات کے اندر اُجاڑ کر کھیت میں ہل چلا دیے گئے تاکہ ہر کاشتکار اپنی اپنی زمین پر قبضہ کرلے۔
ضلع گورکھپور میں تین عورتوں اور ایک بچہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے جلا دیا گیا۔ پولیس نے تفتیش کے بعد چند ہندوؤں اور صدر کانگریس پنڈت صاحب دوبے کو گرفتار کیا۔[1] واردی ضلع بلیا میں کانک پور نمائش مویشیان کے موقع پر تین سے دو ہزار ہندوؤں نے مل کر "کانگریس کی جے" اور "مہاتما جی کی جے" کے نعروں میں کیے جسمیں کئی سو مویشیوں کو چھین لیا گیا اور بیشمار آدمیوں کو زخمی کیا گیا جسمیں سے دو یا تین اسیوقت مر گئے اس حملہ کی منظم سازش پہلے سے کی گئی تھی جسکا اعتراف خود گورنمنٹ کانگریس نے کیا ہے (وحدت ۱۹ دسمبر ۳۸ء)
ایک ہندو مجمع نے تین مسلمان عورتوں کو گاجیا کول ضلع گورکھپور میں قتل کر ڈالا (وحدت ۹ ۲ نومبر ۳۸ء)
موضع بہرا مندل ہلکہ ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ایک مشتعل مجمع نے نماز عید بھی نہ ادا کرنے دی پولیس نماز کا وقت گذر جانے پر پہونچی۔ (وحدت ۱۱ دسمبر ۳۸ء)
مسجد موضع دوباری میں خاص عید الضحیٰ کی فجر کو سور کاٹ کر ڈالدیا گیا جسکی وجہ سے نماز فجر اور نماز عید بھی ادا نہو سکی۔ (وحدت ۱۹ فروری ۳۸ء)
عید الضحیٰ کے موقع پر ہندوؤں اور کانگریس حکومت نے جو مظالم مسلمانوں پر

---

[1] انقلاب لاہور ۲۲ دسمبر ۳۷ء

کئے وہ صدر درجہ عبرتناک ہیں۔ گورکھپور میں محلہ نخاس آباد میں باوجودیکہ مسلمانوں نے عدالت دیوانی سے گلئے کی قربانی کے حق کی ڈگری لے لی تھی مگر دفعہ ۱۴۴ نافذ کرکے قربانی بند کر دیگئی اسکی عدم تعمیل میں تین سو مسلمانوں کو گرفتار کرکے سزائیں دیگئیں اور جن مسلمانوں نے قربانی کی ان کو چھ ماہ کی سزا دیگئی۔

دیوریا ضلع گورکھپور میں ہندوؤں کی ایک مسلح کثیر جماعت نے مسلمان قصابوں پر حملہ کیا۔ ۴۰ راس گائیں لوٹ لیں اس واقعہ پر مسلم لیگ کی طرف سے تحریک التوا پیش کیگئی تو اسکو رد کر دیا گیا۔ اسیطرح بلیا کے معاملہ اور گورکھپور کی گرفتاریوں کے معاملہ میں بھی تحریک التوا کی اجازت نہیں دیگئی۔ بہار میں بعض مقامات میں ابتک ۱۴۴ کا نفاذ ہے اور گاؤکشی بند ہے اسپر وہاں کے مسلم لیگ کے ممبران نے تحریک التوا پیش کرنا چاہی مگر اجازت نہ ملی اسپر تمام مسلم ممبران اسمبلی چھوڑکر باہر آگئے۔

بہار میں ہزاری باغ میں جو مظالم مسلمانوں پر کئے گئے اور جس طرح حسب اطلاع اسٹار آف انڈیا سور کا گوشت کاٹ کر مسلمانوں کے منہ میں دیا گیا وہ اس مہذب زمانے میں کانگریس کی پوری شکل سامنے رکھ دیتا ہے وہاں اور بجنور کے ضلع میں مسلم عورتوں کی بے حرمتی کیگئی مصطفےٰ آباد ضلع اعظم گڈھ میں قربانی کو روکنے کیلئے عید الضحےٰ سے قبل ہی حفظ ما تقدم کے طور پر گاؤں کے تمام مسلمانوں کو جیل بھیجدیا گیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے خود جاکر حالات معلوم کئے اور یوپی کے افسران حکومت کو اطلاع دی۔ سیتاپور کے ایک موضع میں تمام مردوں کو اسیطرح جیل بھیجدیا گیا اور جب عورتوں نے بعد میں

قربانی کی تو آٹھ عورتوں کو بھی جیل بھیجدیا گیا۔ ضلع سیتا پور موضع ہپرادیگا نواں میں چار ہزار مسلح ہندوؤں نے مسلمانوں کے گاؤں پر حملہ کیا تمام گاؤں اور شکر کی فصل کو جلا کر خاک کر دیا گیا کثیر تعداد میں مسلمان مجروح ہوئے لیگ کے ذمہ دار اصحاب نے جاکر خود تفتیش کی اور حکام صوبہ کو مطلع کیا۔ میرٹھ میں نوچندی کے موقع پر توہین آمیز تصانیف موسومہ "اللہ میاں کی چالوں کا نمونہ، گیا سٹک محمدی کالے پالک بیٹے کی بہو سے بیاہ" ہندوؤں نے فروخت کرکے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا لیکن حکومت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

گاؤں سدھار کے سلسلہ میں یوپی میں تقریباً نوسو ملازمتیں دی گئیں جن میں سے مسلمانوں کو بمشکل تمام سو بھی نہیں دی گئیں۔

کانگریسی صوبوں میں صرف ایک صوبہ کی خونی داستان کا یہ ایک مختصر ورق ہے پورے مظالم کی داستان آل انڈیا مسلم لیگ کی مقرر کردہ پیرپور تحقیقاتی کمیٹی نے مرتب کی ہے جس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی وہ رپورٹ عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ابھی تک ہندوؤں کے مظالم کی فہرست طلب فرمارہے ہیں اور ان تمام دلشکن واقعات کے باوجود بھی وہ اور اُن کی پارٹی کے تمام کانگریسی مسلمان "ابوالسکوت" بنے بیٹھے ہیں۔

ٹانڈہ کا خونی واقعہ جہاں آخری ہفتہ اگست میں بے قصور اور پرامن مسلمانوں کے مجمع پر پولیس نے گولیاں چلائیں اور ستر سے زائد مسلمانوں کو زخمی کیا جن میں سے بعض اموات بھی ہو چکی ہیں جلیانوالہ باغ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مولانا حسین احمد

صاحب کے بیان مورخہ ۹ ہر اگست کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک کیا گیا مسجدوں میں گھسکر گرفتاریاں کی گئیں داڑھی پکڑ کر مسلمانوں کو کھینچا گیا اور پیروں میں رسی باندھ کر گھسیٹا گیا ۱۶۲ مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا آجتک کوئی سزا مجسٹریٹ کو نہیں دیگئی مولانا حسین احمد صاحب نے ان حالات کا بچشم خود معائنہ کیا ہے لیکن پھر بھی کانگریس حکومت کے خلاف آجتک کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی اور نہ صوبہ کانگریس سے استعفا دینے کی جرأت کی ۔

اسکے مقابلہ پر ان مسلم صوبوں کے حالات پر بھی غور کیجئے جہاں ہندو مسلم فساد کیا معنی، کسی شخص کی نکسیر تک نہیں پھوٹی ۔ بنگال کے وزیراعظم آنریبل مسٹر فضل الحق نے اپنے خطبہ صدارت استقبالیہ اسپشل اجلاس کلکتہ میں بالکل صحیح اور بجا طور پر تحریر کرتے ہوئے فرمایا تھا :—

"کانگریسی صوبوں میں جو طوفان بد تمیزی برپا ہے اور مسلمانوں سے آئے دن جو وحشیانہ سلوک کیا جارہا ہے اس کے مقابل میں ہمارے صوبہ کو دیکھیے کہ یہاں نہ فرقہ وارانہ لڑائی ہے نہ متعصبانہ بلوہ، وہاں آئے دن خون خرابے ہوتے ہیں یہاں ابتک کسی کی نکسیر نہیں پھوٹی، وہاں مسلمان خوف و ہراس کی زندگی بسر کر رہے ہیں یہاں ہندو آرام و آسائش اور طمانیت سے لطف اندوز ہیں، وہاں مسجدوں میں سور پھینکے جاتے ہیں اور ملزمین کا پتہ نہیں چلتا یہاں علانیہ صبح و شام سنکھ پھونکے جاتے ہیں، پوجا پاٹ کیا جاتا ہے ۔ اور اگر کسی نے مندر کی طرف گرم نگاہ سے دیکھ لیا تو فوراً اسے قرار واقعی سزا دیجاتی ہے "

بہرحال کانگریسی حکومت کے ان مظالم کے اعادہ سے مسلمانوں کو مشتعل کرنا منظور نہیں ہے ۔ بلکہ ایک طرف کانگریس کو ایک بہی خواہ دوست کی حیثیت سے ان خطرات سے آگاہ کرنا ہے جو ایسے استبداد و استعمار سے بھرے ہوئے طریقوں کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو آئندہ کیلئے ان خطرات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ مظالم انکے لئے نشتر قدرت کا کام کر رہے ہیں ۔ ؎

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا یہ بہترین پیام ہے ان کیلئے اب کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا سوائے اسکے کہ وہ مکمل طور سے اپنی تنظیم کریں اور کسی سے جنگ کیلئے نہیں بلکہ اپنی مدافعت اور سیاسی ارتقا کیلئے متحد و متفق و ہم آہنگ ہو جائیں ورنہ پھر اپنی بدقسمتی پر آنسو نہ بہائیں ۔ اللہ کی سنت یہی ہے کہ جو کوئی اپنے آپ کی مدد نہ کرے اسکو آج زمانہ سے حرف مکرر کی طرح مٹنا ہی پڑے گا وہ یہ نہ سمجھیں کہ چونکہ قدرت کو اسلام کی حفاظت منظور ہے اسلئے انکا بقا لازمی ہے ۔ اسپین میں مسلمانوں کے ختم ہونے سے اسلام مٹا نہیں اسیطرح ہندوستان سے اگر مسلمانوں نے اپنے آپ کو ختم کر لیا تو ضروری نہیں کہ اسلام مٹ جائے عجب نہیں یہی سومنات کے پجاری کعبہ کے نگہبان بنجائیں ۔ ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

کانگریسی وزرا کی تنخواہیں اس سلسلہ میں وزرا کی تنخواہوں کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ عوام کو دکھلانے کیلئے کانگریس نے پانچسو روپیہ الاؤنس وزرا کا مقرر کیا ہے ۔ لیکن ہر کام کی طرح اس معاملہ میں بھی کانگریس نے

اپنی عمل پالیسی کا ثبوت دیا۔ چالاکی یہ کی گئی ہے کہ وزرا کی تنخواہ پانچسو روپیہ ماہوار ہے لیکن مکان، موٹر، پٹرول اور مختلف اقسام کے الاؤنس اس مشاہرہ پر مستزاد ہیں جس سے کسی وزیر کو پندرہ سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں پڑتا۔ حال ہی میں محمد اسحاق صاحب ممبر اسمبلی یو۔ پی کے سوال کے جواب میں حکومت نے آٹھ ماہ کے اخراجات کی تفصیل اسمبلی میں پیش کی تھی جو یو۔ پی کے کانگریسی وزرا نے اپنی ذات خاص پر صرف کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

	روپیہ	آنہ	پائی	
آنریبل وزیر اعظم	۱۲۹۳۸	۱۱	۰	مکان مفت سے
آنریبل وزیر لوکل سلف گورنمنٹ	۱۶۹۲۵	۱۱	۰	
آنریبل وزیر مالیات	۱۵۱۰۸	۱	۰	
آنریبل وزیر حافظ ابراہیم صاحب	۱۶۷۰۲	۱۳	۰	
آنریبل وزیر تعلیم	۱۳۳۳۱	۱	۰	
آنریبل وزیر جسٹس	۱۳۷۱۶	۷	۶	مکان مفت سے

یہ جواب میں واضح نہیں کیا گیا تھا کہ پانچسو روپیہ ماہوار مشاہرہ ان اخراجات میں شامل ہے یا نہیں۔ اخراجات سفر ان اخراجات میں شامل نہیں ہیں ابتدا میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ وزرا تیسرے درجہ میں سفر کرینگے تاکہ پبلک کا روپیہ کم صرف ہو۔ گاندھی جی نے اسپر خاص زور دیا تھا مگر کسی وزیر نے اسپر عمل نہیں کیا بلکہ بلا تکلف سیکنڈ کلاس میں بالعموم اور ہوائی جہاز پر گاہے گاہے سفر کیا جاتا ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر آج کانگریسی حکومت کے صوبوں میں ہی ہر طبقے کے لوگ کانگریس سے بدظن ہوتے نظر آرہے ہیں اچھوتوں کی پوری جماعت کے آئے دن مظاہرے کرتی تھی جو

مزدور بالکل غیر مطمئن ہیں۔ بہار میں کانگریس کے صوبہ کے صدر نے استعفا دیکر بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے وہاں وزیر اعظم کی لاش کا جنازہ فرضی حال ہی میں نکالا گیا اور وزارت کے خلاف مظاہرے کئے گئے اور زمیندار اور کاشتکاروں کے باہمی تعلق بھائی وعدوں کی وجہ سے یہاں تک خراب کر دیئے گئے ہیں کہ آئے دن کا ہندوں کے قتل اور ناک کاٹنے کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کھرے اور مسٹر نریمان کے واقعات نے کانگریس کے نوجوان طبقے کو ہائی کمانڈ کی مطلق العنانی کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا ہے لہذا ایک ہی سال میں کانگریس سخت پریشان ہے کہ ابتک تو صرف مسلمانوں ہی سے مقابلہ تھا لیکن اب ہندوستان کا ہر طبقہ دشمنی پر کمربستہ ہے اسکی وجہ صرف ایک ہے کہ کانگریس اسی مغربی جمہوری نظام پر عامل ہو کر اپنے مخالفوں کو دبانا چاہتی ہے جسکے خلاف جنگ کرنیکا اسنے حلف اٹھایا تھا ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — جسکے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

باب دوم

مسلم ماس کنٹیکٹ کا پروگرام

فصل اوّل

مسلمانوں کی قومی حیثیت کو ختم کرنیکا نیا حربہ

کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام — چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرفِ ینسلون

اب سے چند سال قبل تک کانگریس مسلم عوام کی طرف سے بالکل بے خبر اور بے توجہ رہی اگر کبھی مسلم رہنماؤں نے کانگریس کے ذمہ دار ہندو لیڈروں سے کہا بھی تو انہوں نے اسکی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنے دروازہ کو ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف بند رکھا یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے اپنے زمانہ صدارت میں فرمایا کہ میں مسلمانوں کا سو سال تک انتظار کر سکتا ہوں بجائے اسکے کہ انکو رشوت دیجائے گویا مسلمانوں کے چند مطالبات کا منظور کر لینا اُنکے نزدیک رشوت سے کم نہ تھا۔ پھر الیکشن کے بعد وہی پنڈت جی محافظ اسلام بنکر شمشیر اسلام زیب تن کر کے کیوں منظر عام پر تشریف لائے؟ اور کیوں کانگریس سکریٹریٹ میں شعبہ اسلام کے نام سے علیحدہ ایک محکمہ قائم کیا گیا جس کا انچارج ڈاکٹر اشرف کو بنایا گیا؟ کیوں لاکھوں روپیہ مسلمانوں میں کانگریس کا پیام پہونچانے کیلئے ان مذہبی علماء کے "اخراجات سفر" پر خرچ کیا گیا جو دیہات میں جا کر سیدھے سادے مسلم عوام کو مذہبی تقدس اور تکفیر کے فتووں سے ڈرا کر صدر کانگریس کے ہاتھ پر سیاسی بیعت کرنے کی ترغیب دیتے پھرتے ہیں؟

حقیقت روز روشن کی طرح چمک رہی ہے اور صداقت کے آفتاب کی کرنیں جھانک کر بتا رہی ہیں کہ کسی کو شکار کرنے کیلئے یہ دام بچھائے جا رہے ہیں جب انتخابات ۱۹۳۷ء میں ختم ہوئے تو کانگریس ہندوؤں میں سب جگہ کامیاب ہوئی لیکن مسلمانوں میں تمام ہندوستان میں ایک مسلمان بھی کانگریس ٹکٹ پر کامیاب نہ ہو سکا ایسی صورت میں کانگریس کے پاس کوئی چارہ کار

نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت سے اشتراک عمل کرنے پر مجبور ہو۔ اس سے
پہلے برابر ایسا ہوتا آیا تھا کانگریس نے ۱۹۱۶ء اور بعد میں سائمن کمیشن اور
بعض دوسرے مواقع پر صرف اسلئے مسلم لیگ سے مفاہمت کی تھی کہ مسلمانوں کی
تعداد کانگریس میں بہت کم تھی لیکن اب کانگریس کی ذہنیت بدل چکی تھی فسطائی
[illegible] طرز حکومت کی نئی بنیاد نے پنڈت جواہر لال نہرو کے دماغ کو جنہے
بقول خود پنڈت جی یورپ کے تمام تعصبات کو ہضم کر رکھا ہے "بہت کچھ متاثر
کر رکھا تھا اب وہ بین الملی مفاہمت کے قائل ہی نہ تھے بلکہ جدید قومیت
کے تخیل نے انکو اسقدر سرشار کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے جماعتی حیثیت میں
کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے نہ وہ اُنکے لیڈروں سے گفتگو کرنا گوارا
کرتے تھے اسلئے کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی جماعتی حیثیت قائم رہتی اور
ان کے سیاسی جز کی جداگانہ حیثیت (سیاسی انفرادیت) باقی رہتی اور آئندہ
چلکر یہ جدید قومیت کی تعمیر میں اُنکے خیال میں رکاوٹ پیدا کرتی یہی اصل میں سب سے
بڑا خطرہ ہے جو ہندو مدبرین اور انگریزوں کو لاحق رہتا ہے اور اس معاملہ میں
یہ دونوں امپیریلسٹ طاقتیں ہمیشہ متحد الخیال رہتی ہیں اسلئے پنڈت جی
نے اپنے وسیع تجربے اور سائنس آف پالٹکس کی نئی ایجادات سے ڈیلکر
ایک ایسا حربہ ایجاد کیا جو یقیناً اس گیس سے کہیں زیادہ مہلک ہے جو چین میں
جاپان کے طیارے پھینک رہے ہیں اور ان مشین گنوں اور بم کے گولوں سے کہیں
زیادہ خطرناک ہے جو فلسطین میں معصوم مسلمانوں پر گرائے جا رہے ہیں اسلئے کہ
اس نو ایجاد حربے کا اثر اسقدر فوری اور خطرناک ہے کہ تخریب خود بخود [illegible]

میں آنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ ع صید خود صیاد را گوید بگیر۔

"یہ انھیں نوایجاد حربوں میں سے ایک حربہ ہے جنکو مغربی شیطانوں نے کمزور اور مرعوب قوموں کے نفس ملی اور استقلال قومی کو اپنے اندر ضم کرنے کیلئے ایجاد کئے ہیں کہیں پُرامن نفوذ (Peaceful Penetration) کہیں جابرانہ استیصال واستعمار کہیں تہذیبی ارتداد یا سماجی شدھی، اور کہیں قوم حاکم کی کلچر کا حاکمانہ غلبہ (Cultural supremacy) دوسری قوموں کی ذہنی آزادی اور قومی نظام کو ختم کرنے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ سب ایک ترکش کے مختلف تیر یہ وہی حقیقت ہے جسکو علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

آ بتا دوں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک   سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

یہ اسی ساحری کا نتیجہ ہے کہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو مختلف اوقات میں اپنی تہذیب و مذہب کو ختم کرنا پڑا۔ اسپین کی گذشتہ تاریخ چھوڑیے، روسی مسلمانوں کا ملت اشتراکیہ دہریہ میں ضم ہو جانا، مراکش، الجزائر اور ٹیونس کے اعراب کا جبراً قانون شریعت فرنچ بنجانا، یہ سب کچھ انھیں آلات کے کرشمے ہیں۔

پھر اگر انگریزوں کی سنگینوں کے سایہ میں جبکہ ایک مرتبہ مذہبی شدھی ناکامیاب ہو چکی مسلم ماس کنٹیکٹ کے ہیرو پنڈت جواہرلال مسلمانوں کی روحانی موت (ارتداد) جو عقیدۂ اسلام کے مطابق جسمانی موت سے بھی بدتر ہے کی بنیاد ڈالنے میں سعی فرمائیں تو ہمیں تعجب ہی کیا ہے۔

بدقسمتی سے اس تحریک کو استعمال اسوقت کیا گیا جبکہ کانگریس کے پاس دولت کی فراوانی، جماعت کی مکمل تنظیم اور صدہا ملازمتوں اور عہدوں کی

طاقت تھی جو مسلمانوں کو ایسی حالت میں مرعوب کرنے اور انپر فتح حاصل کرنے کیلئے بہت کافی تھی جبکہ ان کا انتشار اور پریشانی سلئے کمال زوال پر تھی اور ان کا کوئی مضبوط جماعتی نظام نہ تھا۔ جب کانگریس نے صلح کا دروازہ بند کیا تھا اور انفرادی حیثیت سے مسلم لیگ کے ممبران کو پھانسنے کا جال پھیلایا گیا تھا تو مسلمانوں کی حالت عجب کشمکش میں تھی۔

ملت اسلامی کی کشتی ۱۹۳۶ء کے بمبئی مسلم لیگ سشن کے فیصلہ کے بعد بحر سیاست میں ڈالدی گئی تھی اور حسب امید کامیابی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف رواں تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد سمندر کی طوفانی حالت اور سیاست کی پیچیدگیوں کے مدوجزر نے اسمیں ڈگمگاہٹ پیدا کردی اول تو کشتی پہلے ہی سے بوسیدہ اور شکستہ حالت میں تھی پھر ناخداؤں کے باہمی اختلافات اور رزم آرائیوں نے منزل اور بھی دور کردی اور آخر کار کشتی کو ایک ایسے بھنور میں پھنسا کر ڈالدیا جہاں سے نکلنا اگرچہ حقیقتاً مشکل نہ تھا لیکن ناخداؤں کی جدا جدا راہوں کے تعین نے ایک آسان کام کو مشکل بنا دیا تھا۔ سوء اتفاق سے یا اب یوں کہئے کہ حسن اتفاق سے اُسیوقت ایک تیز رفتار خوشنما اور وسیع جہاز نظر آیا جسپر "آزادی" کا لیبل لگا ہوا تھا سہ رنگا جھنڈا لہرا رہا تھا اُسکے ناخدا نہ صرف آپسمیں متحد اور ہم آہنگ تھے بلکہ ایک امیر کی سرکردگی میں ہر حکم کی تعمیل میں سرگرم تھے اُسکے ملاحوں میں سے بہت سے وزیر ہو چکے تھے اور بہت سے حکومت کے مقربین خاص کی صفوں میں شامل ہوئے جاتے تھے اُنکے پاس طوفان بھیا آلات موجود تھے غرضیکہ ساحل پر پہونچنے والے تن آسان مسافر کیلئے اُنکے پاس سب کچھ موجود

تھا پھر کون بیوقوف تھا جو اس بوسیدہ اور فرسودہ کشتی ملت اسلامی میں جو ایک ناقابل عبور گرداب میں پھنسی ہوئی تھی مصیبت برداشت کرتا بالخصوص جبکہ اس خوشنما جہاز والے ناخدا اس کشتی کے مسافروں کو اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہے تھے بلکہ انکے پاس جانے کے صلہ میں انعامات اور اکرامات کی بوچھار بھی کر رہے تھے۔ وزارتیں، عہدے اور ملازمتیں انکے پاس ہر آنیوالے کیلئے موجود تھیں۔ سب سے پہلے انکے دام طمع میں وہی لوگ پھنسے جو پہلے ہی سے ڈر ڈر کر اس کشتی میں سفر کر رہے تھے جو اگرچہ "طوفانوں" پر لچھے دار تقریریں کر سکتے تھے اور ہنسنے اور رلانے کے فن سے خوب واقف تھے مگر "طوفان" کے وقت "جہازرانی" کے فن سے قطعی ناآشنا تھے اسلئے سب سے پہلے وہی لوگ اس جہاز میں سوار ہو گئے۔ انمیں سے بعض اکرام و انعامات کے لالچ میں، بعض غلط فہمیوں کی بنا پر بعض مگر بہت کم، اپنی دیانتداریوں اور جذبہ ایثار کے باوجود، تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کی بنا پر اور دام اعتبار میں پھنسکر اور آزادی کے لیبل کا دھوکہ کھا کر اس جہاز میں جا ملے اور اس بوسیدہ کشتی کو بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ دیا ان سے بارہا کہا گیا کہ اپنی شکستہ کشتی کی تعمیر کیجئے تاکہ اگر خدانخواستہ یہ بالکل ختم ہو گئی تو ان جہاز والوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کر انکے رحم و کرم پر رہنا پڑیگا۔ اگر یہ کشتی پرانی ہے تو حالات کے موافق نئی تعمیر کیجئے[1] ؎

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر"

ان لوگوں کی ایک قلیل جماعت کے چلے جانے سے عام مسافروں میں غلط فہمی پھیلنے

---

[1] الیکشن کے فوراً بعد مسلم لیگ کی حالت بالکل یہی تھی۔

ایک پریشانی ہوئی اسلئے کہ وہ درماندہ کارواں کو درمیان سفر میں چھوڑ کر جا چکے تھے
حضرات اپنے ساتھ تکفیر کی میگزین بھی رکھتے تھے اور بلا کسی لحاظ کے اسکو استعمال
کرتے تھے لیکن قدرت کی نیرنگ سازیاں اور فسوں کاریاں بھی عجیب ہیں۔ اسکو وہ کام
ایک گنہگار مسلمان سے لینا تھا جنکو وہ مذہبی رہنما باوجود اپنے دعوے اجارہ داری
اسلام چھوڑ چکے تھے ایسی کس مپرسی کی حالت میں ایک ناتواں مگر ہمت اور ارادہ کا
قوی، اگرچہ مذہبی عالم نہیں مگر بحر سیاست کا بہترین شناور، جو شغل تکفیر سے ناواقف
لیکن وہ دریا نہنگوں کے تیور پہچاننے والا۔ جسکا نام مسٹر محمد علی جناح ہے اٹھا اور
نہایت اطمینان اور متانت کے ساتھ اعلان کیا کہ گھبراؤ نہیں ؎

ظلمت شب میں دیکھے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا (اقبال)

اس نے باآواز بلند کہا کہ یہ آزادی کا لیبل محض دھوکہ ہے تم دوسروں کے جہاز
میں جاکر اپنی خودداری کو بھینٹ مت چڑھاؤ کشتی اگرچہ پرانی ہے لیکن ہمت
اور کوشش کے آگے دنیا میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے ؎

عجب کیا گر یہ بیڑہ غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں"

اس مرد ازغیب[1] کا اعلان کیا تھا گویا کوچ کا ایک نقارہ تھا ع فسوں تھا
کوئی اسکی آواز کیا تھی۔ اس پریشانی کے وقت۔ بالخصوص جبکہ اس جہاز سے
گولہ باری جھانسی[2] سے شروع ہو چکی تھی۔ کسی کو یہ سوچنے کا موقع نہ تھا کہ کون

---

[1] جھانسی کے الیکشن سے مراد ہے۔

تھا زیادہ مذہبی ہے اور جنت کا زیادہ مستحق، بلکہ مصیبت کے اس نازک دور میں جستجو
کی تھی کہ کونسا ناخدا انکو صحیح راستہ پر لے جا رہا ہے۔ واقعات نے بہت جلد بتادیا
مسٹر جناح کی قیادت کشتی اسلام کیلئے خضر راہ نکلی اور زمانہ نے دیکھ لیا کہ وہی
رسیدہ کشتی خدا کے فضل سے اُس خوشنما جہاز سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ
ہوئے منزل رواں ہے، آج اُس جہاز کا سہ رنگا جھنڈا ٹکڑے ٹکڑے ہوچکا ہے
ور آزادی کا لیبل انھیں نو زارتوں کی بدولت اپنا رُخ بدل چکا ہے۔

یہ ہے مختصر مگر حقیقی تصویر ان دلشکن واقعات کی جو رابطہ عوام کی
تحریک سے ظہور پذیر ہوئے اور واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کا یہ حربہ اگر کامیاب ہوجاتا
ۃ مسلمانوں کی آئندہ سیاسی پوزیشن بالکل ختم تھی۔ یہ مسلمانوں کے جماعتی
نظام کو ختم کرنے کی ایسی مہلک ترکیب تھی جس کی کامیابی کے بعد مسلمانوں کا
سیاسی وجود ہمیشہ کیلئے فنا ہوجاتا۔

ہندو مہاسبھا اس تحریک کی پورے طور سے معاون تھی اور صدر ہندو مہاسبھا
کا یہ ریمارک بالکل صحیح تھا کہ اگرچہ کمیونل اوارڈ میں مسلمانوں کے ساتھ بہت رعایت
کیگئی ہے لیکن اُسی رعایت کو بیکار اور غیر مفید بنانے کا بہترین طریقہ یہی (تحریک
رابطہ مسلم عوام) ہے جسکے ذریعہ منتخب شدہ مسلمان اگرچہ ہندو نہونگے لیکن ہندوؤں
کے تابع ضرور ہونگے۔ حقیقتاً اس تحریک کے ذریعہ کمیونل اوارڈ اور انتخاب جداگانہ
دونوں بے معنی چیزیں بنجاتیں اسلئے کہ جو لوگ منتخب ہوکر آتے وہ ہر حیثیت سے
"پولٹیکل شدھی" ہونے کی حیثیت رکھتے اور کانگریس کے احکامات کی تعمیل اُنکا
فرض ہوتا پھر کانگریس کو گاؤکشی بند کرنے کیلئے، اردو کو مٹانے اور ہندو

تہذیب کو فروغ دینے کیلئے قانونی کارروائی کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ وہی منتخب شدہ مسلمان خود بخود ان پر بغیر کسی قانونی مجبوری کے عمل کرتے، اس صورت میں مسلمان وزراء کسی مسلمان جماعت کے تابع نہیں بلکہ وارد ھا سے جاری شدہ احکام کی پابندی کانگریس کے تابع ہو کر بلا چون وچرا کرتے جس طرح کانگریسی صوبوں میں آج ہو رہا ہے۔

جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور صوبائی خود مختاری کی رو سے جو کچھ حقوق ملے ہوئے ہیں جنکی بدولت وہاں کے مسلمان مقابلۃً زیادہ آزادی کی زندگی بسر کرسکتے ہیں اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی ہوتی تو کانگریس کے دام خلافت آئندہ بھون کی اطاعت ان صوبوں کے مسلم چیف منسٹروں کو بھی اسیطرح کرنا پڑتی اول تو ایسی صورت میں وہاں بھی مسلمان وزیر اعظم ہوتے ہی کیوں؟ اسطرح کانگریس کی حکومت بجائے چھ صوبوں کے گیارہ صوبوں میں ہوتی اور آج پانچ صوبوں میں جو مسلمانوں کی وزارتوں کے امکانات ہیں وہ سب ختم ہو جاتے اسطرح فیڈریشن کے اجرا کے بغیر ہی کانگریسی فیڈریشن جاری ہو جاتا۔

اسکی مثال صوبہ سرحد سے لیجا سکتی ہے اس تحریک کا شکار ہو کر آج یہ صوبہ باوجود ۹۵ فیصدی مسلم آبادی کے ہندو صوبہ بنا جا رہا ہے۔ سی۔ پی کی طرح وہاں بھی ودھیا مندر جیسی تعلیمی اسکیمیں جاری کرنے کی فکریں کی جا رہی ہیں۔ وزیر اعظم سے وعدہ لیا جاتا ہے کہ انجمن حمایت الاسلام کی ریڈریں بچوں کو نہ پڑھائی جائینگی، اسلامیہ کالج پشاور کی مالی امداد بند کرانیکی کوشش کیجاتی ہے یہی سب کچھ اس تحریک کی کامیابی کے بعد دوسرے مسلم صوبوں میں بھی ہوتا۔

فصل دوم

اقتصادی پروگرام اور روٹی کی آواز

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما ۔۔۔ لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کی ناکامیوں سے برادران وطن کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ باوجود اسکے افلاس و زبوں حالی، پریشانی و انتشار کے مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کو ختم نہیں کیا جا سکتا ۔ مذہبی حیثیت سے ان کو ہندوست میں ہضم کیا جا سکتا ہے لہذا تحریک رابطہ عوام کے لائق موجد پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں پر فتح حاصل کرنے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے ایک نیا پروگرام ایجاد کیا جو شدھی کی تحریک سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ مسلمانوں کے افلاس اور انتشار باہمی سے پیٹ کے سوال کو انکے سامنے لاکر فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اور انکے مذہب کو روٹیوں کے ٹکڑوں ہی سے خریدا جا سکتا ہے یا اس جذبے کو ختم کیا جا سکتا ہے جسکی بنا پر ہر مسلمان اپنی متاع بیش بہا کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے لہذا مسلمانوں کو نہایت تسلی آمیز لہجہ میں خطاب کر کے کہا گیا کہ جہانتک مذہب کا سوال ہے وہ تعلق ہے اور خدا کے پرائیوٹ تعلق کا نام ہے اس تعلق کو مسجدوں اور حجروں میں محدود رہنے دو آجکل مذہب کو زیادہ اہمیت دینا ایک دقیانوسی خیال ہے ۔ اسوقت سب سے بڑا مسئلہ پیٹ اور روٹی کا ہے جہانتک معاشی اور اقتصادی مسئلہ کا تعلق ہے

مذہب کوئی مدد نہیں کرتا لہذا آؤ اگر اپنی بھوک رفع کرنی ہے اور افلاس کو دور کرنا ہے تو مذہب کو گھر چھوڑ کے آؤ اور کانگریس میں داخل ہو جاؤ۔ وہی تمہاری بھوک کا صحیح حل پیش کر سکتی ہے۔"

کس قدر بے ضرر اور سیدھے سادے الفاظ میں کانگریس میں شرکت کی دعوت دیگئی ہے کون بیوقوف مسلمان ہوگا جو مفلسی کی حالت میں اس امیدا فزا آواز کی طرف نہیں لپکے گا۔ غضب یہ ہے کہ پنڈت جی کے یہ جادو بھرے الفاظ بعض علمار کی زبانوں سے بھی اسی طرح نکلے اور وہی سبق انکی تقریروں میں بھی عوام کو دیا گیا۔ مذہب سے سیاست کی علٰحدگی کا یہ خطرناک نظریہ مسلم عوام کے سامنے مقدس اور محترم ہستیوں کی زبانوں سے بھی اُسی طرح ادا ہوا اور دیہات کے بُھولے بھالے مسلمان اسوقت تک اُن الفاظ کی زد میں آبھی گئے جب تک اصل حالت اُن سے پوشیدہ رہی۔

اسلام کو صرف نماز روزے کی ادائگی اور چند رسومات دینی میں محدود کر دینا اور دنیا کے قوانین اور انسانوں کے باہمی معاملات کو مذہب سے علٰحدہ کر کے ان کا نام سیاست رکھ دینا اسلام کی بنیاد پر کلہاڑی چلانا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ۔ ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

دین و مذہب کو ایک نجی معاملہ سمجھ کر اور مذہبی احکام کو رہبانیت اور سنیاسی جوگیت کی طرح محض مسائل نماز اور فریضۂ حج میں محدود فرض کر کے مسلمانوں کے سامنے ایک جدید معاشی اور اقتصادی نظام پیش کیا جا رہا ہے مذہبی تقسیم کو ختم کر کے نادار و تبے زر والے طبقوں کی تقسیم کے نظام کی تعلیم مسلمانوں کو

دکھا رہی ہے مزدوروں اور کسانوں کے نعروں سے روس کی تاریخ دہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ روس کا وہ ملعون نظام، جس کی رو سے مذہب کا نام تک لینا قومی جرم ہے جہاں تمام مساجد اور دیگر عبادتگاہیں حکومت کے حکم سے گرا دی گئی ہیں، جس نظام کی رو سے ذاتی ملکیت جس پر اسلامی قوانین وراثت اوقاف اور زکوٰۃ کی بنیاد قائم ہے قطعی حرام ہے، پنڈت جی کا عقیدہ اور ایمان ہے اور کانگریس کی ایک بڑی جماعت سوشلسٹ پارٹی کے پروگرام کا سب سے بڑا جزو ہے اس نظام کے مطابق (جو آجکل روس میں رائج ہے اور پنڈت جواہرلال ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں) اپنی محنت کی گاڑھی کمائی کو جمع کرنے کی سزا موت ہے، علی الاعلان مذہبی تبلیغ کرنا، مذہب کا نام لینا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی نظام کو ہندوستان میں قائم کرنے کی تمنا پنڈت جی کی زندگی کا اہم جزو ہے اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا کانگریس سیشن منعقدہ لکھنؤ میں آپ فرماتے ہیں:-

"ہم کو ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنا ہوگی جو موجودہ سرمایہ دارانہ تمدن سے بالکل مختلف ہوگا اسکے کچھ مناظر ہم کو روس کی حکومت کی روایات میں ملتے ہیں ایک نئے تمدن اور دلکش آغاز کو میں اس بانزوبناک زمانہ میں مستقبل کیلئے ایک مبارک فال سمجھتا ہوں مستقبل کے متعلق اگر امیدیں قائم کیجا سکتی ہیں تو یہ صرف روس ہی کی بدولت ہے سوشلزم میرے لئے ایک اقتصادی نظریہ ہی نہیں جسکو میں پسند کرتا ہوں بلکہ یہ میرا ایک ایمان اور عقیدہ ہے میں چاہتا ہوں کہ کانگریس ایک سوشلسٹ ادارہ بنجائے اور دنیا کی اُن قوموں سے اتحاد عمل کرے جو نئے تمدن کے قائم کرنیکو شاں ہیں"

یہ الفاظ کانگریس کے کسی معمولی لیڈر کے نہیں ہیں بلکہ پنڈت جواہر لال
نہرو کے ہیں جو گاندھی کے بعد اُن کی گدی کے واحد امیدوار ہیں اور الفاظ بھی
کانگریس کے خطبۂ صدارت کے ہیں آپ صاف طور سے روسی نظامِ اشتراکیت کو
اپنا عقیدہ اور ایمان تسلیم کرتے ہیں اور ہمارے سادہ فطرت علماء انکے پیچھے آنکھ
بند کر کے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ روسی نظام کی معمولی سی جھلک اس نظام کے
بانی لینن کے الفاظ مندرجہ ذیل سے معلوم ہوتی ہے :-

"مذہب سے جنگ کا قریبی تعلق اس جدوجہد سے ہونا چاہیئے جو تمدن
و معاشرت کی جڑوں سے مذہب کے نفوذ و اثر کو نکال پھینکنے کیلئے کیجاتی ہے"

مسٹر ادھیکاری نے جو میرٹھ کے مقدمہ سازش میں ملزم کی حیثیت سے عدالت
میں پیش تھے اپنے بیان میں فرمایا تھا :-

"مارکس کے پیرو اور مادہ پرست ہونے کی حیثیت سے ہم مذہب کے قطعی
مخالف اور خدا کے منکر ہیں مگر ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہب کے
خلاف محض ایک نظری اور خیالی پروپیگنڈا کرنے سے مذہب کا استیصال
نہیں ہو سکتا لینن اس بات پر زور دیتا ہے کہ مذہب کے خلاف جنگ کی
جدوجہد طبقاتی جنگ کی بنیاد پر ہونی چاہیئے"

اس سلسلے میں اشتراکیوں کی اخلاقی حالت بھی اسی نظام کی ایک ممتاز رکن
مادام سمیدووش کے الفاظ میں سنئے وہ لکھتی ہیں :-

"ایک روز اسپتال میں سولہ سولہ سال کے دو لڑکے ایک بچے کو لیکر آئے
اور انھوں نے بیان کیا کہ یہ ہم دونوں کا مشترک بچہ ہے۔ ان کو یہ معلوم

نہ تھا کہ درحقیقت ان دونوں میں سے کون اس بچہ کا باپ ہے"
تک پہنچ گئی ہیں:-

"نوجوان اشتراکیوں کے نظام میں افریقی راتیں منانے کا رواج بکثرت
پھیل گیا ہے جنکی وجہ سے یہ ادارے نوجوانوں کا مرکز و مرجع بنگئے ہیں
ان افریقی راتوں میں بکثرت لڑکیوں کی زندگیاں خراب کی جاتی ہیں
اور اسیوجہ سے اب عورتیں ان اداروں میں شریک ہوتے ہوئے گھبرانے
لگی ہیں"

یہ ہے اُس نظام کی مذہبی اور اخلاقی حالت جس کو پنڈت جی اور اُنکے رفقاء
ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔ قابل غور یہ بات ہے کہ اس مقصد اعلےٰ کو حاصل
کرنے کیلئے وہ ابتدا میں روٹی کی آواز پر عوام کو پکارتے ہیں اور مذہب کے
خلاف نرم الفاظ میں پروپیگنڈا کرتے ہیں تاکہ کہیں وہ پہلے ہی بھڑک
نہ جائیں اس کی تائید میں اشتراکیوں کی بین الاقوامی انجمن کی پانچویں کانگریس
کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں:-

"پرولتاریہ طبقہ کے پھیلائے ہوئے تعصبات و توہمات کے جدوجہد کے
جتنے شعبے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت مذہب کے خلاف جنگ کی ہے
مگر یہ جنگ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے ہونی چاہیئے خصوصاً
محنت کش عوام کے ان طبقات میں جن کی روزمرہ کی زندگی میں مذہب
بہت گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے"

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ابتدا میں مذہب کے خلاف کھلم کھلا کچھ نہ کہا جائے

بلکہ نہایت احتیاط کے ساتھ ان کو معاشی مفاد اور روٹی کی آواز پر بلایا جائے اور کسی طرح عوام پر قبضہ کر لیا جائے پھر سب کام آسان ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل اقتصادی معاملات پر منحصر رکھتے ہیں۔

کانگریس کی اس جماعت کے نزدیک اور کوئی قابل توجہ مسئلہ ہی نہیں ہے انکے نزدیک دو اور دو کا مجموعہ ہمیشہ چار روٹی ہی ہوتا ہے وہ مذہب و سیاست کی تمام بنیاد روٹی ہی پر رکھتے ہیں لہذا پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"دنیا[1] کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کر سکتی ہے"

اس قوت یقین میں آپ اسقدر پختہ ہیں کہ مسلمانوں کی قومیت کے خیال تک کو رد کرنے کی جرأت کرتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتے اور فرماتے ہیں:۔

"معاشی[2] نقطۂ نظر سے یہ (مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بیدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے"

پھر آل انڈیا نیشنل کنونیشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء میں خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے"

دیکھا جناب نے! پنڈت جی کی جدید دنیا میں مذہب پر قائم شدہ جماعت کی

---

[1] میری کہانی صفحہ ۲۵۰ [2] میری کہانی صفحہ ۲۲۱۔

کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہ اس خیال تک سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ انکے نزدیک تو ہندوستان کی آزادی، ملک کی ترقی، سیاست کے ارتقا اور دنیا کی ہر شے کا دار و مدار معاشی پروگرام پر ہے۔ ان کے اس عقیدہ کے مطابق اگر ہندوستان کے باشندوں کو دو وقت پورے طور سے پیٹ بھر کر کھانا ملجایا کرے اور فراغت سے زندگی بسر کرنے کا کوئی نیا طریقہ نکال لیا جائے، برطانیہ اپنی سائنس کے نوایجاد طریقہ سے کوئی ایسا حل تلاش کرے تو پنڈت جی اور اُن کے متبعین (یعنے کانگریس سوشلسٹ پارٹی) کی تمام پرواز اُسی فضا میں ختم ہو جائے گی گویا ان کی جماعت کی حالت اُس قیدی کی سی ہے جو صرف اس شرط پر قید میں بند رہنا منظور کرے کہ اُسکو عمدہ غذا اور کپڑا حسب منشا مل جایا کرے۔

اگر آزادی کا یہی تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان کے آمد کردہ مسلمانوں کیلئے ایسی آزادی کا تخیل بھی گناہ ہے پنڈت جی اس غیر اسلامی نظام کی کشش سے اسقدر مرعوب ہیں کہ وہ ہر صورت سے اس نظام کی تائید میں مصروف ہیں ان کا ارادہ اس معاملہ میں اسقدر قوی ہے کہ اگر مسلمانوں کی قلیل جماعت ایسے نظام کی تشکیل میں حائل بھی ہو تو اُسکو فنا کر دینا چاہیئے۔ آپ فرماتے ہیں:—

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہونچ جاتے ہیں جسکے سوا اس مسئلہ کا حل اور کوئی نہیں یعنے ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں ایسا نظام جسمیں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہوتا

چاہیئے یہ ایک جداگانہ سوال ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو، وہ محض اسوجہ سے نہیں رد کی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں، اگر سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں تو انکو مٹا دینا چاہیئے"۔ (میری کہانی صفحہ ۴۱۹ و ۴۲۰)

پنڈت جی کی ڈکٹیٹر شپ کس شان سے نمایاں ہو رہی ہے۔ تمدنی اور سیاسی جماعتوں کو فنا کرنے کی کس طرح دھمکی دیکا رہی ہے۔ آگے چلکر پنڈت جی صاف صاف فرما دیتے ہیں کہ اس نظام کو لانے میں اگر جبر بھی کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں بلکہ ایسا کرنا ضروری ہوگا:۔

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنے قومی جنگ[1] دیگر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جبتک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہو جائے اُسوقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہو سکے گی لیکن اسکے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ (میری کہانی صفحہ ۴۴۱)

پنڈت جی کے ان صاف صاف اعلانات اور احکامات (جنکی اساس ابھی محض تخیل پر ہے) کے بعد بھی کوئی شبہ باقی رہجاتا ہے کہ وہ دنیا ہی سے ایسے نظام کو مٹانا چاہتے ہیں جسکی بنیاد تمدن اور مذہب پر ہو انکے تخیل میں کسی ایسے نظام کی

---

[1] جیسا آج ہو رہا ہے۔

گنجائش ہی نہیں ہے جسکو اسلامی نظام کہا جاسکے۔ حیرت صرف اسقدر ہے کہ پنڈت جی کے ہاتھوں پر سیاسی بیعت کرنے والے حضرات اور اپنے ساتھ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس ملحد جماعت میں ساتھ لے جانیوالے رہنمایان ملت، کبھی ان کفر آمیز اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو مٹانے والے اعلانات پر غور بھی نہیں فرماتے اس سادہ اور راقی اور رواداری کی بھی کوئی حد ہے؟۔

وہ اسلامی نظام کہنہ جو ساڑھے تیرہ سو برس کے انقلابات اور حوادث کے باوجود آج تک ایک شمہ کی تبدیلی بھی قبول نہیں کرسکا۔ کیا آج کانگریس کے تجویز کردہ اس مردود اور غیر اسلامی نظام میں ضم کردیا جائے جو اسپین، فرانس، جرمنی اور اٹلی کی اتنی باہمی خونریزیوں اور خون آشامیوں کے باوجود آج تک کوئی مستقل دستور العمل پیش نہیں کرسکا، جو روس میں اتنے زبردست انقلاب کے بعد ابھی پہلی منزل بھی طے نہ کرنے پایا تھا کہ قدم پیچھے ہٹانے کی ضرورت پیش آگئی جسکے قائم کردہ دستور العمل کی یہ حالت ہے کہ روزانہ فقیر کی بوسیدہ گدڑی کی طرح ترمیمات کے پیوند انہیں لگتے رہتے ہیں۔

دنیا کا ہر صحیح الخیال مفکر جسکے اندر صداقت کی روشنی کی معمولی سی کرن بھی باقی ہے اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ جس اقتصادی مسئلہ کا حل لینن اور برٹ اشکی پیش نہیں کرسکے، جن مسائل کو بڑی بڑی سلیکٹ کمیٹیاں اور کانفرنسیں طے نہیں کرسکیں ان کو بطحٰی کی کنکریوں پر بیٹھنے والے ایک امی پیغمبر نے اس خوبی سے حل کردیا کہ آجتک ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر حصہ کیلئے اسی طرح عالمگیر حیثیت میں نمایاں ہے پھر یہ اگر مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم اپنے

عمل اور عالمگیر نظام کو چھوڑ کر بیگانہ طرز پر ہندوستان میں اشتراکیت کے پروگرام کو قبول کریں۔

بدقسمتی سے روٹی کی آواز پر مسلمانوں کو شرکت کانگریس کی دعوت دینے والے حضرات یہ حقیقت بالکل بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کی گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سالہ زندگی کے بڑے سے بڑے مصیبت کے دور میں بھی کوئی چیز مذہب سے جدا نہیں کر سکی انھوں نے کبھی مذہب کو سیاست کی قربانگاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا اور نہ اقتصادیات اور افلاس کا شکار ہو کر انھوں نے بندۂ شکم ہو کر کبھی اپنے مذہب کو روٹی کے ٹکڑوں پر فروخت کیا۔ انکا بڑے سے بڑا رہنا پیٹ سے پتھر باندھ کر میدان جنگ میں مصروف جہاد رہا اور دنیا کے سامنے یہ سبق پیش کیا۔ ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں

زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا۔ (اقبالؒ)

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف پوجا پاٹ اور "تسبیح و سجادہ و دلق" ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اقتصادی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اسلام دنیا کے سامنے ایک عالمگیر اقتصادی پروگرام پیش کرتا ہے جسکو جہاں کہیں آزمائش کا موقع دیا گیا کبھی نامکمل ثابت نہیں ہوا۔ اسلام جب خود ایک مکمل نظام ہے تو یہ کب ممکن ہے کہ دنیا کے عارضی انقلابات سے متاثر ہو کر اسکے ماننے والے ہر نئے نظام کے سیلاب میں بہ جائیں اسلامی نظام سوشلزم یا اشتراکیت کی طرح کسی غیر فطری ماحول کی عارضی پیداوار نہیں ہے بلکہ اصل میں

سوشلزم وغیرہ اسی واحد نظام اسلامی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور موجودہ شکل میں اسی منزل کے بھٹکے ہوئے مسافر ہیں ان کے ارادے خود اسلام سے مستعار ہیں لیکن ان کو پورا کرنے کیلئے جو طریقے وہ استعمال کرتے ہیں وہ اسلئے غیر اسلامی ہیں کہ وہ کبھی اسلامی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر مہاجنی سود کو یک لخت بند کر دیا جائے آمدنی پر چالیسواں حصہ مقرر کر کے بیت المال کا صحیح استعمال کیا جائے اور قوانین وراثت کا صحیح نفاذ صحیح اسلامی طور سے کیا جائے تو دنیا میں اقتصادی مشکلات کا بآسانی خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام مفلس رہنے کی تعلیم نہیں دیتا نہ افلاس اور اقتصادی مشکلات کی پریشانیوں سے گھبرا کر مذہب کو اقتصادیات کے ماتحت کر دینے کی تلقین کرتا ہے بلکہ تمام اقتصادی پریشانیوں کا حل تقسیم دولت اور توسیع ذرائع کے صحیح طریقوں سے پیش کرتا ہے اسلامی اصول اقتصادیات کا سرسری مطالعہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اسلام ایسے سرمایہ دارانہ نظام کا سخت مخالف ہے جو ہندو سوسائٹی میں اور مغربی ممالک میں رائج ہے۔ لیس للانسان الا ما سعٰی قرآن مجید کا بہترین درس ہے اس کو علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔ ؎

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار
حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعٰی

اسلام ہر اُس نظام کا مخالف ہے جسمیں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار کو ملے۔ اور دہقان کی تمام جانفشانی کا ثمرہ زمیندار کو پہونچے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جب اسلامی اقتصادی اصول اسقدر پختہ اور قابل عمل ہیں کہ اسمیں سرمایہ پرستی کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگریس میں شرکت کرکے کونسا نیا نظام مسلمانوں کو مل سکتا ہے؟ کانگریس کا مجوزہ پروگرام اسقدر مبہم اور دھندلا ہے کہ خود پروگرام کے مصنفین کے دماغ میں اسکا صحیح تخیل موجود نہیں ہے کانگریس نے اپنے ڈیڑھ سالہ دور حکومت میں جس طرح اس اقتصادی پروگرام کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان تمام بلند بانگ دعووں کی حقیقت فاش کرتا ہے جو کانگریس مسلم عوام کے سامنے پیش کیا کرتی ہے۔ اُسکا ہر اقتصادی پروگرام فرقہ وارانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسکی لغت میں "زمیندار" اور "سرمایہ دار" کے معنی ہر صوبے میں مختلف ہیں۔ وہ روٹی کے سوال کی آڑ میں مسلمانوں کے مذہبی جذبے کو ایک طرف ختم کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف خود اقتصادی پروگرام کے ہر جزو کو ہندو مفاد کے لئے خرچ کرنا چاہتی ہے۔

یو۔ پی اور بہار میں کاشتکاروں کے مفاد کیلئے اور زمینداروں کے خلاف وہ ہر قدم اُٹھانے کیلئے تیار ہے "یو پی کا شتکاری بل" کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے وہ زمینداروں کو بالکل ختم کئے دیتا ہے اسلئے کہ یو پی میں مسلم کاشتکاروں کا تناسب کل ۲½ فیصدی ہے اور مسلم زمینداروں کا تناسب ۲۸ فیصدی ہے یعنی زمینداروں کے حقوق و مراعات اگر کاشتکاروں کی طرف منتقل کر دیے جائیں تو ہندوؤں کو ۹۷½ اور مسلمانوں کو محض ۲½ فیصدی فائدہ حاصل ہوگا۔ برخلاف اسکے جب بنگال میں اس قسم کا بل پیش کیا جاتا ہے جسکی رو سے کاشتکاروں کا مفاد سامنے آتا ہے تو کانگریس ایسے بل کے خلاف تمام زور

صرف کرتی ہے اور اسمبلی میں مخالفت میں ہاتھ اُٹھاتی ہے صرف اسلئے کہ بنگال میں کاشتکاروں کا تناسب مسلمانوں کا زیادہ ہے اور زمینداروں میں ہندوؤں کا زیادہ ہے یہاں تک کہ بنگال کا کانگریسی اخبار ایڈوانس صاف لکھ دیتا ہے:۔

"زمینداروں کی اکثریت ہندو ہے اور کسانوں کی اکثریت مسلمان ہے بنگال کے قانون کاشتکاروں کا مسودہ، ہمیں خوف ہے کہ اس صوبے میں ہندوؤں کے باقیماندہ اثر پر ایک ضرب کاری ہوگا۔"

اسی طرح پنجاب میں قرضہ کے متعلق جب قانون پاس کئے جاتے ہیں تو کانگریس پوری قوت کے ساتھ ان کی مخالفت کرتی ہے اور ان بلوں کو کالے بل کے نام سے پکارتی ہے اسلئے کہ ان بلوں کی رو سے ہندو مہاجنوں کو نقصان اور مسلمان کاشتکاروں کو فائدہ پہونچتا ہے۔

یہ ہے کانگریس کے اقتصادی پروگرام کی حقیقت ایک جماعت کے ایک ہی ملک میں مختلف مقامات میں مختلف پروگرام ہیں جبکہ مسلم لیگ کے پروگرام کا اہم جزو مہاجنی سود کو منسوخ کرانا ہے، کانگریس نے اسکو اپنے پروگرام تک میں شامل نہیں کیا اسلئے کہ مہاجنوں کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ہے یہی وجہ ہے کہ کانگریس اگرچہ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرتی ہے لیکن خود مکمل انقلاب سے بیحد گھبراتی ہے اسلئے کہ ہر انقلاب مہاجنوں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف ہے اور مسلمان ہر ایسے انقلاب کے متمنی ہیں جو سرمایہ داری کو ختم کر دے۔ کانگریس کھدر کی اسکیم پر بہت زور دیتی ہے اور ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے کا فروغ اُسکے پروگرام کا اہم حصہ ہے لیکن اسمیں بھی

ہندو ذہنیت پہلے طور سے رونما ہے۔ مسلمان جولاہوں سے صنعت پارچہ بافی حاصل کرنے اور انکے فائدہ کو ختم کرنے کیلئے کانگریس نے بنجی فنڈ سے اسپنرس ایسوسی ایشن قائم کئے ہیں گاندھی آشرم اور کھدر بھنڈار قائم کئے ہیں جنکے ذریعہ رفتہ رفتہ مسلمان جولاہوں کی صنعت پر قبضہ کیا جا رہا ہے۔[1] ہندوستان کے کسی شہر میں کوئی کھدر بھنڈار کسی مسلمان کے قبضہ میں نہیں دیا گیا۔

فصل سوم

الحاد کی تعلیم

روٹی کے مشترک مفاد کے غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈوں سے اقتصادی مشکلات تو کیا رفع ہو سکتی تھیں ہر سمجھدار انسان سمجھ سکتا ہے کہ جب تک ملک غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہے کوئی جماعت افلاس کو دور نہیں کر سکتی لیکن اس قسم کے پروپیگنڈوں سے کانگریس کو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت جو مذہب سے پہلے ہی سے ناآشنا تھی اور علماء کی وہ جماعت جو اس قسم کے مغربی فتنوں سے آگاہ نہ تھی، مذہب اسلام کی اصل راہ سے ہٹکر اقتصادیات کا شکار ہوگئی یہ صحیح ہے کہ افلاس کو دور کرنے کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور اُسی کیلئے متذکرہ بالا اصول قواعد

---

[1] راقم الحروف نے بحیثیت سکرٹری اقتصادی کمیٹی (صوبہ مسلم لیگ یوپی) ان واقعات کو بچشم خود بڑے بڑے مرکزوں میں جاکر دیکھا مسلم لیگ کی اقتصادی پروگرام کی رپورٹ میں یہ حالات مفصل درج ہیں۔

مقرر کئے ہیں لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روٹی کو انسانی حیات کا نصب العین ہی بنا لیا جائے اور تن پرستی برائے خوردن کو اصول حیات مان لیا جائے دنیا کے ہر مسئلہ کو خواہ وہ مذہب ہو یا تمدن، معاشی مسائل کے ماتحت کر دیا جائے۔ اگر انسان نے اتنی جد وجہد کے بعد محض اسقدر ترقی کی ہے کہ انسان اور حیوان کے امتیاز کو ختم کر کے دونوں کا ایک ہی نصب العین یعنی شکم پری بنا لیا ہے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ثم رددنٰہ اسفل سافلین کی یہ ایک ادنےٰ مثال ہے۔ اس اصول کے مطابق جب مذہب کو روٹی کے ماتحت بنا دیا گیا تو مذہب کی اہمیت ظاہر ہے یہی وجہ ہے کہ لا مذہبیت اور الحاد کا سیلاب مسلم نوجوانوں کو بہلائے لیا جا رہا ہے۔

پھر کانگریس نے اس مذہبی جذبے کو ختم کرنے کیلئے صرف اقتصادی حربوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وطنیت قومیت اور مشترک تہذیب کے نئے نئے جال بچھانے شروع کئے اسلامی تہذیب کی نئی نئی تشریحیں پیش کرنی شروع کیں اسکے متعلق کہا گیا کہ "اسلام چند عقیدوں کا نام ہے۔ اسکی کوئی خاص تہذیب نہیں ہے ہر ملک میں اسلامی تہذیب جدا جدا ہے پھر اسلامی تہذیب کے بقا کیلئے کوشش کس لئے؟"

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۲ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد ماڈرن ریویو میں مضامین کا ایک سلسلہ اسی موضوع پر لکھا جسمیں علامہ اقبال مرحوم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ "آپ بیسویں صدی میں اسلامی تہذیب کی یکسانیت اور وحدانیت کے قائل ہیں۔ اسلامی تہذیب ایک کس طرح ہو سکتی ہے؟"

علامہ اقبالؒ نے ان مضامین کا بہت مفصل جواب دیا تھا جس میں آپ نے

ثابت کیا تھا کہ باوجود ان ظاہری اختلافات تمدن ولباس اسلام کی اصل تہذیب ہر ملک میں یکساں ہے آپنے پنڈت جی کے متعلق صحیح فرمایا تھا کہ۔

"یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ایک ایسا ہندوستانی نیشنلسٹ جسکے سیاسی تخیلات نے حس حقیقت شناسی کو مطلقاً تباہ کر دیا ہو وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں خود اعتباری کے جذبات وخواہشات کی پیدائش کو سالمیت وملت داری کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ پنڈت جواہرلال جیسا شخص جس نے ایک ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی ہے جو حدود وقیود سے معرا ہے اور اس بنا پر باہمی ارتباط سے بھی محروم ہے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔"

اسکے بعد بھی برابر پنڈت جی نے اس قسم کے اقوال اپنی تقریروں اور تحریروں میں پیش کئے جنمیں اسلامی تہذیب و مسلم کلچر پر خوب دل کھولکر مذاق اڑایا گیا۔ آپکے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں جنمیں اسلامی تہذیب کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے :۔

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ مگر میں اسمیں کامیاب نہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان اور انھیں کی طرح ہندو فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں، جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا پائجامہ، نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا، ایک خاص طریقے سے مونچھوں کا مونڈنا یا ترشوانا، مگر داڑھی کو بڑھنے کیلئے چھوڑ دینا، ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ داڑھی کے متعلق

تو مجھے اعتراف ہے کہ جب امان اللہ خاں نے کابل میں داڑھیوں کا صفایا
کرانا شروع کر دیا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی ہندو اور مسلم کا شکل سے
میں مشکل ہی سے کوئی فرق کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان شاید ہی
داڑھی رکھتے ہیں، علیگڈھ والے البتہ سرخ ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اسکا
نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں
ساری پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں" (میری کہانی ۳۲۲)

پھر ایک اور مقام پر اسی خیال کو اسطرح دُہراتے ہیں :-

" لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں، اور ترکوں
وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے
ابتک باقی ہے یا اسکا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات
ہیں ہمیں تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آجکل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ
کا بھی ذکر کرتا ہو" (میری کہانی صفحہ ۳۳۲)

پھر آپ مسلم تہذیب کی بقا کے انحصار کو سرکار برطانیہ کی عنایات پر ثابت کرتے
ہوئے فرماتے ہیں :-

" مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ برطانیہ
کی شفیق حکومت کے تحت صرف شمالی ہند میں پھلے پھولیں گی" (میری کہانی ۳۳۲)

پھر خود ہی اسکا جواب دیتے ہیں :-

" مسلم قوم کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے
اگر اخبارات اسکی اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے

واقف ہوتے اگر زیادہ لوگوں کو بہر اعتقاد مذہبی حقیقت سے دوچار ہو جانے کے بعد اسکا خاتمہ ہو جاتا..... اب قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" (میری کہانی صفحہ ۳۳۲)

پھر دوسری جگہ برطانیہ کی عنایت کا تعلق اسلامی تہذیب سے اسطرح دکھایا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے پھر اُس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کراسکے۔ مسلم قومیت کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیئے یا بدیسی حکومت۔"

(میری کہانی صفحہ ۳۳۰ و صفحہ ۳۳۱)۔

پھر آگے چلکر آپ ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی تہذیب اور مذہبی جذبہ ہر جگہ ختم ہو رہا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک اسلام کو چھوڑ رہے ہیں۔ ترکوں کی خلافت کو خیر باد کہدینے اور عربی ممالک کا "تثلیث" کا شکار ہو جانے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس زمانے میں ہندی مسلمانوں کو بیحد صدمات پہونچے ہیں اور اُن کے بعض سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جسکے لئے ہندوستان سنہ ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے

ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اُسکو دور ہی لے جا رہے ہیں۔ مصر بھی اسی راستہ پر چل رہا ہے۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے، سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے، ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیار کیلئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں، غرض ہر جگہ مذہب پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے"

مطلب اسکا یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان مذہب کو چھوڑ رہے ہیں پھر ہندوستان کے مسلمان بھی آخر کیوں اسقدر اسلامی تہذیب کے قائم کرنے میں مصر ہیں۔

متحدہ قومیت و تمدن کی تشکیل | اسلامی تہذیب و تمدن کی امتیازی شان پر مسلمانان عالم نے ہمیشہ فخر کیا ہے اسلامی تہذیب باوجود ملکی و جغرافی اختلافات کے دوسری غیر ملکی تہذیبوں کے مقابلہ پر ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ دنیا کے کسی حصہ کا مسلمان کرۂ ارضی کے کسی مسلم گوشے میں بھی اجنبی نہیں رہ سکتا۔ لیکن عرصے کانگریس ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو ختم کرکے ایک جدید ہندوستانی کلچر کی بنیاد ڈالنے کی فکر میں ہے وہ ہندوستانی کلچر سوائے ہندو کلچر اور کیا ہو سکتا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان میں سب قوموں کی تہذیب کو فنا کرکے ایک متحدہ تہذیب پیدا کرنی چاہیئے۔

علامہ اقبال رح نے پنڈت جی کی اس تجویز کی تردید ان الفاظ کی تھی۔

"میرے خیال میں پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک کی مختلف تہذیبوں (کلچروں) کو دبا کر ان کی بجائے آہستہ آہستہ ایک

گر ان قدروں اور اُن کلچر کی بنیاد رکھی جائے ان ذرائع سے حاصل کردہ نیشنلزم کا نتیجہ یہ ہوا سکے اور کچھ نہ ہوگا کہ باہمی کشیدگی اور تشدد اور بڑھ جائے۔"

اس متحدہ قومیت اور متحدہ تمدن کی تائید میں کانگریس کا ہر ہندو لیڈر پنڈت جی کا ہمنوا ہے۔ سوامی سمپورنند یوپی میں وزیر تعلیم ہیں اور انکے ساتھ اس صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیم کی نگرانی وابستہ ہے ان کی اس تقریر کو بغور پڑھیے جو موصوف نے گذشتہ اسمبلی میں کی تھی اسمیں آپ فرماتے ہیں:-

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کو قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیئے جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی۔"

(کارروائی اسمبلی ماہ اپریل ۱۹۳۸ء)

اس حقیقت پر خوب غور کر لیجیے کہ کانگریس کے کسی لیڈر کی زبان سے جب ہندو مسلم تہذیب کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد مسلم تہذیب ہی ہوتی ہے۔ ہندو کا لفظ صرف اسلیے لگا دیا جاتا ہے کہیں مسلمان بھڑک نہ اٹھیں۔ ہندوؤں کی کوئی مذہبی تہذیب نہیں ہے بلکہ جو تہذیب بھی غیر اسلامی ہوگی اور ہندوستان کی پیداوار ہوگی یعنے ہندوستانی ہوگی وہ ہندو ہی ہوگی۔ جس طرح ہر اُس مذہب کا جو سرزمین ہندوستان کی پیداوار ہو خواہ وہ بدھ ہو یا جینی یا سکھ (جو اصل میں ہندوازم کی مخالفت میں ظہور پذیر ہوئے تھے) ہندو دہرم تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی سے یہ ہندوستانیت اور ہندوازم دونوں ہم معنے الفاظ ہیں، یہ خیال ہمارا ہی نہیں بلکہ

بلکہ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اس خیال کا اعادہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہو۔

"ہندومت کے دائرے میں بیحد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندومت اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں"

(میری کہانی صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۲)

برخلاف اسکے مسلمانوں کو ایک مقررہ حدود میں رہنا پڑتا ہے جس سے باہر قدم رکھنے کی سزا کفر ہے اسلئے وہ ہمیشہ ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے مالک رہے ہیں جنکو ختم کرنے کے لیئے یہ طریقے استعمال کیئے جارہے ہیں۔

اگر یہ پروپگینڈا کانگریس کے ہندو لیڈروں کی طرف سے ہی ہوتا تو اتنی شکایت نہ تھی مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی ایک جماعت ان خیالات کی تائید میں بہت مصروف ہے۔ وہی جماعت جو اقتصادی مسائل کو مذہب سے زیادہ ضروری اور اہم سمجھتی ہے اس قسم کی متحدہ کلچر کی پیدائش کو ہندوستان میں ضروری سمجھتی ہے۔ یہ جماعت اُن مسلمانوں کی ہے جو دنیا میں مذہب کی ضرورت پر استہزا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور خود از فرق تا قدم ہندو کلچر میں اسقدر گھل مل چکے ہیں کہ بعض اوقات اپنے اسلامی ناموں تک سے

فرماتے ہیں انہیں سے بعض نے تو صرف اسی خیال سے "ڈاڑھی دار لوٹا" رکھنا چھوڑ دیا ہے کہ اس سے اسلامی تہذیب کی بو آتی ہے" (بقول پنڈت جواہرلال) انہیں سے اکثر نے "گول پائجامے" کے بجائے دھوتی اور جوتوں کی بجائے چپل کا استعمال شروع کر دیا ہے جو "السلام علیکم" کے بجائے کل تک "گڈ مارننگ" کہتے تھے وہ آج ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہیں "مسٹر" کے بجائے "جناب" نہیں بلکہ "شریان" لکھنا شروع کر دیا ہے انھیں لوگوں کی فوج کو مسلم تہذیب کے فنا کرنے اور نئی ہندوستانی تہذیب کی بنیاد ڈالنے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے اصل میں ہندوستانی نئی تہذیب کا لفظ بھی برائے نام استعمال کیا جاتا ہے انکے دماغ میں تخیل اسی پرانی تہذیب کا ہے جو ڈیڑھ ہزار برس قبل ہندوستان میں رائج تھی انکو ہر وہ چیز اپنی طرف کھینچتی ہے جو راماین اور مہابھارت کا دور یاد دلاتی ہے مگر اسی تہذیب کی حیات ثانیہ کو "جدید قومی تہذیب" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کانگریس کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں اور آجکل صوبہ بہار میں وزیر تعلیم ہیں اور کانگریس کے وفادار خادم ہیں۔ آپ کے خیال میں مسلمانوں کا جدا مذہب، جدا رسم و رواج حتٰے کہ جدا نام رکھنا بھی ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہے آپ مسلمانوں کو ایک ایسے مذہب کے جدید نظام کا مشورہ دیتے ہیں جسمیں سب ہندوستانی شریک ہو سکیں جو اکبر کے قائم کردہ مذہب "دین الٰہی" کے اصولوں پر مبنی ہو جسکا ذکر پہلے آچکا ہے یہی وہ دور اکبری کا فتنہ تھا جسکا خمیازہ عالمگیرؒ کو بعد میں بھگتنا پڑا تھا اور سلطنت مغلیہ اسی کا شکار ہوئی تھی۔ عہد اکبری میں بھی تمام علمار نے علم جہاد بلند کیا تھا۔ ہمارے یہ

قوم پرست لیڈر اسی دور کی یاد اسطرح تازہ کرتے ہیں :-

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہمارا مقصد اور نصب العین ہے کیا؟ کیا ہم
اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام
لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ
ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے۔ جسمیں ایک سے زیادہ اقوام
بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر قوم علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مسائل کو
حل کرے۔ اور مشترک دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا
کرے۔ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اسوقت کی کوششیں اسکے
برعکس بالکل ناکام رہی ہیں۔ لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے
اور واقعی ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اُسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے
ازمنۂ وسطےٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے
ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیئے بلکہ ہمارے پہننے اور رسوم میں بھی
یکسانیت ہونی چاہیئے بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت
کیلئے ایک مضرت ہے لیکن اسکا کوئی چارہ کار نہیں اور چونکہ کوئی تیسرا
حل موجود نہیں ہے اسلئے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے
قبول کرلینا چاہیئے۔"　　　(جامعہ، اکتوبر ۱۹۳۵ء بحوالہ الفرقان محرم ۱۳۵۴ھ)

اس مضمون سے اگر مصنف کا نام جدا کردیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ الفاظ
ایک مسلمان کے قلم سے نکل سکتے ہیں وہی پنڈت جی کے الفاظ ہیں جو ان نام
نہاد مسلمانوں کے قلم اور زبانوں سے گراموفون کے ریکارڈ کی طرح نکلتے رہتے ہیں۔

انھیں الفاظ پر اکتفا نہیں ہے۔ مذہب، رسوم اور پیشوں کی ہی یکسانیت مطلوب نہیں ہے بلکہ ناموں کا اسلامی حیثیت میں جاری رکھنا بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں:۔

"لفظ ہندی کو زبان کیلئے نہیں بلکہ اہل ہند کیلئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ملک ہے جسمیں لوگ مختلف مذاہب کی شناخت میں آتے ہیں صرف اسکا اظہار ہی ہماری ذہنی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علحدہ علحدہ مذہبی اقوام ہیں، اسی لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کرلیں۔"

ڈاکٹر اشرف صاحب بھی سید محمود کی طرح قوم پرست لشکر کے ایک آزمودہ سپاہی ہیں آپ پنڈت جی کے اس خیال کی تائید میں کہ مسلمانوں کی کوئی خاص تہذیب نہیں ہے، ماہ رجب [illegible]ھ کے الجمعیۃ میں رقم طراز ہیں:۔

"جاگیرداروں اور عہد بادشاہت کے زمانے میں باعتبار زبان، لباس تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں مائل ہو چکے تھے، چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہو کر ایران پہونچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لئے خاص طور سے ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی

یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں بنر زرسے ضرب المثل ہیں۔" (منقول از الفرقان بریلی محرم ۱۳۶۰ھ)

اس بیان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس امر پر بھی غور کیجئے کہ یہ مضمون الجمعیۃ میں شائع ہوا ہے جو جمعیۃ العلماء ہند کا واحد آرگن ہے اور جس کی پالیسی کی پوری ذمہ دار جمعیۃ العلما کی مجلس عاملہ ہے اس سے زیادہ افسوس اور کیا ہوسکتا ہے کہ مسلم قومیت کو ختم کرنے کیلئے علماء اور اسلامی جرائد ہی کو آلۂ کار بنایا گیا ہے ۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد

کانگریس سکریٹریٹ میں ایک محکمہ شعبہ اسلامیات کے نام سے بھی جاری ہے جسکا مقصد تبلیغ اسلام نہیں جیسا کہ نام سے دھوکہ ہو سکتا ہے، بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور مرکزی حالت کو ختم کرنے کیلئے یہ ایک مستقل ادارے کی صورت میں قائم ہے جسمیں کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو از سر تا پا ہندو تہذیب (یا نئی ہندوستانی تہذیب) میں گھل مل چکے ہیں مگر جنکے نام ابھی تک مسلمان ہیں۔ اسی شعبہ کے ایک ذمہ دار کارکن جناب منظر صاحب رضوی بھی ہیں مدینہ مورخہ یکم نومبر ۱۹۳۸ء میں آپ کا ایک طویل مضمون مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت کے عنوان میں شائع ہوا اُسمیں آپ لکھتے ہیں :-

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو مل جاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے مسلمان آپسمیں کیوں ملیں؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ مقصد کیا؟ جہانتک توحید رسالت مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل کا

تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں اور بالکل متحد ہیں انمیں کوئی اختلاف نہیں
لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض کیلئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے
وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ انکو متحد ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اغراض اور
فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں تمام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد
عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم اکثر متضاد
اور مختلف ہیں ان میں کوئی یگانگت نہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی
حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں[1]۔"

پنڈت جی اور انکے وفادار مسلمان سپاہیوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرمائے
کتنے صاف اور کھلے ہوئے اعلانات کے ساتھ یہ سوراجی فوج مسلمانوں کی
قومیت ان کی جداگانہ تہذیب و تمدن اور انکے مرکزی نظام کو ختم کرنے
پر تلی ہوئی ہے۔

ان کے نزدیک تہذیب و تمدن نام ہے ظاہری اطوار و عادات لباس اور
کھانوں کے اقسام کا۔ جس طرح یہ مذہب کو محض پوجا پاٹ میں محدود کر کے جماعتی
حیثیت اور مذہب کی ہمہ گیر قوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اسیطرح ڈاکٹر اشرف کے
الفاظ میں کلچر نام ہے دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا یا دیوبند اور فرنگی محل کے
علماء کے لباس کا[2] اور ان کا خیال ہے کہ مسلم لیگ اسی تمدن کو زندہ رکھنے کے
لیئے تمام جدوجہد کر رہی ہے۔

زمانے کے حوادث اور انقلابات یا کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں
آب و ہوا کے اختلاف سے جو تغیر اور اختلافات لباس و زبان اطوار اور عادات

---

[1] بحوالہ الفرقان محرم ۱۳۵۸ھ (مجموعہ مضامین مولانا ابو الاعلیٰ مودودی)

میں واقع ہوتے ہیں اُس سے یہ لوگ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلم تہذیب میں وحدانیت
نہیں ہے ان لوگوں کے افلاس تخیل اور قلت مطالعہ کا اس سے زیادہ اور کیا
ثبوت ہو سکتا ہے یا پھر سراسر حیلۂ فریب سازی اور تجاہل عارفانہ!۔

مسلم تہذیب کے متعلق مفصل مضمون ڈاکٹر عبداللطیف صاحب حیدرآبادی
نے قلمبند کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے
کہ تہذیب نام ہے اس طرز فکر اور طرز زندگی کی خصوصیات کا جسکو برقرار رکھنے
کی خواہش ہر قوم کے دل میں ہوتی ہے، تہذیب نام ہے اس ذہنیت اسلوب
فکر اور معیار زندگی کا جو کسی جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو اور جسکی رہنمائی
اور روشنی میں وہ جماعت اپنی روزمرہ زندگی کیلئے اطوار و عادات کا خاکہ
تیار کرے اور اُس خاکہ کو عملی جامہ پہنانے کا نام ذہنیت اور اصول حیات کا
نام تمدن ہے۔ وہ نقشہ جسکو تہذیب کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس قوم کی سیاست
اور مذہب کا آئینہ دار ہوتا ہے اُس نقشے کو دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ
اسپر عمل کرنیوالی قوم سیاست کی کونسی منزل پر ہے۔ آب و ہوا اور ملکی اختلافات
سے لباس، زبان اور عادات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وہ ذہنیت طریق
فکر اور اصول حیات جو مذہب نے مقرر کر لیا ہے ہر جگہ یکساں رہتا ہے یہی
وحدانیت تمدن کا سبب ہے کہ باوجود اختلاف زبان اور لباس کے مصر کا مسلمان
ہندوستان کے مسلمانوں میں آکر کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا اسلئے کہ اسلامی
حدود لباس و اطوار سب یکساں ہیں ممکن ہے دونوں کے لباس میں کوئی فرق
ہو مگر ستر کے حدود کا وہی خیال ہوگا جو اسلام نے مقرر کر دیے ہیں دونوں کے

کھانوں میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو مگر حدود ملت سے متجاوز ہوگی تو وہ کھانا غیر اسلامی قرار دیا جائے گا اسطرح جو تغیر رونما ہوتا ہے وہ محض ظاہری ہو لیکن اصلیت اور اندرونی ذہنیت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کی اپنی تہذیب و تمدن کے بقا کی کوشش اور جد و جہد سے محض یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم محض دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کو بچانا چاہتے ہیں یا کسی خاص قسم کے لباس کے بچانے کی فکر ہے۔ پورے چمن کی سیر کرنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ دیوار میں جھانکنے سے حقائق پر دسترس حاصل نہیں ہوتی زبان اور لباس سے زیادہ ہمیں اس ذہنیت اور اصول حیات کو اسلامی رکھنا مطلوب ہے، جس کے اظہار کیلئے زبان و لباس وسیلہ ہیں۔ اگر ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے کہ ہماری طرز فکر دل و دماغ قرآن اور حدیث کے مقرر کردہ راستے سے منحرف نہ ہونے پائے تو ہمارے اسلامی لباس اور زبان کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی۔ اگر ہمارے اعتقادات، خیالات اس اسلامی طریق فکر پر مرکوز رہے جس نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کا دعوے کیا ہے تو ہمیں ان ظاہری وسیلوں کے تغیر کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ اگر آج ہم ظاہری اسلامی خصوصیات اور قومی زبان کے برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں کیونکہ یہ اسلامی ذہنیت اور اسلامی تہذیب کا مظاہرہ ہیں تو وہ بھی اسلئے کہ مبادا اقوام غالب کا تمدن ہماری ذہنیتوں کو مرعوب کر کے غیر اسلامی نہ بنا دے۔ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے ظاہری نقشے سے اندرونی عمارت کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان کے باشندے انگریزی اطوار اور عادات اختیار کر لیتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ہندستانی

انگریزی سیاست سے مرعوب ہوکر اپنی ذہنیتوں کو بالکل بدل چکے ہیں اسی طرح بندے ماترم کے ملحدانہ گیت گانے کے روشنی، ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کرنے اور اُردو کو ہندی اور سنسکرت سے تبدیل ہوتے دیکھ کر احتجاج کرنے سے بھی یہی مطلب ہے کہ مسلمانان ہند کہیں ہندو قوم کے غلبۂ تمدن سے مرعوب ہوکر اپنی ذہنیتوں اور اصول حیات کو غیر اسلامی نہ بنا ڈالیں اگر ان کی ذہنیت اور طرز فکر مغلوب و مرعوب ہوگئی تو ان کی سیاسی حالت بھی زوال پذیر ہونی یقینی ہے اور اگر سیاسی ارتقا حاصل بھی ہوگیا اور دل و دماغ اسلامی نہ رہے تب بھی ہمیں اسلامی تہذیب کی خدمت کرنے کا فخر حاصل نہو گا۔ اسلامی تہذیب کی تشریح کے بعد ذرا آگے بڑھیے۔ مشترک قومی تہذیب کے وعظ میں مذہب کی جھلک ابھی باقی تھی اور اُسکا امکان نظر آتا تھا کہ اسلامی تہذیب کو ضم کرکے مذہب کی راہبانہ شکل کو گوارا کر لیا جائے مگر پنڈت جی اور کانگریس کے دوسرے مقتدر رہنما مذہب کی تنظیم کو کسی شکل میں برداشت نہیں کر سکے۔ کانگریسی حکومتیں اپنے صوبوں میں اسی قومی تہذیب کی بنیاد پر تعلیمی نقشہ تیار کر چکی ہیں اسی اسکیم کا نام واردھا اسکیم ہے۔ اسکا سب سے اہم جز و یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کو بالکل ختم کر دیا جائے اس طرز عمل کو گاندھی جی مندرجہ ذیل الفاظ سے صحیح ثابت کرتے ہیں:۔

"ہم نے واردھا اسکیم میں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا ہے کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ جس طرح مذاہب کی تعلیم آجکل دیجاتی ہے اور اُنپر عمل کیا جاتا ہے وہ بجائے اتحاد کے اختلافات پیدا کرتے ہیں۔"

اسی خیال کو دوسرے معنوں کے ساتھ پنڈت جی کی زبانی سنیے۔ آپ فرماتے ہیں:

"منظم مذہب بلا استثنے مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور
یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے
حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اسکا رویہ یہی ہے۔"

(میری کہانی صفحہ ۱۲۷ و صفحہ ۱۲۸)

پنڈت جی مذہب کے معاملہ میں بلا تامل اپنی بیزاری کا اعلان فرماتے ہیں۔ خدا
کے وجود سے وہ یہاں تک منکر ہیں کہ جب ڈاکٹر عالم کے مقدمہ میں پنجاب کی
عدالت میں انکو ایک شہادت میں پیش ہونا پڑا اور حلف اٹھانے کی نوبت آئی
تو آپ نے صاف فرما دیا کہ:۔

"مجھ سے وہ حلف اٹھوائیے جسمیں خدا کا نام نہ آئے۔"

مذہب اسلام کے متعلق آپ کے چند اقوال مندرجہ ذیل ہیں:۔

"ان لوگوں سے جو کسی عقیدہ کے سختی کے ساتھ پابند ہوں اس موضوع
پر بحث کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے خصوصاً مسلمانوں سے۔ مذہب کے معاملہ
میں گفتگو کرنا دشوار ہے کہ ان کے مذہب میں آزادی رائے کی زیادہ
گنجائش نہیں ہے" (میری کہانی، صفحہ ۲۰۳)

دوسری مثال۔

"اسکے بعد جو کچھ انھوں نے (مولانا محمد علی نے) کہا اس پر واقعی مجھے بڑا
تعجب ہوا۔ کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی قرآن کو بے تعصب ہو کر
تلاش حق کے خیال سے پڑھیگا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا۔"

(میری کہانی صفحہ ۲۰۴)

ملاحظہ فرمایا! پنڈت جی گاندھی جی سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی صحت پر کسی کو یقین ہو تو پنڈت کو اس پر سخت تعجب ہوتا ہے۔ مولانا محمد علیؒ کے سلسلے میں پھر فرماتے ہیں:۔

"ان (محمد علی) میں مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جیسں میرے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی۔ میں اس معاملہ میں بالکل برعکس تھا انہیں اور مجھ میں خدا کے وجود پر اکثر بحث رہا کرتی تھی۔ محمد علی کی یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قراردادوں میں کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں برخلاف اسکے میں احتجاج کرتا۔" (میری کہانی صفحہ ۲۰۰ و صفحہ ۲۰۱)

شیدائیان اسلام اور بالخصوص علمائے کانگریس پنڈت جی کے ان الفاظ پر غور کرکے فیصلہ کریں کہ نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب کی جو جماعت پنڈت جی کے اقوال و افعال کو اپنا آئیڈیل اور نصب العین سمجھتی ہے ان سے کیا اثر پڑے گا اور ان سادہ لوح دیہاتی مسلمانوں پر ان نصائح کا کیا اثر ہوگا۔ جنکے سامنے کانگریسی مسلمان جاکر پنڈت جی کے ایثار اور حب الوطنی کے افسانے سنایا کرتے ہیں اور جنکے اعلانات کو الجمعیۃ میں "پنڈت جی کا نعرۂ حق" کے عنوان سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ اسی قسم کے پروپیگنڈوں کا اثر ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم مسٹر شفیق احمد نقوی سے ڈیڑھ سال قبل جب دریافت کیا جاتا ہے کہ ان کا کیا مذہب ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "اگرچہ انکے باپ دادا مسلمان تھے مگر انکا کوئی مذہب نہیں ہے وہ کسی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے وہ ہندستانی ہیں"

انکے اس زبردست کارنامے کا کانگریس حلقوں میں بڑی مسرتوں سے استقبال کیا گیا اور اپنی فاتحانہ کامیابی پر کانگریس ہرا لڈ نے خوب خوشیاں منائیں۔ ہندوستان ٹائمز نے مندرجہ ذیل الفاظ میں انکو مبارکباد دی، ہندوستان ٹائمز کانگریس کا آرگن ہے جسکے منیجر گاندھی جی کے فرزند ارجمند ہیں :-

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کیلئے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے قبل لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائیگا اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جسکو ہمارے آقاؤں نے اسقدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اسوقت بیکار ہو کر رہجائیگا جبکہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لیں گے لہذا مسٹر نقوی کو مستقبل کیلئے فال نیک سمجھنا چاہئے اور کیا خبر کہ وہ آنیوالی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"

اگر صورت حال اسی رفتار سے جاری رہی اور اس تباہ کن انقلاب کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ تحریک بہت خراب نتائج پیدا کرے گی جن کا اثر آئندہ نسلوں پر بہت بری طرح پڑیگا۔

فصل چہارم

تحریک وطنیت

بلکے خیر سے ہے بیحد کہ دین وطن   اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

سلہ الانتخابات اور اسلام، مودودی، الفرقان محرم ۱۳۶۴ھ۔

کانگریس کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ مسلمانوں میں لامذہبیت پھیلانے
کیلئے اور ان کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کیلئے "تجدید وطنیت" کی تحریک ہے،
یہی وہ ہتھیار ہے جس سے جنگ عظیم کے بعد مشرقی اسلامی ممالک کی وحدت
اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا اور خلافت کی قبا کو چاک کر دیا۔ اس عقیدہ کی بنا پر
عراق فلسطین اور ترکوں کی ہم آہنگی اور یک جہتی کو ختم کیا گیا۔ ہندوستان دو سو
برس سے غلامی میں جکڑا ہوا ہے، حبش کی لاش ابھی تک بے گور و کفن ہے۔
چین عالم نزع میں گرفتار ہے۔ یہ سب "تجدید وطنیت" اور "قومیت" کے کرشمے ہیں

وطنیت کا سیاسی تصور | وطن جب ایک جغرافیائی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے
تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں اور ہندوستانی
کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ فطری طور سے ایک تعلق اور وابستگی ہے اسکی
ہر مصیبت اور آرام میں ہم مساوی طور سے شریک ہیں اور اُسکے فلاح اور مفاد کیلئے
ہم پر ہر قسم کی قربانی لازم ہے۔ لیکن جسطرح کسی شخص کے لکھنؤ کا باشندہ ہونے
اور لکھنوی کہلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسکی وطنیت لکھنؤ ہی میں محدود ہے
اسیطرح ہندوستان میں وطن ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہندوستان کے
مسلمان اپنی وطنیت کو ہندوستان ہی میں محدود رکھیں اور بیرون ہند کے مسلمانوں
سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ "تجدید وطنیت" کا یہی تخیل ہے کہ انسان جس ملک کا باشندہ
ہو اپنے تعلقات سیاسی اسی ملک میں محدود رکھے۔ موجودہ زمانے میں
"نیشنلزم" بحیثیت ایک سیاسی تصور کے ایک مستقل عقیدہ ہے جسکی رو سے "وطن"
ایک بت اور دیوتا سے کم نہیں مانا جاتا۔ ایک وطن پرست کے نزدیک حب الوطنی

خدا پرستی سے بھی بڑھکر ہے۔ اسکے سامنے کوئی نیکی، اخلاق یا مذہب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ۔ جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ہندوستان میں یہ عقیدہ اہل مغرب نے پھیلایا جواب عام ہوتا جا رہا ہے۔ عرصہ ہوا علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔ ؎

گرد مغرب آں سراپا مکر و فن ۔ اہل دیں را داد تعلیم وطن

اس عقیدہ کا بانی میکیاولی ہے جو فلارنس (اٹلی) ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا تھا جسکے متعلق حضرت اقبالؒ نے فرمایا ہے ؎

دہریت چوں جامۂ مذہب درید ۔ مرسلے از حضرت شیطاں رسید
آں فلارنسادی باطل پرست ۔ سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
مملکت را دین او معبود ساخت ۔ فکر او مذموم را محمود ساخت
بت گری مانند آذر پیشہ اش ۔ بست نقش تازۂ اندیشہ اش

اس عقیدے کی رو سے اسٹیٹ یا حکومت خیر اکبر، خیر کل، خیر مطلق ہے اور انسان وطن اور اسٹیٹ کا محکوم محض ہے۔ اسکی ہر آواز خواہ وہ کیسا ہی مذہبی فرض کیوں نہو۔ اگر وطن سے متصادم ہوتی ہو تو بغاوت کے مترادف ہے اور بغاوت کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے، فرد سلطنت کے لئے ہے نہ کہ سلطنت فرد کیلئے، اسٹیٹ غلطی کر ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ نہ صرف معصوم عن الخطا ہے بلکہ ہر جائز و ناجائز اور خیر و شر کا سرچشمہ اسٹیٹ یا وطن ہے لہذا اسٹیٹ حکومت کو حق حاصل ہے کہ ہر اس شخص یا جماعت کو جو خیر مشروط سرتابی سے

انکار کرے فنا کردے، خواہ حکومت کتنی ہی جابر کیوں نہ ہو فرد کو کوئی حق نہیں کہ مخالفت کرے (حالانکہ اسلام میں ظالم حکومت کے خلاف آواز اٹھانا ہی جہاد اکبر ہے) جو شخص وطن یا اسٹیٹ کی وفاداری میں کمی کرے وہ کافر قومیت اور گردن زدنی ہے۔ پارٹی ڈکٹیٹر شپ (جامع مطلق العنانی) یا اکثریت کی جابرانہ حکومت اسی عقیدہ پر مبنی ہے۔

اس عقیدہ کا سب سے اول سبق یہ ہے کہ مذہب اور سیاست دو جدا جدا چیزیں ہیں مذہب صرف انسان اور خدا کے انفرادی تعلق کا نام ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے اور حکومت ہی اصل شے ہے۔ لہذا مذہب سیاست کے ماتحت ہے یہی وہ عقیدہ ہے جسکا پروپیگنڈا کانگریس کے ہر لیڈر کی زندگی کا اہم پروگرام ہے متحدہ قومیت اور متحدہ قومی تہذیب کا جذبہ اسی باطل عقیدہ کا نتیجہ ہے جس کی رو سے ہر دوسری تہذیب جو مذہب پر موسس ہو فنا ہونی چاہیئے۔ اس باطل عقیدہ کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوے دیگرے
باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند پیش پائے ایں بت نا ارجمند
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل گرمی خونت ز صہبائے خلیل
بر سر ایں باطل حق پیرہن تیغ لا موجود الا ھو بزن

وطنیت کے مفہوم کا اصل خلاصہ یہ ہے کہ خدا [illegible] حیات بعد الممات

نیکی، تقوےٰ، سب الفاظ بے معنی ہیں، وطنیت اور قومیت ہی انسان کا مقصود حیات بلکہ معبود ہے اسی کے لیئے انسان کو جینا اور اسی کے لئے مرنا ہے۔

علامہ اقبال صاحب نے آج سے آٹھ سال قبل اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ میں فرمایا تھا۔

"سیاسیات کی جڑ حقیقتاً انسان کی روحانی زندگی میں ہے میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی کا رکا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوسائٹی ہے یا اگر آپ پسند فرمائیں تو اُسے ملکی اور مذہبی نظام کہہ سکتے ہیں۔ میرے سیاسیات میں دلچسپی لینے کا اصلی سبب یہ ہے کہ کہیں دورحاضر کے سیاسی اصول جو دہریت پر مبنی ہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کو متاثر نہ کردیں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم (وطنیت) کا سخت مخالف ہوں اسی نیشنلزم کی تعلیم ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہے کیونکہ مجھے اسمیں دہریت اور الحاد کے جراثیم نظر آتے ہیں اور یہ جراثیم انسانیت کیلئے سخت مضر ہیں۔"

علامہ مرحوم نے اس نظریے کی مخالفت ہمیشہ سے کی ہے بالخصوص جب سے فلسطین اور ترکوں کو اسی نیشنلزم کا شکار بنایا گیا اور اہل مغرب نے وحدت اسلامی کو ختم کرنے کیلئے یہ حربہ اُٹھایا تھا۔ اس نظریے کے متعلق آپ نے فرمایا ہے :۔

"قوم میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے   قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے"

پھر آپ نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے :-

جہان تنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا   نہ افغانی رہے باقی نہ ایمانی نہ تورانی

وطن محض جغرافیائی اصطلاحی حیثیت میں اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو موجودہ سیاسی عقیدہ میں پنہاں ہے جسمیں وطنیت کو دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے ؎

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے   گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

گفتار سیاست کے اس تخیل وطن کا سیلاب ہندوستان میں نمودار ہوچکا ہے اور بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے برادران وطن اس عقیدہ کو بہت جلدی سے قبول کررہے ہیں چونکہ بت پرستی اہل ہنود کا فرض قدیم ہے اسلئے بہت سے پرانے بتوں میں ایک نئے بت وطن کا اضافہ کرلینا کون بڑی بات ہے۔

بندے ماترم کا گیت اسی وطن پرستی کا ایک اعلےٰ تخیل ہے جسمیں وطن کو دیوی تسلیم کرکے لکشمی اور درگا وغیرہ سے تشبیہ دیگئی ہے اسی عقیدہ پر عامل ہوکر دو تین سال قبل بنارس میں ایک بھارت مندر تعمیر کیا گیا ہے جس میں ہندوستان کی دیوی کی مورت کی پوجا کی جاتی ہے اسمیں بجائے کرشن اور رام کے گاندھی جی اور دوسرے زعمائے کانگریس کے بت نصب ہیں جنکے سامنے ڈنڈوت کرنا فرض ادنیٰ ہے اسی مندر کی افتتاح گاندھی جی نے بہت شان سے کی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس مشرکانہ رسم میں سرحد کا سادہ لوح مجاہد خان عبدالغفار خاں بھی شریک ہوا گاندھی آشرم میں ہر جگہ ہر صبح کانگریس کے جھنڈے کی پوجا کی جاتی ہے (چند ماہ قبل ہی خان عبدالغفار خان نے کراچی میں ایک مندر پر کانگریسی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی ہے)۔

بہرحال کانگریس میں اس وطنیت کا تخیل روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور اطلی اور جرمنی سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے افسوس یہ ہے کہ کانگریس اور ہندوستان کے قومی رہنما ایک طرف مغربی ملوکیت سے جنگ کا دعوے کرتے ہیں اور دوسری طرف خود مغربی سیاست اور نفسانی ملوکیت کو اختیار کرنے میں مصروف ہیں ان کا ہر ہر لفظ مغربی سیاست سے مستعار اور خود عملی طور سے مغرب کی تقلید میں مصروف ہیں وہ ہندوستان میں اطالوی فسطائیت اور المانوی نازیت کے عقیدوں کی بنیادیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔

مغربی اقوام نے نیشنلزم کی مدد سے مسلمانان عالم کی مرکزیت کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی اب کانگریس مسلمانان ہند کی مرکزیت کو ختم کرنے اور ان کا سیاسی و مذہبی تعلق بیرون ہند کے مسلمانوں سے ختم کرنے میں اسی ہتھیار سے کام لے رہی ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں کے خلاف برطانیہ کی اور کانگریس کی خارجی پالیسی ہمیشہ ایک ہوتی ہے جسطرح سرکار برطانیہ اور یورپ کی دیگر طاقتیں مسلمانوں کے مرکزی نظام اور قیام خلافت سے جراغپا ہوتے ہیں اور ایسے اداروں کو جنکے ذریعہ مسلمانان عالم ایک رشتہ میں منسلک ہو سکیں خطرہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے اسیطرح کانگریس کو مسلمانوں کی جماعتی اور مرکزی پوزیشن سے ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں مسلمانان ہند بیرونی ممالک کے مسلمانوں سے تعلقات پیدا کرکے اُن کی مدد سے ہندوستان پر پھر قبضہ نہ کر بیٹھیں۔

یہی وہ سبب ہے جو پنڈت جی کو قادیانیت کی حمایت پر مجبور کرتا ہے

علامہ اقبال رحؒ نے جب انجمن حمایت الاسلام کی صدارت سے اس بنا پر استعفےٰ
دیدیا تھا کہ وہ اس جماعت میں قادیانوں کی موجودگی کو گوارا نہ کرسکتے تھے
تو پنڈت جی نے علامہ اقبال کی "عدم رواداری" پر بہت کچھ اظہار افسوس کیا۔
حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ قادیانیت کا ربرطانیہ کا ہی خود کاشتہ پودا ہے
اور برطانوی امپریلزم کے زیرسایہ پروان چڑھ رہا ہے لیکن پنڈت جی کو محض
اسلئے اس مذہب سے ہمدردی واقع ہوئی ہے کہ یہ سب سے مہلک ضرب ہے جو
مسلم مرکزیت پر پڑ سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر شنکرداس صاحب کے مضمون کا مندرجہ ذیل اقتباس
از "بندے ماترم" اخبار اس حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے:-

"ہندوستانی قوم پرستوں کو اگر امید کی کوئی شعاع دکھائی دیتی ہے تو وہ
احمدیت کی تحریک ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان جسقدر احمدیت کی طرف
راغب ہونگے اسی قدر قادیان کو مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخرکار قوم
پرست بنجائیں گے۔ مسلمانوں میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلامزم
کا خاتمہ کرسکتی ہے تو وہ یہی احمدی تحریک ہے۔ جس طرح ایک ہندو کے مسلمان
بنجانے پر اسکی شردھا اور عقیدت رام، کرشن، وید اور گیتا سے اٹھکر حضرت
محمد صاحب اور قرآن مجید اور عرب کی بھومی میں منتقل ہوجاتی ہے اسی
طرح جب کوئی مسلمان احمدی بنجاتا ہے تو اسکا زاویہ نگاہ بھی بدلجاتا ہے
حضرت محمدؐ میں اسکی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور جہاں پہلے اسکی
خلافت عرب میں تھی اب وہ قادیان میں آجاتی ہے۔ ایک احمدی خواہ

---

[1] بحوالہ ترجمان القرآن صفر ۱۳۵۵ھ صفحہ ۸۵۔

وہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو روحانی شکتی حاصل کرنے کیلئے وہ اپنا

منہ قادیان کی طرف کرتا ہے۔"

یہ سب مختلف طریقے مسلم تہذیب و مسلم مرکزیت کو ختم کرنے کیلئے کئے جا رہے ہیں۔ آج وطنیت اور قومیت کے جدید تخیل نے سائنس کی قوتوں کی مدد سے اسلامی نظام مرکزیت کو ہضم کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور غضب یہ ہے کہ ہمارے بعض دینی پیشوا اسلامی جرائد اور قومی شعرا اپنی سادہ فطرت اور مطالعہ کی کمی کی بنا پر "وطنیت" کے تمام لوازم پر غور کئے بغیر انھیں کی تائید میں مصروف ہیں۔ قوموں کی اساس مذہب کے بجائے "وطنیت" پر ثابت کی جا رہی ہے۔ مسلم علماء خود مذہبی رشتہ کی اخوت کے بجائے "وطنیت" کے رشتہ کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ وہی پنڈت جواہر لال نہرو کا مشہور عقیدہ ان کی زبانوں سے بھی ادا ہو رہا ہے پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔ مسلم قوم کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے اسلئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پاسکے گی۔" (میری کہانی صفحہ ۳۳۱)

ان ہی الفاظ کے ساتھ مولانا حسین احمد صاحب کا یہ ارشاد گرامی بھی ملاحظہ فرمالیے:۔

"موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل و مذہب سے

نہیں بنتیں۔ دیکھو انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم کے شمار کئے جاتے ہیں ..... یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرف انسانی اور اخوت بشری پر رکھتی ہے مجھے معلوم نہیں کہ کس نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے جس کی بنا پر اختلاف اوطان وغیرہ پر اطلاق لفظ قوم ممنوع ہو ...... ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کیلئے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت نہیں جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے اسکے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔" (انصاری ۱۷ فروری ۳۸ء)

پنڈت جی کے الفاظ کا تقابل مولانا کے اس بیان سے کریجیے اور دیکھیے کہ کس قدر باہمی تطابق ہے دونوں میں۔ گویا ایک ہی خیال دو زبانوں سے ادا ہوا ہے۔ ہمارے قومی شاعر ساغر نظامی (جنکی شاعری اع "مذ نگ جستہ ہے لیکن کمان سے دور نہیں") کانگریس کے اسی جذبۂ وطنیت کو اسطرح ادا کرتے ہیں ؎

دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو ۔ تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دینگے ہم

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے اعتقادات اور خیالات کے تغیر کو دیکھ کر بیحد حیرت ہوتی ہے آج کے مولانا آزاد صاحب ۱۹۱۲ء کے آزاد سے بالکل مختلف ہیں ۱۹۱۲ء کی حق پرست آواز ملاحظہ ہو۔ آپ ایک مضمون میں اس زمانے میں مسلمانوں کی عالمگیر وطنیت پر بدیں الفاظ اظہار خیال فرماتے ہیں:۔

"انسانیت اور حق وعدل کے پرستاروں کیلئے امتیاز این وآں نہیں ہے۔ وہ حدود وطن کی قید سے منزہ، زمین و مرز بوم کی تمیز سے پاک ہیں،

ان کے لئے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس، اور اسکے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔ وہ انسانیت کے خادم ہیں۔ ان کی محبت کا نوعی شرف، وطن وقوم کی ادنیٰ ترین تقسیموں سے آلودہ نہیں ہوتا اسکے کانوں میں جہاں کہیں سے بھی انسانیت کی فریاد الغیاث آتی ہے، آنکھوں کے آنسو اور دل کے زخموں کو اپنے استقبال کیلئے مہیا پاتی ہے۔ مشرق و مغرب انکے لئے یکساں ہے۔ عزیز و بیگانہ کی تفریق میں ان کیلئے آزمائش نہیں۔ طرابلس مقدونیہ کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر اگر وہ ماتم کرتے ہیں تو جنوبی افریقہ کے ان قتیلان حق و انصاف خونچکاں زخموں کو بھی دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں جنھیں کوڑوں کی وحشیانہ ضربت نے خاک و خون پر لٹا دیا ہے۔ ولیس الایمان یحب الوطن انما الایمان یحب العالم۔

عارف ہم از اسلام خراب است وہم از کفر　　پروانہ چراغ حرم و دیر ندارد

اسلام اسی عالم پرستی کی دعوت لیکر آیا وہ اپنے پیرووں کو وطن پرست نہیں بلکہ انسانیت پرست دیکھنا چاہتا ہے۔"

یہی حقیقت میں عین اسلام ہے وطن کے لحاظ سے ایک سچے مسلمان کیلئے عرب کا ریگستان ہندوستان کی سرسبز زمین اور دنیا کا ہر گوشہ برابر ہے ؎

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

تمام روئے زمین رسول کی مسجد ہے ایک مسلمان تمام دنیا کو اسی طرح آزاد دیکھنا چاہتا ہے جس طرح خود اپنی مرزبوم کو اسکو تمام عالم میں انسانیت کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آتا ہے آزادی اور سچائی کی روشنی تمام عالم میں پھیلاتا ہمارا

فرض اولیں ہے اسلئے کہ ع ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔
اسی عقیدہ کی تبلیغ میں علامہ اقبال کی تمام عمر گذر گئی اور مولانا محمد علی نے کبھی اسکو ترک نہیں کیا حالانکہ ہندوستان کی محبت کا آپ سے زیادہ کوئی مدعی نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کو خطاب کرتے ہوئے ایک مضمون میں فرمایا تھا:۔

"سب سے سوچے سمجھے کمال تعیم کے ساتھ یہ کہدینا کہ کمیونزم یا ملیت (نیشلزم) قومیت کے منافی ہے اس سے زیادہ دقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پرستی کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اور اُن کی تنظیم سے منع کرتا ہوے قومیت کو منتہائے نظر بنا تا یورپ کی تقلید جا رہے ہے اور "وطنیت" خود وثنیت" یعنے بت پرستی ہے اسلام وطن پرور ہے وطن پرست نہیں"

بہرحال یہی وہ عقیدہ ہے جسکی بنا پر تمام دنیا کے مسلمان جغرافیائی حدود سے بالاتر ہوکر ایک مرکز پر جمع ہوئے ہیں۔ اسی عقیدہ پر مولانا ابوالکلام صاحب ۱۹۲۰ء تک عامل رہے لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ وہ ہی انسانیت پرستی کی دعوت دینے والا اور وطن پرستی کے بجائے مذہبی رشتہ میں انسانوں کو منسلک ہونے کی نصیحت کرنے والا رہبر ملت آج سراسر ہندوستانی بن چکا ہے اب وہ گاندھی جی کے آشرم میں رسوئی میں بیٹھ کر پیتل کے برتنوں میں بابو راجندر پرشاد کے ساتھ زمین پر بالکل ہندوانہ رسم کے مطابق "بھوجن" کھانے سے

عار نہیں کرتے۔ اب انکو فلسطین کے مظالم پر دو آنسو بہانے کی فرصت نہیں بلکہ اب انکی تمام تر پرواز اسی فضلے ہندوستان میں محدود ہے۔ اسلئے کہ بقول خود آنکے پاس وہ عینک ہی نہیں ہے جس سے وہ مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کو دیکھ بھی سکیں۔ اب وہ مذہبی رشتۂ اخوت کے قائل نہیں بلکہ وطنیت اور قومیت نے انکے دل کو بھی کھینچ لیا ہے۔ افسوس! یہ دنیا کا انقلاب کس طرف جارہا ہے ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

افسوس یہ ہے کہ جبکہ یورپ "وطنیت" کی لعنت سے تنگ آچکا ہے، مغربی مفکرین اور مدبرین اسکے خلاف آوازیں اٹھارہے ہیں، برنارڈ شاہ ور ایچ جی ویلز کے مضامین اسی موضوع پر بھرے پڑے ہیں، خود کانگریس کے مربی قدیم ڈاکٹر ٹیگور "نیشلزم" کے خلاف کتابیں تصنیف کرچکے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے ہندوستانی لیڈر اس باطل حق پیرہن کی طرف لپک رہے ہیں اور نتائج سے بے خبر ہیں۔

"نیشلزم" کے شیدائی اور امپیریلزم سے نفرت کرنے والے حضرات یہ نہیں سوچتے کہ نیشلزم اور امپیریلزم یعنے وطنیت اور ملوکیت دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی پیداوار ہیں۔ چونکہ نیشلزم کا پہلا اصول اپنی قومیت اور نسل کی برتری اور خالصیت ہے اسلئے اپنی قوم اور وطن کی ترقی و بہبود میں ہر جائز و ناجائز کوشش لازمی امر ہے اور وطنی ملک کے

ملہ یکم اگست ۱۹۳۸ء کو ہندوستان ٹائمز نے مولانا کی تناول طعام کی تصویر شائع کی تھی اسکو دیکھ کر فقیر کا ... رہ گیا تھا۔

حدود اور قومی دولت میں اضافہ کرنا ہر وطن پرست کا فرض ہے۔ ہندوستان کے وطن پرستوں کے دل میں بھی افغانستان اور ایران و مصر کے ممالک کو حدود ہندوستان میں شامل کر لینا ان کے عقیدہ کے لحاظ سے نہایت پاک جذبہ ہوگا فرض کیجیے اگر کل کو برطانوی سنگینوں کے سایہ میں ہی ان ممالک کو خدانخواستہ ہندوستان کی حدود میں ملانے کی ترغیب دیجائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کا طرز عمل موجودہ وطنیت کے ہوتے ہوئے کیا ہوگا؟ یا اگر آئندہ چلکر مسلمانوں کی خلافت اسلامیہ کے قیام کا خواب پورا ہوجائے اور کل کو آزاد ہندوستان کے ڈکٹیٹر کا تصادم خلیفۃ المسلمین سے ہوجائے تو آجکل کے وطنیت کے حامی اسوقت اپنے وطن کا ساتھ دینگے یا خلیفۃ المسلمین کا؟

آج اس خطرے کا احساس "قومیت" کی بنا "وطنیت" پر رکھنے والے حضرات نہیں کر سکتے لیکن آئندہ چلکر جب خاکم بدہن دہریت جامۂ مذہب کو تار تار کر دے گی اور اسلامی ملت وطنیت میں جذب ہوکر نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر پھیلی ہوئی وحدت اسلامی مختلف اوطان میں تقسیم ہوجائے گی تو اسوقت خلیفۃ المسلمین ایک بے معنی لفظ بنجائے گا اور ہندوستان کے مسلمان جو صرف نام کے مسلمان رہجائیں گے۔ اگر مدینہ اور ہندوستان میں بھی جنگ چھڑ جائے تو اپنے مرکز ملت سے جنگ کرنے پر مجبور ہونگے یہ وہ مسئلہ ہے جو کافی غور و فکر کا محتاج ہے۔ ؏

پس نخستیں بایدش تطہیر فکر — بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

انھیں خطرات اور اسباب کی بنا پر مسلمانانِ ہند کا کسی ایسی جماعت میں انفرادی

طور سے شرکت کرنا جس کی بنیاد محض وطنیت پر ہو اور جسکا مقصد بیرونی تسلط سے محض معاشی نجات حاصل کرنا ہو سخت سیاسی غلطی ہے۔ جماعتی حیثیت سے انکو اپنا مرکزی نظام قائم رکھنا ہے اسلئے اپنی جماعت کی تنظیم ہر وقت فرض ہے ان کا دوسری جماعتوں سے ہر معاہدہ جماعتی حیثیت میں ہونا چاہیئے۔

خود عرب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ رسول مقبول صلعم کی پیدائش کے وقت تمام عرب بیرونی طاقتوں سے مسلط تھا آپ کی پیدائش کے چند روز قبل ہی حبشی فوجیں آپ کے زاد بوم تک چڑھ آئی تھیں۔ حبشی اور پھر ایرانی باری باری سے یمن پر قبضہ جما چکے تھے، عرب کا جنوبی اور مغربی حصہ ایرانیوں کے زیر اثر تھا لیکن نبی آخر الزماں نے ایک محب وطن دوست کی حیثیت سے وحدت عرب کیلئے یا ملکی آزادی کیلئے کانگریس کے طرز پر کسی ایسی جماعت کی بنیاد نہیں ڈالی جو وطنیت پر مبنی ہوتی اور جسمیں امۃ مسلمۃ للہ اور الکفر ملۃ واحدۃ مشترکہ طور سے شرکت کر سکتے بلکہ آپ نے ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈالی جسکا مقصد مذہب کو آزاد کرانا تھا جو نہ صرف عرب میں بلکہ خود روم اور ایران میں آزادی پھیلانا اپنا فرض سمجھتی تھی، پھر ہندوستان میں کسی ایسی جماعت کی تشکیل جو وطنیت پر موسس ہو کہاں تک اسلامی ہے۔ ظاہر ہے ایسی جماعت میں جبکہ غیر مسلموں کی اکثریت ہوگی تو جو دستور العمل بھی مرتب ہوگا وہ غیر اسلامی ہوگا اور پھر وہ دستور العمل جو غیر اسلامی ہے نا مردود اور نا مقبول ہے۔

بیشک اتحاد کار اور اشتراک عمل ہر قوم سے کیا جا سکتا ہے اور آزادی ہند کیلئے تو لازمی امر ہے۔ لیکن اس قسم کے اتحاد یا اشتراک سے "وطنیت" کی بنیاد

نہیں پڑتی۔ آزادی ہند کے لیے ہندوستان کی مختلف قوموں کا آپس میں اشتراک عمل کرنا "وطنیت" پر مبنی ہے بلکہ ہندوستان کے مسلمان یہاں کی دوسری قوموں سے اسیطرح اشتراک عمل کر سکتے ہیں جیسے نبی آخرالزمان نے قریش مکہ کے خلاف اور ابوسفیان کے خلاف اطراف مدینہ کی دوسری قوموں سے کیا تھا۔

اس قسم کے اتحاد میں "اشتراک" اور "شرکت" کا فرق معلوم کرنا ضروری ہے۔ کسی جماعت سے کسی خاص مقصد کیلئے "اشتراک عمل" ایک شے ہے اور مختلف قوموں کا کسی ایک جماعت میں شریک ہونا (جو وطنیت پر مبنی ہو) دوسری چیز۔ محض "اشتراک عمل" سے ملت کی انفرادی حیثیت باقی رہتی ہے اور دوسری جماعت میں "شرکت" کر کے مدغم ہوجانے سے ملت کی علیحدہ حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔

بدقسمتی سے موجودہ "وطنیت" صرف "شرکت" یعنے جذب ہونے کا سبق دیتی ہے اور یہی کانگریس اور اسکی قائم کردہ مسلم رابطہ عوام کمیٹی کا مقصد ہے کہ مسلمان جماعتی حیثیت سے اشتراک عمل کرنے کے بجائے انفرادی حیثیت سے اس ملک کی اکثریت میں جذب ہوجائیں اسلئے یہ عقیدہ قابل اعتراض اور خطرناک ہے۔

باب سوم

مسئلہ اقلیت اور کانگریس

فصل اول

پارٹی ڈکٹیٹر شپ

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

پارٹی ڈکٹیٹر شپ اور رام راج کے تباہ کن نشہ نے اس بلند بانگ آزادی کے دعوے کرنے والی جماعت کو اب اسقدر مدہوش بنا دیا ہے کہ وہ کسی بین الملی سیاسی اتحاد اور فرقہ وارانہ مفاہمت کی اہمیت کو گوارا تک کرنے کو تیار نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اب وہ کسی دوسری جماعت کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ ایک طرف مسلمانوں کے باہمی تصادم اور کشمکش نے اور دوسری طرف انتخابات کی کامیابیوں نے اسکو اتنا سرشار کر دیا ہے کہ اب وہ یکسر آٹھ کروڑ مسلمانوں کی زبردست اقلیت کے وجود سے ہی انکار کرنے لگی ہے۔ اب اسکے انتصادی پروگرام کے مطابق اقلیتوں کا کوئی مسئلہ ملک کے سامنے پیش نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب اقلیتوں کے وجود ہی سے انکار ہے تو پھر ساز و باز حیثیت سے صلح اور مفاہمت کیسی؟ اس کی اسکیم تو یہ ہے

کہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم کو ختم کرکے اپنے آپ کو انفرادی حیثیت کانگریس میں مرغم کر دیں اور ظالم اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں۔

کانگریس کا یہ عقیدہ زیادہ پرانا نہیں ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں دکھایا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک کانگریس کا طرز عمل سارا یا نہ ہندو مسلم اتحاد اور باہمی مفاہمت پر مبنی رہا۔ مگر سنہ ۱۹۲۴ء کے بعد سے سنہ ۱۹۲۷ء تک شردھانند کی مساعی سے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے کانگریس کی ذہنیت میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے خالص ہندو راج کی جدوجہد شروع ہو گئی اسی تخیل کی بنا پر مخلوط انتخاب اور مخلوط نیابت بہ تحفظ نشست کی حمایت بہت زور شور سے کی گئی تھی تاکہ انتخابات پورے طور سے ہندوؤں کے دست کرم میں رہیں۔ سنہ ۱۹۲۷ء کے بعد بالخصوص جب مسلم لیگ نے دہلی تجاویز کو منظور کر لیا اور مخلوط انتخاب کو چند شرائط کے ساتھ تسلیم کر لیا تو کانگریس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خالص مخلوط نیابت بلا تحفظ نشست پر زور دیا گیا تاآنکہ نہرو رپورٹ میں اسکو بطور آئیڈیل منظور کر لیا۔ ان واقعات کی مکمل تفصیل گذشتہ صفحات میں آچکی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے کانگریس نے اقلیتوں کے وجود ہی سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نے اس قسم کی تقریریں کیں۔ خود گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں فرمایا کہ:۔

"ہندوستان میں اقلیتوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے"

سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد سے کانگریس کے اس عقیدے نے بالکل فسطائی شکل اختیار

کر لی۔ اب نہ صرف اُسنے مسئلہ اقلیت کے وجود اور بین الملی مفاہمت کی ضرورت سے انکار شروع کیا بلکہ قومیت، اشتراکیت اور سوشلزم کے نام پر انتہائی پروگرام کی آڑ میں استبدادانہ اور مطلق العنان شکل اختیار کر لی، وزارت قبول کرنے کے بعد سے یہ ذہنیت بہت تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔ اب نیشلزم اور قومیت، فلارنسا دی میکیا ولی کے انتہا پسند عقیدے "قومیت پرستی" میں تبدیل ہوتی نظر آرہی ہے جسمیں سلطنت اور قومیت ہی خیر مطلق ہو یہ وہی طاقت کا نشہ ہے جس نے یورپ کی اقوام غالب کو مغلوب قوموں کو فنا کرنے پر آمادہ کر رکھا ہے۔ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
اس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

کانگریس اکثریت کی حکومت پر اس درجہ عامل ہو کر ہر مخالف اقلیت کو پنجۂ آہنی سے دبانا چاہتی ہے۔ وہ جمہوریت کے مغربی اصول کو اس حد تک اختیار کرنے پر آمادہ ہے کہ اپنی کسی مقابل جماعت سے مفاہمت کرنا پسند نہیں کرتی پنڈت جی اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"در اصل جمہوری حکومت کے معنے یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (میری کہانی صفحہ ۲۵۵)

فرانسیسی استعمار نے جو کچھ ٹیونس الجزائر اور مراکش کے عربوں کو فرنچ قومیت میں جذب کرنے کیلئے کیا، جرمنی میں جو تدابیر یہودی قومیت کو فنا کرنے کیلئے اختیار کی جا رہی ہیں، کانگریس اُسی طریقہ پر عامل ہو کر اقلیتوں کی بالخصوص

مسلم اقلیت کی تہذیب اور کلچر کو اکثریت کی تہذیب میں ضم کرنا چاہتی ہے
قوم پرستی کی تعلیم، وطنیت اور معاشی و اقتصادی مسائل کی اہمیت کا درس
مخلوط انتخاب پر اصرار صرف اسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے دیئے جا رہے ہیں
یہ اسی باطل حق پیرہن عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ کانگریس بندے ماترم جیسے گیت
کو ہر ہندوستانی کے سر منڈھنا چاہتی ہے، ترنگے جھنڈے کی عزت ہر شخص
سے چاہتی ہے ہر دوسری جماعت کے وجود کو فنا کرنا چاہتی ہے اور اسکو خدائی
حق سمجھتی ہے کہ ہر شخص غیر مشروط وفاداری اور اطاعت کرے یہاں تک کہ
مذہب اور زبان تک کی شرط ماننے کو تیار نہیں۔

غرضکہ وہ ہندوستان میں اقلیت کے مسئلہ کو اس طور سے حل کرنا چاہتی
ہے جس طرح اٹلی اور جرمنی نے کیا ہے۔ کانگریس امن و صلح کے نعرے
بلند کرتی ہے، شانتی کی شکتی پر مہاتما جی کے وعظ ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔
عدم تشدد کانگریس کا مستقل عقیدہ ہے لیکن مخالف آواز کے دبانے میں وہ
روس کی اس ظالم حکومت کی پیروی کرتی ہے جہاں معمولی مخالفت کے
جرم کی سزا موت ہے۔ روس کے مظالم کی داستان جو وہ مخالفین پر روا رکھتا ہے
بہت دردناک ہے جان ڈریہرڈ جس نے اپنی زندگی کے بیس سال روس
میں گذارے ہیں اشتراکی مظالم کی حالت اعداد و شمار میں بیان کرتا ہے۔
۱۹۲۲ء تک یعنے دس سال کے عرصہ میں روس حکومت نے جتنے آدمیوں کو
ہلاک کیا ہے ان کی طبقہ وار فہرست حسب ذیل ہے۔ بشپ اور پیشوایان دین ۲۸۔

سلہ ڈیلی گزٹ کراچی ۱۵ رجون ۱۹۳۹ء بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۵ صفحہ ۲۹۔

اہل خدمت کلیسا ۱۵۱۶، وکلاء اور مجسٹریٹ ۳۴۴۵۰۵، اساتذہ اور طلباء ۱۶۲۳۶، سول عہدہ دار ۷۹۰۰۰، اونچے طبقے کے لوگ ۶۵۸۹۰، فوجی عہدہ دار ۵۶۳۴۰، مزدور اور محنت پیشہ لوگ ۱۹۶۰۰۰، سپاہی اور ملاح ۲۶۸۰۰۰، کسان ۸۹۰۰۰۰۔
۱۹۱۷ء کے بعد جو مظالم ہوئے ہیں ان کا اندازہ اس فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مسٹر ڈینس ذہیبطلے اپنی کتاب عقاب احمر میں روسی عوام کی حالت بیان کرتے ہوئے ایک روسی مزدور کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

"حالات خراب ہیں۔ بعض مقامات پر تو وہ اتنے خراب ہیں کہ آپ اُنپر یقین نہ لائیں گے۔ ہمیں ان مصائب کی عادت پڑگئی ہے۔ اسلئے کسی نہ کسی طرح زندگی گذار لیتے ہیں۔ مگر بیرونی ممالک کے کارکن جب یہاں آکر ان حالات کو دیکھتے ہیں تو ہیبت زدہ ہوجاتے ہیں"

اسی طرح جرمنی میں ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت کے آغاز کے وقت ہزاروں مخالف انسانوں کو تہ تیغ کردیا گیا۔

یہ واضح رہے کہ یہ وحشیانہ مظالم اکثریت کے ہاتھوں اقلیتوں پر اس حالت میں ہیں جبکہ دونوں میں مذہبی اختلاف کوئی نہیں ہے محض معاشی یا سیاسی پروگرام کے اختلافات ہیں۔ وہاں کی اکثریت اور اقلیت سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اسکے باوجود مخالف پارٹی کے وجود کو ہر طرح سے فنا کرنے کی کوششیں کیجاتی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں جہاں کی اکثریت اور اقلیت کی بنا مذہبی اختلاف پر ہے اور یہاں کی اکثریت مستقل اور پائدار اکثریت ہے، معاملات ان ممالک سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں۔ یہاں کی اقلیت کو دوسرے

ممالک کی اقلیت کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ خطرہ ہے۔

کانگریس یہاں کے مسئلہ اکثریت کا تطابق املی وغیرہ سے کرنے کیلئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ہندوستان میں بھی مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بنا پر کوئی مسئلہ اقلیت نہیں ہے لیکن خود کانگریس کا ہر بڑے سے بڑا لیڈر ہندو ازم میں پوری طور سے رنگا ہوا ہے اور ملک کے ہر مسئلہ کو فرقہ وارانہ ذہنیت سے دیکھتا ہے۔ وہی پنڈت جی جو اسلام کو مٹانے کے لئے اُسکی مذہبی حیثیت تک گوارا کرنے کو تیار نہیں ہیں اپنے ہندو مذہب کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنوں میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اسکے با وجود اسکی کشش کتنی سخت ہے اور اُسکی بقا میں کتنی قوت موجود ہے" (میری کہانی صفحہ ۲۰۲ و صفحہ ۲۰۳)

کانگریس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا یہ حال ہے کہ یوپی میں وزارت کی ترتیب میں مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ کرنا گوارا نہ کیا اور ان کی ایک شرط تک کو تسلیم نہ کیا برخلاف اسکے صوبہ سرحد میں ایک سے کہیں زائد شرائط ہندوؤں کی تسلیم کر لی گئیں اسلئے کہ یوپی میں مسلمانوں کی اقلیت ہے اور سرحد میں ہندوؤں کی۔

ڈیڑھ سال قبل لاہور میں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے ایک برج حنا تعمیر ہو رہا تھا اس کی تعمیر کو بند کرنے میں جو طرز عمل کانگریس کے لیڈروں نے اختیار کیا وہ ان کی تنگ نظری اور مذہبی جوش اور ہندو بھائیانہ تعصب ظاہر کرتا ہے۔ گاندھی جی کا یہ تار کیا ظاہر کرتا ہے جو انھوں نے ۱۱ دسمبر کو بھیجا کے

نام ارسال فرمایا جو کہ دہلی کانگریس کے سرگرم کارکن ہیں :-

"میں یقیناً لاہور چھاؤنی میں بوچڑ خانے کھولنے کے خلاف ہوں جیسا کہ
میں دوسرے بوچڑ خانوں کے خلاف ہوں"

پنڈت جواہر لال نہرو جو مسلمانوں کے مذہب سے بھی گھبراتے ہیں اسی بوچڑ خانے کے متعلق ایک تار میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"میں بوچڑ خانوں کو پسند نہیں کرتا اور اُنکے قریب جاتا ہوا گھبراتا ہوں
جو لوگ بوچڑ خانوں سے دہشت زدہ ہوتے ہیں ان کی حمایت کرتا ہوں
میرا خیال ہے کہ ایسے معاملات میں جس علاقہ کے باشندوں کی رائے کو سب
زیادہ وقعت حاصل ہو اگر وہ اسپر سختی کے ساتھ معترض ہوں تو حکام متعلقہ کو
ان کے جذبات کی قدر کرنی چاہیئے"

لیکن اسی علاقہ میں جب مسجد شہید گنج دن دہاڑے فوجی پہروں میں گرائی جاتی ہے اور کانگریس سے مدد طلب کی جاتی ہے تو وہی پنڈت جی جواب ارسال فرماتے ہیں کہ :-

"ان معمولی معمولی معاملات میں توجہ صرف کرنا ملک کے بڑے معاملات میں
سے توجہ اٹھانا ہے"

یہ اگر فسطائی ذہنیت نہیں تو اور کیا ہے کہ جب مسٹر رندھاوا ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں گولی چلا کر اور ستر سے زائد مسلمانوں کو زخمی کرکے اور ۲۰۰ مسلمانوں کو حوالات میں بند کرکے فیض آباد تشریف لاتے ہیں تو فیض آباد کے کانگریسی اصحاب انکا استقبال کانگریسی جھنڈوں کے ساتھ کرتے ہیں، بالکل جس طرح

جنرل ڈائر کا استقبال جلیانوالہ باغ کے خونی حادثہ کے بعد ہندوستانی فوجی عورتوں نے کیا تھا اور انکے استعفیٰ دینے کے بعد اُن کی بہادری کے صلہ میں تلوار پیش کی تھی۔

کانگریس جمہوری نظام کی تائید میں فرقہ وارانہ مطالبات پر غور کرنا نہیں چاہتی حالانکہ ہر جمہوری معاملہ میں وہ مسلم اقلیت کی دلشکنی کیلئے تیار رہتی ہے۔

سنٹرل اسمبلی میں مسٹر داس کا مسودہ قانون (جس کی رو سے شاردا ایکٹ کو اور زیادہ سخت کر دیا گیا ہے) مسلمانوں کی متفقہ اور متحدہ مخالفت کے باوجود محض اکثریت سے پاس کر دیا گیا۔

بمبئی اسمبلی میں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کیلئے مخلوط انتخاب کا قانون باوجود مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کے پاس کر دیا گیا۔

سی پی میں ودیا مندر اسکیم باوجود مخالفت شدید پاس کر دی گئی اور مجلس نصاب میں ایک مسلمان تک کو شریک نہیں کیا گیا۔

ودیا مندر اسکیم ایک تعلیمی پروگرام ہے جسکے ماتحت بچوں کو تعلیم دیجائیگی اسکا نام ہی بتا رہا ہے کہ ہندو تہذیب کے فروغ کیلئے یہ اسکیم جاری ہے اس سے اُردو کو قطعی فنا کرنے اور مسلم روایات اور مذہبی تعلیم کو بالکل ختم کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ صرف ایک سال کیلئے اس اسکیم میں دو لاکھ روپیہ کی منظوری حکومت کانگریس نے دی ہے جسمیں سے ایک حبہ بھی اُردو کیلئے نہیں ہے۔

جبلپور کے ضلع میں ہندی لازمی کی جا رہی ہے وہاں صرف ایک اردو اسکول تھا اسکو بھی بند کیا جا رہا ہے۔

تنگ ذہنیت کا یہ حال ہے کہ وردو میونسپل کمیٹی نے اُردو سکول کا نام بدلکر اُردو ودیا مندر رکھدیا ہے مسٹر ہدایت علی ایم۔ ایل۔ سی نے اسکے متعلق سوال کیا تو وزیر تعلیم نے اسکا اعتراف کیا اور اسکا بھی اعتراف کیا کہ مسلمان اس تبدیلی نام سے سخت شاکی ہیں مگر اُن کی شکایت یہ کہکر رد کردی کہ:۔

"اس سے کسی فرقہ یا مذہب کے جذبات کو صدمہ پہونچانا مقصود نہیں ہے اور محض نام بدلنے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ اس سے اکثریت کی تہذیب کا احیاء و تفوق کرنا منظور ہے"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رُخ کس طرف کو ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سی پی کے صوبہ کو کانگریس نے خاص طور سے انتخاب کیا ہے اور مسلم تہذیب کو ختم کرنے کا کام اس صوبہ میں اور صوبوں کے مقابلہ میں زیادہ تیز رفتار سے جاری ہے۔ اس صوبہ کو گاندھی جی نے اپنا مستقر بنایا ہے اور اسی میں تعلیمی تجربات پیش کئے جارہے ہیں۔ یہاں ہندو مذہب کا مظاہرہ اس حد تک کیا جارہا ہے کہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے جو تالاب دیہاتی اسکیم کے سلسلے میں بنائے گئے ہیں انکا نام ..... ساگر رکھا گیا ہے، اور جن اکھاڑوں کو حکومت نے امداد دی ہے ان کو ہنومان اکھاڑوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

کانگریس کی پوری فرقہ وارانہ ذہنیت کا ثبوت گذشتہ سال سالانہ اجلاس کانگریس میں نمایاں اور واضح تھا۔ اس اجلاس میں بعض علما مثلاً مولانا حسین احمد صاحب تک بھی شریک تھے۔ اجلاس کی حقیقت ایک پکے کانگریسی اخبار مدینہ کے ایڈیٹوریل کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے جو

جویان راہ حق کیلئے مشعل راہ ہے لیکن جو اپنی تہذیب کو خود اپنے ہاتھوں مٹانے پر آمادہ ہوں اُن کے لیے نقوش بے معنی ہے۔

مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ ہندو اکثریت درحقیقت دل سے اُن اعلانات پر عمل کرنا نہیں چاہتی جنکو وہ کانگریس کے پنڈال سے تجویز کی شکل میں بارہا پیش کرتی رہتی ہے انھیں یہ خطرہ ہے کہ ہندو اکثریت طاقت حاصل کرنے کے بعد ان تمام عہود و مواثیق کو یک قلم فراموش کر دیگی اور مختلف کیلنگا ہوں سے مسلمانوں کے مذہب، تمدن، زبان، اور رسم الخط وغیرہ پر حملے کرکے آہستہ آہستہ انھیں ہندویت میں مدغم کریگی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندو اکثریت کی موجودہ ذہنیت کے پیش نظر یہ خطرہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے اسلیے کہ عام ہندوؤں سے قطع نظر خود کانگریس کی ذمہ دار کرسیوں پر جو ہندو متمکن ہیں اُنمیں سے بیشتر ایسے ہیں جنکے اعمال واقوال سے آئے دن اس خطرہ کی تائید ہوتی رہتی ہے دور کیوں جائیے کانگریس کے سالانہ اجلاس کیلئے سردار پٹیل کے بلاواسطہ نگرانی میں جو مختصر سا شہر بنایا گیا تھا اُسی کو دیکھئے اُسمیں یہ ذہنیت پوری طرح اوجاگر تھی، حالانکہ اسوقت ہندوؤں کو چند صوبوں میں جو طاقت حاصل ہوئی ہے وہ بہت ہی معمولی ہے مگر اسکے باوجود اجلاس کے لئے مجلس استقبالیہ کی طرف سے جو انتظامات کئے گئے تھے اُنکے دیکھنے سے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی فرقہ مسلمان بھی بستا ہے اُس کی بھی کوئی تہذیب ہے، اُس کی بھی کوئی زبان ہے اُسکے رہنے سہنے وغیرہ کے طریقے

پینے کی بھی کوئی منفرد وضع ہے، اس کے برخلاف ہر چیز میں صرف ہندویت ہی ہندویت نظر آتی ہے..... یہ کسقدر افسوسناک بات ہے کہ کانگریس کے زیر بحث اجلاس میں ہر عبارت، سائن بورڈ، چیٹ اور سلپ صرف ہندی میں لکھے گئے، کھانے کا انتظام صرف ہندو تہذیب کے مطابق کیا گیا، پنڈال کے احاطہ میں کچا گوشت لانے کی ممانعت کی گئی پرارتھنا کیلئے ایک جگہ مخصوص کی گئی، دروازوں اور دیواروں پر قدیم ہندوستان کی مذہبی حکایات سے تعلق رکھنے والی تصویریں آویزاں کی گئیں غرضکہ جو کچھ بھی کیا گیا اسمیں صرف ہندوؤں کی خاطر ملحوظ رکھی گئی، پھر سوال یہیں پر آکر ختم نہیں ہوجاتا گؤسیوا پر بھی تقریریں ہوئیں، گؤشالہ بھی بنایا گیا ہندی پرچارک مجلسوں کے جلسے بھی ہوئے اور اُن میں گاندھی جی سردار پٹیل اور سوبھاش بابو نے سرگرمی کے ساتھ حصہ بھی لیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے احساسات جو کچھ ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں ان کے دماغ میں بالکل قدرتی طور سے یہ چیز پیدا ہوگی کہ اسوقت تو برطانوی راج کے زیر اثر اُن کی کچھ چیزیں محفوظ ہیں لیکن سوراج میں تو اُن کی کوئی چیز باقی نہ رہیگی اسلئے کہ انگریز تو ہندوستان کو صرف تجارتی منڈی سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے اُسپر قابض رہنا چاہتے ہیں۔ انھیں نہ ہندی سے سروکار ہے نہ اُردو سے نہ گئے سے نہ بیل سے نہ ہندو تمدن سے نہ مسلم تمدن سے لیکن سوراج کے طالبوں کی حالت یہ نہیں۔ وہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے طرز عمل سے یہ شبہ پیدا

ہوتا ہے کہ وہ اس قومیت کا نقشہ قدیم ہندو تہذیب کے اصولوں پر کھینچ رہے
ہیں وہ اُردو کو اپنے عزائم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ محسوس کرتے
ہیں گائے کی قربانی کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں مسلمانوں کی مادرِ ملت
اخوتِ اسلامی کو ناجائز سمجھتے ہیں' اور اسلئے مسلمانوں کے سامنے قدرتاً
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ سوراج برطانوی راج کے مقابلہ میں
بہتر ہے یا بدتر؟؟

ان تمام واقعات کو سامنے رکھ کر اگر کانگریس کا جائزہ منصفانہ نظر سے لیا جائے
تو صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی تمام سیاسی جدوجہد اور کارروائیوں کا مقصد
اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان میں قومیت پرستی کے ذریعہ ہندو کلچر کی اشاعت
اور ہندو راج کا استحکام برطانیہ کی فوجی حکومت کے ماتحت قائم رہے اگر ہندو
نیشنلزم برٹش امپیریلزم سے آزاد ہونا چاہتی ہے تو خود دوسری غیر ہندو
اقوام کے سلئے امپیریلزم بننا چاہتی ہے ورنہ جمہوری حکومت کی ذراسی جھلک
میں اتنی سرشار ہو جاتی اور برطانوی استعمار کے خلاف متحدہ محاذ اور مسئلہ اقلیت
کی اہمیت اور اُسکے حل کرنے کے ذرائع کو اتنا پس پشت نہ ڈالتی۔

اقلیت کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی میں درپیش نہیں ہے بلکہ دوسرے
ممالک میں بھی یہ مسئلہ برابر اہمیت رکھتا ہے یورپ کے دوسرے ممالک
میں بھی جہاں اکثریت اور اقلیت کی تفریق مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ جغرافی حدود
پر مبنی ہے یہ مسئلہ حائل رہا ہے مگر جن قوموں نے آزادی حاصل کرنے کی خواہش
کی ہے انھوں نے اس مسئلہ کے حل کو سب سے مقدم سمجھا اور اقلیتوں کو مطمئن کر نیکی

ہر ممکن کوشش کی اور تمام قوت باہمی مفاہمت ہی میں صرف کی۔ مصر کی مثال حال
ہی کی ہمارے سامنے ہے۔ مصر کی مسلمان اکثریت نے دوسری اقلیتوں سے کس
فراخدلی سے مفاہمت کی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انگریز پروپیگنڈا کرکے قبطیوں
کو اکساتے تھے تو وہ جواب دیتے تھے کہ "ہم کچھ نہیں جانتے جو کچھ پوچھنا ہے
سعد زاغلول سے پوچھ لو" کناڈا میں انگریزوں نے فرانسیسی اقلیت کو سب سے
پہلے مطمئن کیا۔ سوئٹزرلینڈ میں جرمن ستر فیصدی آباد ہیں اور فرانسیسی اطالوی
اقلیت میں ہیں مگر دونوں اقلیتوں کو وزارت میں برابر نمائندگی ملتی ہے
زیکو سلواکیا کے حالات کو موجودہ سیاسی حالات نے ہندوستان میں کافی طور سے
روشن کر دیا ہے اس ملک کی کل آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے جس میں سے
جرمن آبادی کل ۲۰ یا ۲۵ لاکھ ہے لیکن اتنی معمولی اقلیت کے حقوق کی ضمانت
تحفظات آئین کے ذریعے کیگئی ہے۔ سنہ ۲۰ء میں صدر اعظم ماسارک نے
جب سب سے پہلا دستور العمل مرتب کیا تو اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت کر دیگئی
اسکے بعد سے برابر جرمن اقلیت کو آبادی کے تناسب سے یعنی ۲۲ فی صدی
ہر محکمہ میں جگہ دیجاتی ہے نہ صرف جرمن زبان کو عدالتوں اور دفتروں میں سہولت
بہم پہونچائی جاتی ہے بلکہ پبلک ٹھیکوں اور اخباروں تک میں ایک خاص حصہ
بقدر تناسب جرمن اقوام کیلئے مقرر کر دیا گیا ہے اور حسب معاہدہ ۱۰ فروری
[illegible]ء ایک سکریٹریٹ اور ایک جوائنٹ کمیٹی مختلف مقامات پر ستر شاخوں
کے ساتھ قائم کیگئی ہے جو تمام مزدوری معاملات سے گورنمنٹ کو مطلع کرتی ہے۔
۱۰ نومبر [illegible]ء کو وزیر خارجہ ہوڈزا نے چیمبر آف ڈپٹیز میں تقریر کرتے ہوئے

وہاں کی حکومت کا طرز عمل اقلیتوں کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے:

"زیکو سلو واکیا کے نظام حکومت کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ وہ اقلیتوں کے وجود کو مٹانے کی کوشش کرے بلکہ وہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ ان کی معاشرتی، اخلاقی، تمدنی ترقیاں خود انہیں کے ماحول اور فضا کے مطابق ہوں گی"

یہ ایک آزاد ملک کے وزیر کا اعلان کانگریس کے غلام ڈکٹیٹروں کے ان دعووں کی کیسی زبردست تردید ہے کہ "آجکل معاشی پروگرام کی حکومتوں میں اقلیتوں کا کوئی سوال ہی نہیں ہے" ترتیب وزارت میں اسی طریقے پر عمل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں آٹھ دس سیاسی پارٹیاں قائم ہیں جنہیں پانچ پارٹیاں زیچ ہیں اور تین جرمن، مگر وزارت کانگریس کے موجودہ طرز عمل پر ایک پارٹی کی مطلق العنانی میں مرتب نہیں ہوتی بلکہ وزارت مخلوط تمام پارٹیوں کی باہمی مفاہمت سے ترتیب دیجاتی ہے وہاں کانگریس حکومت کی طرح وزارت میں اقلیتوں کے نمائندوں کو انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ جماعتی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی قائم اور مغرور اکثریت کو اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان سے مفاہمت کرنے کا طریقہ موجودہ اسلامی حکومتوں سے سیکھنا چاہیے ایران میں اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی نے نہ صرف پارسیوں کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کی ہے بلکہ انکو علیحدہ قومی نظام قائم کرنے کی اجازت دی ہے حکومت ٹرکی میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ جو طرز عمل کیا جارہا ہے

وہ قابل تقلید ہے ٹرکی میں پبلک کا صدر اعظم غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے۔
حکومت عراق نے بھی اقلیتوں کو نہایت وسیع ملکی حقوق عطا کیے ہیں
اور تمدنی و معاشرتی اور زبان کے معاملہ میں ان کو پوری پوری آزادی دی ہے،
جامعہ بیروت کے ایک قانونی پروفیسر مسٹر بی۔ ایس۔ کش جینوں نے
حال ہی میں استنبول، انگورہ اور بغداد کا سفر ختم کیا ہے اپنے بیان میں فرماتے ہیں

"میں اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترکی، مصر اور عراق
میں غیر مسلموں کے حقوق بالکل محفوظ ہیں وہاں اقلیتوں کو وہ تمام سیاسی
اور معاشرتی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں جو انکو ہونے چاہییں ان کو
تمام قانونی اور انتظامی انتخابات میں برابر حصہ دیا جاتا ہے وہاں
مجالس آئین ساز میں اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد اس سے کہیں
زیادہ ہے جو آبادی کے اعتبار کے تناسب سے ہونی چاہیئے"

(بحوالہ الامان ۱۹ر نومبر ۱۹۳۸ء)

تجاویز کراچی کی حقیقت | کانگریس نے کراچی رزولیوشن اور دوسری قراردادوں
کے ذریعہ اقلیتوں کے تمدن کی حفاظت کا یقین دلایا ہے۔ ان اعلانات میں
بالخصوص مسلمانوں سے ان کے مذہب، زبان اور کلچر کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا
ہے۔ اکثر کانگریسی مسلمان ان کاغذی اعلانات کو مسلمان عوام کے سامنے
بطور ضمانت پیش کیا کرتے ہیں۔ افسوس! وہ حضرات خود کو حقیقت سے دور
رکھنے کی کیسی کوشش کرتے ہیں! کون نہیں جانتا کہ اس قسم کے اعلانات
قوموں کی خود اعتمادی کو ختم کرنے کیلئے سیاسی حربوں کے طور سے کیے جاتے

ہیں۔ آئے دن برطانیہ اعلیٰ کی طرف سے رعایا کی تسلی کیلئے ان سے زیادہ زوردار الفاظ میں اس قسم کے اعلانات ہوتے رہتے ہیں۔ شہنشاہ برطانیہ کے اعلانات جو ہندوستانیوں سے مختلف اوقات میں کئے گئے ہیں، وہ آجتک قائم ہیں مگر ان پر کبھی کوئی عمل نہیں ہوا۔ مسٹر کنیڈی نے مولانا محمد علی کے مقدمہ کراچی میں ان اعلانات کی حقیقت و اہمیت کو اسطرح صاف کر دیا تھا کہ

"اگر شاہی اعلان کا تصادم ملک کے قانون سے ہو تو ملکی قانون کا احترام کیا جائے گا۔"

پھر ان اعلانات کے ہر دانوں سے جو کراچی اور کلکتہ کے اجلاسوں میں پاس کر دیے گئے ہیں کتنے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے؟ بیشک اسکے ذریعہ ہم کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ہماری مسجدیں نہ توڑ دیجائیں گی، ہمارے تمدن اور تہذیب میں حکومت کوئی مداخلت نہ کریگی، ہمیں اپنی زبان کی ترویج کا حق برابر ہوگا، لیکن یہ حقوق تو آج بھی برطانیہ کی حکومت میں ملے ہوئے ہیں یہ حقوق نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اچھوتوں تک کو حکومت کی طرف سے ملے ہوئے ہیں وہ اپنے طریقہ پر عبادت کر سکتے ہیں، ان کی عبادت میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، لیکن کیا ہندوستان کے چھ کروڑ اچھوتوں کی کوئی سیاسی[1] پوزیشن باقی ہے؟ کیا ہمارے علما" اسلام کی آزادی سے صرف یہی مراد لیتے ہیں؟ کیا کانگریس کے ان اعلانات سے مذہب کو بالکل آزاد سمجھا جائے گا؟ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد (اقبالؒ)

---

[1] ہندوستانیوں ان اچھوتوں کی تعداد چھ کروڑ ہے جنکو چھونے سے اعلیٰ ذات کے ہندو کو غسل کرنا پڑتا ہے۔

افسوس! کانگریس تو ان اعلانات پر بھی عمل کرنا نہیں چاہتی۔ اپنے ڈیڑھ سالہ دور حکومت میں اس نے جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ ان اعلانات کو بھی پس پشت ڈالنے میں برطانیہ سے بھی ایک قدم بڑھنے کی کوشش کرتی ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ ہم کو مذہب میں اتنی آزادی حاصل رہیگی کہ حکومت ہم کو بالجبر شدھ نہیں کرے گی اور ہمارے معابد محفوظ رہیں گے تو جس طرح برطانیہ نے اپنے اعلانات کے باوجود ہندوستانیوں کو دل و دماغ کی حیثیت سے انگریز بنا ڈالا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ کانگریس امپیریلزم بھی اسی طرح پر امن نفوذ کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندو قومیت میں جذب نہ کرے گی، بیشک وہ مسجدوں کو توڑیگی نہیں بلکہ ودھیا مندر جیسی اسکیموں کے ذریعہ مسلمانوں کے دل و دماغ کو ملحد بنا کر ان مسجدوں کو آثار قدیمہ میں شامل کرنے سے کون روکیگا؟ ڈاکٹر اشرف اور مسٹر آصف علی جیسے آزادی کے سپاہیوں کی فوج کو اسلامی تہذیب کے ختم کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ یہی سب کچھ تو آجتک انگریز بھی کرتا رہا ہے پھر یہ باطل کی جگہ باطل قائم کرنے کی کوشش سے آخر فائدہ؟ ان اعلانات کو ذرا غور سے پڑھیئے ان میں دور ہی سے فاتحانہ شان نظر آتی ہے۔ ان تجاویز میں صاف ان اعلانات کی بو آتی ہے جو فاتح اقوام کسی شکست خوردہ اور مفتوح قوم کے سامنے پیش کیا کرتی ہے۔ مسولینی نے حبش فتح کر لینے کے بعد جو اعلان اپنی حبشی رعایا کے نام بھیجا تھا اسمیں اور کراچی رزولیوشن میں کیا فرق ہے؟ اسمیں مساویانہ مفاہمت کی وہ بو کہاں جو مسلمانوں کا مطالبہ ہے۔ اور جسکو ہٹلر زیکوسلوواکیا تک منوا کر تسلیم کرا چکا ہے؟ ان اعلانات کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ جب

ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت ہوگی تو اقلیتوں کو جو ان کی مفتوح رعایا ہوگی یہ اطمینان دیدیا جائیگا کہ وہ ان کی حفاظت اور حراست میں مذہبی رسومات کی ادائیگی میں آزاد ہیں۔ کیا خدانخواستہ ہندوستان کے مسلمان تنزل کی اس حد تک پہونچ چکے ہیں؟۔

کانگریس کے ان اعلانات کی حقیقت لالہ ہردیال ایم سلے کے مندرجہ ذیل مضمون سے معلوم ہوتی ہے جو ایک مشہور سنگھٹنی کانگریسی ہیں:۔

"اگر ہندوؤں سے عہد وپیان کرنے کے بعد انگریز پانچ فیصدی سوراجیہ دیدے یا آزاد ہندو ریاست قائم ہوجائے یا جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ ملنے کا وقت قریب آجائے تو ہماری نیتی (پالیسی) عیسائیوں اور مسلمانوں کی طرف جو ہوگی اُسکا اعلان کردیا جائیگا۔ اُس وقت باہمی سمجھوتہ کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلہ کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے کیا فرائض اور حقوق ہونگے۔"

ان سے زیادہ صحیح اور صاف الفاظ میں موجودہ کانگریس کی پالیسی کی تصویر نہیں کھینچی جاسکتی۔ کانگریس بھی پچھتر فیصدی سوراج سے زیادہ کی خواہاں کبھی نہیں ہے اور اسمیں آزاد ہندو اسٹیٹ کی متمنی ہے۔ باہمی سمجھوتہ کی واقعی اسکو ضرورت نہیں وہ تمام پالیسی ہندو مہاسبھا کے طرز عمل پر قائم کرنا چاہتی ہے۔

فصل دوم

آزاد ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام

ہندوستان میں اسوقت جو سیاسی جنگ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جاری ہے اسکی حقیقت اور اصلیت ابھی تک عوام سے پوشیدہ ہے کانگریسی مسلمانوں میں سے بھی بیشتر نے اس جنگ کے اصلی مقصد کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ابھی تک اسکو ملازمتوں اور وزارتوں کی کشمکش سمجھ رہے ہیں۔ اسلئے وہ کانگریس کے اعلانات پر مطمئن ہو کر اور تمام ذلتوں کو برداشت کرتے ہوئے کانگریس میں شامل رہتے ہیں۔ یہ غلط فہمی ان کی آزادی کے غلط تخیل پر مبنی ہے ان کے دماغ میں ہندوستان کی آزادی کا جو تخیل ہے وہ غیر اسلامی اور مغربی ہے وہ ہندوستان کو ایک وطن دوست کی حیثیت سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جسکا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان اندرونی طور سے اپنے معاملات خود طے کرے معاشی اور اقتصادی مشکلات کا حل خود ہندوستان دریافت کرے اور مغربی طرز پر وطنیت پر مبنی آزاد اسٹیٹ کی بنیاد ڈالدی جائے۔ ظاہر ہے اگر ہندوستان کو اس قسم کی آزادی نصیب بھی ہو گئی تو ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا ایسی آزادی میں کوئی حصہ بھی نہ ہوگا جبتک کہ وہ ابھی سے اپنا نصب العین مقرر کر کے اس کے حصول کی جد و جہد نہ کریں مسلمانان ہند کا نصب العین صرف ملک کو آزاد کرانا نہیں ہے بلکہ ان کی منزل مقصود آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کی تخلیق ہے

وہ بیشک ہندوؤں سے زیادہ برطانوی استعمار کے دشمن ہیں اور اسکے پنجۂ استبداد سے سرزمین ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن اس آزادی کے حصول کے ساتھ ساتھ وہ آزادیٔ اسلام کے متمنی ہیں جسکا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ان کو اپنے مذہبی معتقدات اور رسومات کی ادائیگی کی آزادی حاصل ہو جائے اور ان کی مسجدوں کی حفاظت کا یقین دلایا جائے بلکہ وہ ہندوستان کی سیاست، ملکی نظم اور انتظام میں مساوی حیثیت کے طالب اور مدعی ہیں ان کی سیاسی حیثیت ایسی پوزیشن ہونی چاہیئے اور ملکی معاملات میں اتنا دخل ہونا چاہیئے کہ اپنے مذہب، تمدن و تہذیب کی حفاظت وہ خود کر سکیں ان کو قانون سازی کے معاملات میں اتنا دخل ہونا چاہیئے کہ بذریعہ قانون وہ مذہبی احکامات جاری کر سکیں مثلاً زکوٰۃ، تنظیم اوقاف، محکمہ قضا شرعی کا قیام اور قانون معاشرت کی اصلاح کیلئے قانونی اختیارات حاصل ہوں، متحدہ حکومت ہند کو انکے سر پر کوئی غیر اسلامی نظام تعلیم کے عائد کرنے کا اختیار نہ ہو بلکہ وہ مسلمانوں میں اپنی منشا اور ضرورت کے موافق تعلیم کا ایک ایسا نصاب مقرر کر سکیں جس سے مسلمان نسلوں کی ذہنیت غیر اسلامی نہ ہونے پائے۔ سوراجی لشکر کے سپاہی اگر مسلمان رہتے ہوئے ان کی تہذیب و تمدن کو ہندو تہذیب میں جذب کرنے کی کوشش کریں تو مسلمانان ہند کو اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ حکماً ان کی زبان بندی کر سکیں اور سزا دے سکیں۔ بیرونی پالیسی میں مسلمانوں کا اتنا دخل ضرور ہو کہ ان کو بیرونی مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے اور اپنی مرکزی حیثیت قائم رکھنے کیلئے وہ بیرونی مسلمانان عالم سے اسلامی تعلقات قائم رکھ سکیں۔

اور اگر دنیائے اسلام کی کسی مصیبت پر وہ ان کی مدد کرنا چاہیں تو ان میں اتنی طاقت ضرور ہو۔ اگر فلسطین کے مسلمانوں کی فوجی امداد کرنا چاہیں تو اسکے لئے آزاد ہندوستان کے ڈکٹیٹر سے (جس کی ذہنیت جواہرلال نہرو صاحب سے کم نہ ہوگی) درخواست نہ کرنی پڑے اور یہ جواب سننا پڑے کہ۔

"چونکہ حکومت ہند کو برطانیہ سے تعلقات قائم رکھنے ہیں اور بین الاقوامی سیاست اس قسم کے اقدامات کی اجازت نہیں دیتی اسلئے فلسطین کے مسلمانوں کی مدد کرنا ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہوگا۔"

برخلاف اسکے ان کا ہندوستانی فوج پر اتنا کنٹرول ہونا چاہئے کہ وہ ایسے وقت پر دوسرے اسلامی ممالک میں اپنی فوجی قوت سے کام لے سکیں۔

اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی ہند میں اتنا بھی حق نہیں تو ایسی آزادی انکے لئے طوق غلامی سے کم نہیں۔

ان مقاصد کے حصول کیلئے کسی دوسری قوم سے سمجھوتے یا کسی معاہدہ کی ضرورت نہیں ہے یہ وہ حقوق ہیں جو باہمی میثاقوں اور اقوام غالب کی رضامندی یا فراخدلی سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ اسکے لئے ایک زبردست اور مستحکم نظام کی ضرورت ہے، ان کو طاقت اور تنظیم کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، دست سوال دراز کرکے یا دوسری قوموں کے وعدوں اور اعلانات سے ہرگز نہیں۔

اس نصب العین کو حاصل کرنے کیلئے مسلمانان ہند کو ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی اسٹیٹ کے قائم کرنے کی ضرورت ہے جس کو سیاسی اصطلاح میں Imperio in Imperium State (بڑی حکومت کے اندر ایک چھوٹی حکومت) کہتے ہیں۔

یہی اصل میں موجودہ سیاسی جنگ کا ماحصل ہے جسکو بہت سے بغیر مختلف ناموں سے
بدنام کیا جا رہا ہے اور بعض مسلمان بھی شطرنج کے مہروں کی طرح اس نصب العین
کی مخالفت پر حقیقت سے بے خبر ہو کر آمادہ ہیں۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمان
آباد ہیں۔ دنیا کے کسی حصہ زمین پر مسلمانوں کی اتنی کثیر آبادی نہیں ہے جتنی
ہندوستان میں صرف صوبۂ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کل ایران کی آبادی
سے تگنی، ترکی سے سات گنی، عربستان سے چوگنی اور افغانستان و مصر
سے تگنی ہے اتنی زبردست آبادی کو محض فرقہ minority نہیں کہا جا سکتا
بلکہ وہ بہ حیثیت خود ایک قوم ہیں جن کی ایک خاص تہذیب و تمدن ہے۔ اس ملک
میں جو حکومت بھی قائم ہو گی وہ صرف ایک قوم کی حکومت نہیں ہو سکتی۔ اسلئے
کہ کانگریس نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں ایک قوم
نہیں رہتی۔ اسلئے یہاں کی حکومت کو متحدہ قومی حکومت کے نام سے موسوم کر کے
مسلمانوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں جس حکومت کا قیام ہو گا وہ مختلف
قوموں کے وفاق پر مبنی ہو گا اس کی اساس Federation of nations
پر ہو گی مسلمان بہ حیثیت جماعت آزاد ہندوستان میں مساوی اور با قوت شریک
حکومت بننا چاہتے ہیں اور اپنی قومی تہذیب اور کلچر کی حفاظت اپنی ہی قوت سے کرنا چاہتے
ہیں جسکے لئے مسلم قومی اسٹیٹ کا قیام اُن کا واحد نصب العین ہے۔

بدقسمتی سے کانگریس مسلمانوں کے اس تخیل سے بہت گھبرائی ہے
اور ہمیشہ آزاد اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو خطرہ اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے
علامہ اقبال نے اس خیال کو سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں مندرجہ

ذیل الفاظ میں پیش کیا تھا۔

"سوال یہ ہے کہ آپ کے سامنے کیا مسئلہ درپیش ہے؟ اور اُسکی پیچیدگیاں کیا ہیں؟ کیا مذہب کوئی نجی کام ہے؟ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ یورپ میں جو حشر مسیحیت کا ہوا ہے وہی ایک اخلاقی اور سیاسی تخیل کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں اسلام کا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک اخلاقی تخیل کے لحاظ سے اسلام کو برقرار رکھا جائے مگر ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے اسکو ایسے قومی نظامہائے سیاسی کے حق میں مسترد کر دیا جائے جن کے ماتحت مسلمانوں کے مذہبی طرز عمل کو کوئی حق ادا کرنے کی اجازت دی جائے؟ یہ سوال ہندوستان کے اندر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

ہندوستان کے اندر — ایک ملت جو دوسری ملتوں کے خلاف کینہ رکھتی ہو
اسلامی ہندوستان — پست اور ذلیل ہوتی ہے۔ میں دوسری ملتوں کے شعائر،

قوانین، مذہب اور معاشرتی اداروں کا زیادہ سے زیادہ احترام کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق میں بشرط ضرورت اُنکی عبادتگاہوں کی حفاظت کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اسکے باوجود مجھے اپنی ملت سے محبت ہے کہ وہ میری زندگی اور میرے اخلاق کی قوت ہے، جو کچھ میں ہوں مجھے اس ملت نے اپنے مذہب، اپنے ادبیات، اپنے تخیل، اپنی ثقافت کے ذریعے سے بنایا ہے اور اسی طرح اُس نے اپنے تمام ماضی کو ایک زندہ اور سرگرم کار عنصر کی حیثیت سے میرے موجودہ شعور کے اندر تازہ کر دیا ہے۔۔۔۔۔

فرقہ پروری اپنی بلند سطح پر پہونچکر ہندوستان جیسے ملک کے اندر ایک ہم آہنگ
"کُل" کی تعمیر کیلئے ناگزیر ہے۔

ہندوستانی سوسائٹی کی وحدتیں یورپی ممالک کیطرح جغرافیائی نہیں ہیں۔
ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف مذاہب کے
پیرووں کے انسانی گروہوں کا ایک بڑا خطہ ہے، ان کے طرز عمل کا تعین ایک
ایک مشترک نسلی شعور کے ذریعے کرہرگز نہیں ہوا ہے حتٰی کہ ہندو بھی ہم
آہنگ جماعت نہیں ہیں یوروپین جمہوریت کے اصول کو ہندوستان کے اندر
فرقہ وارانہ گروہوں کے واقعہ کو تسلیم کئے بغیر بروئے کار نہیں لایا جاسکتا اس
لحاظ سے ہندستان کے اندر اسلامی ہندوستان کی تخلیق سے متعلق مسلمانوں کا
مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، صوبہ
سرحد، سندھ اور بلوچستان آپسمیں مدغم کردئیے جائیں، سلیف گورنمنٹ
چاہے سلطنت برطانیہ کے حدود کے اندر ہے یا ان حدود کے باہر حاصل ہو
مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کی ایک متحدہ مسلم مملکت کا
قیام کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری اور فیصلہ کن
مقسوم ہوگا، یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کیگئی تھی اس کمیٹی نے
اس تجویز کو اس بناء پر مسترد کردیا کہ اگر اس تجویز کو جامہ عمل پہنایا گیا
تو ایک ایسی مملکت قائم ہوگی جو سنبھالی نہ جاسکے گی جہاں تک رقبہ کا
تعلق ہے یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی کے لحاظ سے مجوزہ مملکت ہندستان
کے بعض موجودہ صوبوں سے کہیں چھوٹی ہوگی اگر انبالہ ڈویژن اور بعض ایسے

اضلاع کو خارج کر دیا جائے جہاں غیر مسلموں کی آبادی غالب ہے تو مجوزہ اسلامی حکومت کی وسعت تو کم ہو جائے گی لیکن آبادی کے لحاظ سے وہ زیادہ اسلامی حکومت بن جائے گی اس طرح مجوزہ علاقوں کے اخراج کے بعد شمال مغربی ہندوستان کی مسلم مملکت اپنے رقبہ کی غیر مسلم اقلیتوں کی حفاظت زیادہ موثر طریق پر کر سکے گی۔ اس نظریہ سے ہندوؤں یا برطانیہ کو خائف نہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا مسلم ملک ہے اس ملک میں ایک ثقافتی قوت کے لحاظ سے اسلام کی زندگی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ ایک معینہ رقبہ میں مرکوز ہو جائے۔ مسلمانان ہند کے اس سب سے زیادہ جاندار جزو کی مرکزیت جس کی فوجی اور پولیس کے خدمات کی بدولت ہندوستان پر برطانوی حکومت ممکن ہوئی حالانکہ برطانیہ کی طرف سے ان مسلمانوں کے ساتھ نا منصفانہ سلوک ہوا ان مسلمانوں کی مرکزیت کا انجام کار ہندوستان کے مسئلہ کو بھی حل کر یگی اور ایشیا کے مسئلہ کو بھی۔ اس مرکزیت سے ان کا احساس ذمہ داری بڑھ جائے گا اور ان کے وطن پرورانہ محسوسات قوی ہو جائیں گے اس طرح ہندوستان کے جسد کے اندر نشو و نما کا پورا موقع حاصل کر کے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان اجنبی حملے کے مقابلہ کی بہترین سپر ثابت ہونگے، چاہے وہ حملہ نظریات کا ہو یا سنگینوں کا، پنجاب جہاں ۵۶ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے بقدر ۵۴ فی صدی ہندوستان کی فوج کیلئے جنگی جوان فراہم کرتا ہے اور اگر وہ ۱۹ ہزار گورکھے جو نیپال ریاست سے بھرتی ہوئے ہیں علحدہ رکھے جائیں تو کل

ہندوستانی فوج میں پنجابی جوانوں کا تناسب ۶۲ فیصدی ہو جاتا ہے
اس تناسب میں تقریباً ۵۰ ہزار جنگی جوان شمار نہیں کئے گئے ہیں
جو صوبہ سرحد اور بلوچستان نے ہندوستان فوج کو دیے ہیں اس سے آپ
اجنبی حملے کے مقابلہ میں ہندوستان کے دفاع کے متعلق شمال اور مغرب
ہندوستان کے مسلمانوں کے امکانات کا بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں مسٹر
آنرایبل سر سری نواس شاستری کا خیال یہ ہے کہ شمال مغربی سرحد پر خود مختار
مسلم ریاستوں کی تخلیق کے مسلم مطالبہ کی بنا اس خواہش پر ہے کہ حکومت
ہند پر خطرات کے وقت دباؤ ڈالنے کا موقع حاصل ہو۔
میں ان سے صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس قسم کا مقصد انھوں نے مسلمانوں
سے منسوب کیا ہے مسلمانوں کے مطالبہ کا وہ مقصد نہیں ہے مسلمانوں کے
مقصد کی بنا آزادانہ نشوونما کی ایک حقیقی خواہش پر ہے اور وہ خواہش
اس قسم کی وحدانی حکومت کے ماتحت پوری ہونی ناممکن ہے جو نیشلسٹ ہندو
سیاسیین کے مدنظر اس غرض سے ہے کہ کل ہندوستان میں ان کو مستقل
فرقہ وارانہ غلبہ حاصل ہو جائے پھر ہندوؤں کو یہ خوف نہیں لاحق ہونا چاہیے
کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کے معنے یہ ہونگے کہ ان ریاستوں میں
ایک قسم کی مذہبی حکومت قائم ہوگی۔ اس سے قبل اسلام کے متعلق لفظ
مذہب کے معنی کی طرف اشارہ کر چکا ہوں بات یہ ہے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام
نہیں ہے بلکہ وہ ایک اتحاد آمیز منظم وجود کے تخیل کے ماتحت ایک سیاسی نظام
کا حکم رکھتا ہے یہ نظام اس زمانے سے بہت پہلے قائم ہوا تھا جب روسو نے

اس قسم کا تخیل پیش کیا تھا پھر اس نظام کی جان ایک ایسا اخلاقی نقطہ نظر ہے جو آدمی کو گہرے طریق پر زمین کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتا زمین کے کسی مخصوص علاقہ سے اسکو منسوب کرتا ہے بلکہ اُسکے وجود کو ایک روحانی وجود مانتا ہے اور اُس کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ انسان ایک معاشرتی مشین کے کل پُرزے ہیں اور وہ اس معاشرتی مشین کے اندر ایک نہ نذہ پرزہ کی حیثیت کچھ حقوق کا مالک اور فرائض کا حامل ہے۔ کچھ دن ہوئے اخبار ٹائمز آف انڈیا نے انڈین بنکنگ انکوائری کمیٹی پر ایک مقالہ لکھا تھا اس سے ایک مسلم ریاست کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اخبار مذکور نے لکھا تھا کہ:-

قدیم ہندوستان میں ریاست سود کی شرحوں کو قابو میں رکھنے کیلئے قوانین بنایا کرتی تھی لیکن مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوستان کی مسلم ریاستوں نے سود شرحوں پر کوئی تحدیدات عائد نہ کیں حالانکہ اسلام کھلم کھلا قرض دیے ہوئے روپیہ پر سود کی وصولی کی ممانعت کرتا ہے۔"

"لہذا ہندوستان اور اسلام کے بہترین فوائد کا لحاظ کرتے ہوئے ایک متحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔ ہندوستان کیلئے اسکے معنی تحفظ امن ہونگے جو داخلی توازن قوت کا نتیجہ ہوگا اور اسلام کو اسکا موقع ملے گا کہ اس نقش سے نجات حاصل کرے جو عربی ملوکیت نے بمجبوراً اسلام پر قائم کیا تھا پھر اسلام سے اپنے قانون اپنی تعلیم اپنی ثقافت (کلچر) کو حرکت میں لانے کا امکان میسر ہوگا ایک طرف خود اپنی اصلی روح سے وابستہ کریگا اور دوسری طرف عصر حاضرہ کی روح کے قریب ہو جائے گا"

قریب مستقبل کیلئے تیاری | ایسی مسلمان سیاسی شخص کو اس معنی سے کوئی اثر قبول
نہیں کرنا چاہیئے جو پروپیگنڈا کے لفظ "فرقہ پرستی" میں پوشیدہ ہے یہ لفظ خاص کر
اسی مقصد سے گھڑا گیا ہے کہ برطانیہ کے جمہوریت پسندانہ جذبات سے غلط فائدہ
اُٹھایا جائے اور اہل انگلستان کو گمراہ کیا جائے اور ان کو یہ ظاہر کر دیا جائے
کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا دور دورہ ہے حالانکہ درحقیقت اس ملک
میں اسکا پتہ نہیں ہے۔ اسوقت اہم مسائل کا فیصلہ ہو رہا ہے ہماری تعداد دس
کروڑ ہے اور ہم ہندوستان کی ہر دوسری قوم سے زیادہ ایک قوم کا وجود
رکھتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند ہی ہندوستان کی وہ قوم ہیں جن کو
بجا طور پر لفظ "قوم" کے صحیح معنے میں ایک قوم کہا جا سکتا ہے ہندو اگرچہ
تقریباً تمام دوسرے اعتبارات سے ہم سے آگے ہیں لیکن وہ ابتک آپس میں وہ
ہم رنگی پیدا نہیں کر سکے ہیں جو ایک قوم کیلئے ضروری ہے یہ وہ نعمت ہے
جو اسلام نے مسلمانوں کو بے محنت عطا کر دی ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ
ہندو ایک قوم بننے کیلئے بیتاب ہیں لیکن ایک قوم بننے کا مرحلہ طے کرنا
ہفتخوان طے کرنا ہے اور جہانتک ہندو دنیا کے ایک قوم بننے کا تعلق ہے اس
سلسلے میں ہندو دنیا کو اپنے معاشرتی نظام کی کایا پلٹنی پڑے گی پھر مسلم
رہنما و سیاسیین کو اس پُرفریب اور غلط دلیل کی رو میں نہیں بہ جانا چاہیئے
کہ ترکی اور ایران اور دوسرے مسلم ممالک قومی یعنی جغرافیائی اصولوں پر
ترقی کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی حالت مختلف ہے ہندوستان
کے باہر کے ممالک اسلامیہ عملاً کل کے کل مسلم آبادی کے ملک ہیں یہاں کی

اقلیتیں قرآن پاک کی زبان میں اہل کتاب ہیں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان
کوئی معاشرتی رکاوٹیں حائل نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا کھانا کسی یہودی یا عیسائی
یا زرتشی کے چھونے سے ناپاک نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامیہ نے اہل کتاب
کے ساتھ شادی کی اجازت دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے انجام کار
دنیائے انسانیت کو ایک کر دینے کے باب میں جو پہلا عملی قدم اٹھایا ہے
وہ یہ ہے کہ جو قومیں عملاً یکساں اخلاقی مطمح نظر کی حامل ہیں اُن سے مطالبہ
کیا ہے کہ آگے بڑھو اور آپس میں ملجاؤ۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ اے اہل کتاب
آؤ ہم اس لفظ (وحدت رب) پر متحد ہو جائیں جو ہم سب کے درمیان مشترک ہے
اسلام اور مسیحیت کی جنگیں اور بعد کو مختلف صورتوں میں یورپ کی تعدی
اس آیہ پاک کے بے پایاں معنی کو دنیائے اسلام کے اندر بے اثر نہیں بنا سکی
چنانچہ آج ممالک اسلامیہ میں رفتہ رفتہ اس معنی کو اس چیز کی صورت میں
حاصل کیا جا رہا ہے جسے "مسلم نیشنلزم" کہا جاتا ہے۔"

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی دور بین نظروں اور اُنکے اسلامیت سے بھرے ہوئے
فکر نے جو راستہ مقرر کر دیا تھا وہی مسلمانوں کی مذہبی آزادی کا واحد راستہ تھا
اسکے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہیں ہے جو آزاد اسلام کی تخلیق میں معاون
ہو سکے۔ علامہ موصوف کی ذات گرامی اسلامی سیاست اور مذہب کا بہترین
سنگم تھی آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا تھا آج اُسکی اہمیت کا
اندازہ ہو رہا ہے اور مسلمانوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں اگر اسلام کا
کوئی سیاسی مستقبل ہے تو صرف یہی ہے دوسرے ممالک نے بھی اس طریقے پر

حل کیا ہے روس کی حکومت نے باوجود اپنے استبداد اور استعمار کے اور مخالف پارٹیوں پر وحشیانہ مظالم کے اقلیتوں کو دستور اساسی میں کافی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں لینن نے اس مسئلہ کے حل کیلئے یہ تجویز کیا تھا کہ :۔

"اپنی علیحدہ کلچر کی حفاظت کیلئے اگر کوئی اقلیت علیحدہ حکومت قائم کرنی چاہے تو ایسے علاقوں میں جہاں اس کلچر کے لوگ آباد ہوں وہ اپنی حکومت علیحدہ قائم کر سکتے ہیں"

حکومت روس حالانکہ لامذہب ہے اور اس اصول کی تبلیغ میں لاکھوں انسانوں کی جانوں کا خون کیا جاتا ہے لیکن اسکے باوجود افغانستان کے شمال میں کئی آزاد اسلامی ریاستیں قائم ہیں ۔ جکیستان، ترکمانستان کرغزیہ، قزہ، کلپاک وغیرہ یہ تمام ریاستیں اپنے کلچر اور تمدن کی حفاظت خود کرتی ہیں اور حکومت کے ذریعہ ان کو اتنا اختیار دیدیا گیا ہے کہ وہ اپنی تہذیب کے بذریعہ قانون قائم رکھ سکیں ۔ صرف یہی نہیں روس میں اسوقت ۱۱۵ جمہورتیں آباد ہیں جہاں کہیں ایک کلچر کے دس ہزار آدمی آباد ہیں اُنھیں علیحدہ اپنے علاقہ کی ری پبلک بنانے کا اختیار ہے اور جہاں پانچسو آدمی ایک جگہ جمع ہو جائیں وہ ملکر بڑی جمہوریت میں ایک جزوی جمہوریت بنا سکتے ہیں۔

زیکوسلوواکیا کی مثال پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے ۲۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہنلن نے ایوان حکومت میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے تھے ۔

(۱) زیکوسلاوکئین اور جرمنی کی اقلیت کی مساوی حیثیت ۔

(۲) جرمن حقوق کی محافظت کیلئے جرمن آبادی کو ایک جائز قوت کی حیثیت

تسلیم کرانا۔

(۳) ملک کے اندر ایک خاص جرمن رقبہ کی تعمیر کرنا۔

(۴) اس جرمن رقبہ کو حکومت خود اختیاری عطا کرنا۔

(۵) ہر ایک جرمنی شہری کی محافظت جبکہ وہ اپنے رقبہ کے باہر ہو۔

(۶) جرمن رقبہ کے اندر صرف جرمن افسران کا تقرر۔

ہندوستان کی اقلیت اور اکثریت میں زیکوسلوواکیا سے بھی زیادہ اختلاف ہے اور اقلیت کو بجا طور سے یہاں کی اکثریت کے طرز عمل سے ہمیشہ شکایت رہی ہے اکثریت کا موجودہ طرز عمل آئندہ خطرات کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمانان ہند کی سیاسی ترقی اور مذہبی حفاظت کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ شمالی مغربی چار صوبوں کو اور مشرق میں صوبہ بنگال اور آسام کے ایک حصہ کو ملا کر دو آزاد مسلم قومی اسٹیٹ بنا دیجائیں، ملک کے یہ دونوں حصے آزاد ہندوستان کے خاص جزو اور ہندوستان کے قومی مفاد سے وابستہ رہیں۔ باقی صوبوں میں مسلم اقلیتوں کی حفاظت دستور العمل میں تحفظات کے ذریعہ کی جائے۔ ان کی وزارت کی تشکیل میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی ہونی چاہیئے۔ ملک کے اندرونی نظام میں ان کو آبادی کے لحاظ سے برابر حصہ ملنا چاہیئے۔ ملازمتوں، اجاروں، ٹھیکوں اور سب چیزوں میں ان کا حصہ بقدر تناسب ملنا چاہیئے۔ ان کی زبان و تہذیب و تمدن کی حفاظت پورے طور سے کی جائے۔ اسی طرز عمل کو آزاد مسلم ریاستوں میں ہندو اقلیتوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہیئے اس صورت میں مسلم اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمانوں کی حفاظت کا زیادہ امکان ہے اسلئے کہ آزاد مسلم قومی ریاستیں

یہ بات [illegible] جس [illegible] پیدا ہوا اکثریت ہندوستان کیلئے [illegible] ہندوستانی مسلمانوں کی اقلیت [illegible]

ان کے حقوق کی حفاظت اسیطرح کر سکتی ہیں جس طرح آج ہٹلر زیکوسلوواکیا میں جرمن اقلیت کے حقوق کی حفاظت بزور قوت کرا رہا ہے۔ ہندو اکثریت ایسی صورت میں مسلم صوبوں کی ہندو اقلیت کی حفاظت کی ضمانت حاصل کرنے کیلئے ضرور مسلمان اقلیت کے ساتھ ویسا ہی طرز عمل اختیار کریگی۔ بہرحال اس اعلٰے نصب العین کو کانگریس کے اندر جذب ہو کر حاصل نہیں کیا جا سکتا اسی کیلئے ابھی سے ایک مضبوط علیحدہ مسلم جماعت کی تشکیل کی سخت ضرورت ہے جو آنیوالے انقلاب کے ساتھ ساتھ اپنے نصب العین کے حصول کیلئے جدوجہد جاری رکھے اور آٹھ کروڑ مسلمان قوم کی سیاسی اہمیت کو دوسرے اقوام کے سامنے محسوس کرلے اور یہ ثابت کردے کہ ہندوستان کا کوئی دستور العمل بغیر ان کی مدد کیلئے نہیں چل سکتا۔ خود ہندوؤں کا بھی فائدہ اسی میں ہے۔ اسطرح وہ مسلمانوں سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم کر سکیں گے اور ہندوستان کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھ سکیں گے ورنہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ یہی دشمنی سے بھرا ہوا اور حقارت آمیز طرز عمل جاری رہا تو عجب نہیں یہاں کے مظلوم مسلمانوں کی نظریں بیرونی مسلمان حکومتوں کی طرف جائیں جو یقیناً ہندوستان اور بالخصوص ہندوؤں کے لئے بہت مضر ثابت ہوگا۔

مگر بدقسمتی سے ہندو لیڈر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ہندوستان میں خالص ہندو راج قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ آزاد ہندوستان میں آزاد مسلم قومی اسٹیٹ کے تخیل سے وہ ابھی سے گھبراتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال چونکہ محسوس کرتے ہیں کہ کہیں آگے چلکر روس کی طرح اقلیتیں کلچر کے مطابق

جدا جمہوریتیں قائم کرنے کا مطالبہ نہ کریں اسلئے انہوں نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی خاص کلچر نہیں ہے۔ اور اسلئے متحدہ قومی تہذیب (جسکا نقشہ قدیم ہندو تہذیب کے مطابق بنایا جاچکا ہے) کے متمنی ہیں۔

مسلمانوں کے اسی مطالبہ سے ڈر کر کانگریسی لیڈر سرحد کے شمالی مغربی صوبے پر اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے ہیں سرحد میں کانگریسی اثر کے قائم رکھنے کیلئے وہ ہر امکانی کوشش صرف کر رہے ہیں بالخصوص جب سے کانگریسی وزارت اس صوبہ میں قائم ہوئی ہے کانگریس نے اپنی کوششوں میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ گاندھی جی وہاں ایک "مسلمان قلندر" کی حیثیت سے مشہور کیئے گئے ہیں پنڈت جی کا تعارف ایک مسلمان دوست اور اسلام پرست کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ سب سے خطرناک پروپیگنڈا جو اس صوبہ میں کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے مجاہد اور پرجوش سپاہیوں کو "عدم تشدد" اور "شانتی" کی تعلیم دیجا رہی ہے۔ اس پروپیگنڈے میں کانگریس ہزاروں روپیہ وہاں خرچ کر رہی ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۸ء کو گاندھی جی نے ایک طویل بیان شائع کیا تھا اسمیں سرحد کے متعلق ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے جس سے گاندھی جی کی نیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے:۔

"میں ذاتی طور سے ایک حیات میں دفن ہونا پسند کرونگا اور سرحد کو ترجیح دونگا اگر خدائی خدمتگار حقیقی طور سے عدم تشدد پر عامل ہو جائیں تو

عدم تشدد کی اسپرٹ پیدا کرنے اور ہند و مسلم اتحاد کیلئے بہترین معاون ثابت ہونگے اسلیے کہ اگر وہ خیالات الفاظ اور عمل کے اعتبار سے عدم تشدد پر عامل ہو جائیں اور ہند و مسلم اتحاد کے سچے ہی خواہ تو یقیناً اسکے ذریعہ ہم کو دو بڑی چیزیں حاصل ہونگی جن کی اس ملک میں سخت ضرورت ہے افغان حملہ کا خطرہ جس سے یہاں اسقدر خوف رہتا ہے بالکل بھلا دیا جائیگا اسکے اس دعوے کی سچائی کے امتحان کی تمنا میں ہوں میری خواہش ہے کہ میں ان کو چرخے کا پیغام بھی ذاتی طور سے پہونچا دوں"

یہ ہے سب سے زیادہ خطرناک پروپیگنڈا جو کانگریس کی طرف سے سرحد کے مسلم مجاہدین میں کیا جا رہا ہے اور ان کی جنگجو اور سپاہیانہ اسپرٹ کو تباہ کیا جا رہا ہے کانگریس اسمیں کافی کامیاب ہو چکی ہے خان عبدالغفار خاں عدم تشدد کے یہانتک قائل ہو چکے ہیں کہ گاندھی جی کے اس فلسفہ کو جزوِ ایمان سمجھنے لگے ہیں۔ چند ماہ قبل ایک خدائی خدمتگار کے معمولی سے تشدد کی بنا پر انہوں نے تین دن کا روزہ رکھا اور آئندہ کیلئے دھمکی دی کہ اگر پھر ایسا ہوا تو جان دیدونگا۔ وہی گاندھی جی کی سنت!

ڈاکٹر خاں نے پائجامہ چھوڑکر دھوتی باندھنا شروع کر دی ہے اور اپنی پالیسی بالکل کانگریس کی ہدایات کے مطابق بنائی ہے۔ یہ ایک اتنا زبردست خطرہ ہے کہ اگر کانگریس سرحد میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئی تو مسلم قومی اسٹیٹ کا تخیل بالکل بے معنی ہو جائے گا اسلئے کہ اس نصب العین کے حصول میں سب سے بڑی مدد صوبہ سرحد سے مل سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے سرحد کا

یہ خطرناک طلسم رفتہ رفتہ ٹوٹ رہا ہے اور سرحدی مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں۔

صوبہ سرحد کے کانگریس کے ساتھ اسقدر وابستہ ہونے سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ سرحد کے مسلمانوں کی تمام جانی اور مالی قربانیاں کانگریس کے نام سے منسوب ہونے لگیں۔ صوبہ سرحد نے آزادی ہند کیلئے ہندوستان کے ہر حصے سے زیادہ قربانیاں کی ہیں کانگریس چاہتی ہے کہ ان قربانیوں کو بھی اپنے ساتھ وابستہ کرے۔ مسلم عوام کے سامنے کانگریسی مسلمان اور بالخصوص احراری اصحاب یہی ثابت کرتے ہیں کہ سرحد نے جو قربانیاں کی ہیں وہ کانگریس کے احکامات کی تعمیل میں کی تھیں حالانکہ اسوقت تک خدائی خدمتگار تحریک کا کانگریس سے کوئی تعلق تک نہ تھا یہ سرحد کی ایک خالص اسلامی تحریک تھی۔ ہسٹری آف دی کانگریس کے مصنف نے خدائی خدمتگار تحریک کے کانگریس سے تعلق کو اس طرح بیان کیا ہے:-

"یہ خدائی خدمتگار اگست ۱۹۳۱ء تک کانگریس سے ملحق نہ تھے گاندھی جی عرصے سے سرحد جاکر خدائی خدمتگار تحریک کے حیرتناک نظام کو خود دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لارڈ اروِن نے اسکی اجازت نہ دی . . . ایک بڑا کارنامہ عمل میں آیا جب خدائی خدمتگاروں کا الحاق کانگریس کے ساتھ کر دیا گیا۔ . . . کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس سیدھے سادھے سپاہی کو کی نظر میں رکھنے والے سپاہی خان عبدالغفار خان کے اندر اتنی طاقت تھی"[1]

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۸۴۹۔

کہ وہ سرحد پر ایک خود مختار سرحدی اسٹیٹ قائم کر سکتا تھا ہر ایسے
معاہدہ کر سکتا تھا سرحد کے آزاد قبائل سے دوستی کر سکتا تھا اور خود
ہندوستان تک پر حملہ کر سکتا تھا۔ ایک لاکھ باوردی فوج۔ اور سب
کے سب پٹھان ہیں

اس تاریخی نوٹ سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ کس طرح سرحد میں کانگریس نے
جال پھیلانے کی کوشش کی تھی لیکن انشاء اللہ بہت جلد کانگریس محسوس
کرے گی کہ یہ جال خود انھیں کے پیروں میں ڈالا جائے گا۔ ؎

دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل — موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

ضرورت اسکی ہے کہ مسلمان حصول مقصد کیلئے اپنے نظام کو روز بروز قوی بنائیں اور
کانگریس کے متوازی اپنی زبردست تنظیم جاری رکھیں تاکہ وہی جماعت اقلیتوں کے حقوق
کی ضامن ہو ورنہ کانگریس کے تمام اعلانات اور مسلمانوں کی امیدیں بیکار ثابت ہونگی۔

باب چہارم

کانگریس کا نصب العین

آزادی کامل یا اینگلو ہندوراج

کانگریس کا دعوےٰ ہے کہ وہ ہندوستان کیلئے مکمل آزادی کی طالب ہے
اگرچہ کانگریس خود اس دعوے کا اعلان بہت دبی زبان سے کرتی ہے مگر

کانگریس اور مسلمانوں کے نادان دوست اصلی حقیقت پر پردہ ڈالکر پورن سوراجیہ کے نئے نئے معنے بیان کیا کرتے ہیں ان کے خیال میں کانگریس ہندوستان کو بیرونی تسلط سے قطعی آزاد کرانا چاہتی ہے حالانکہ گذشتہ اور موجودہ سیاسی واقعات کی رفتار اور کانگریس کی کھلم کھلا پالیسی اسکے بالکل خلاف ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں دو باتوں پر غور کرنا ہے اول یہ کہ آیا کانگریس واقعی مکمل آزادی چاہتی ہے؟ دوم یہ کہ آیا تا حصول آزادی مسلمانان ہند خاموشی کے ساتھ کانگریس کی مسلم کش حرکتوں کو برداشت کرتے ہیں اور آزادی ملنے کے بعد اپنے نصب العین کے حاصل کرنے کی کوشش کریں؟ ہندوستان کیلئے مکمل آزادی اور برطانوی پنجۂ استبداد سے بالکل قطع تعلق کر لینا ہندوستان اور اسلام کیلئے لازمی شے ہے ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ اسلامی ممالک کی آزادی کیلئے نہایت ضروری ہے لیکن یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آزادی کامل حاصل ہونے تک مسلمان اس انقلاب کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہیں، اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب کو کانگریس کے ہاتھوں ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی محض ایک موہوم امید میں خاموش بیٹھے رہیں سوراج کے ان دیوانوں کی حالت تو اس نادان مسافر جیسی ہے جسکی جیب سے اس کی عمر بھر کی جمع کی ہوئی پونجی رفتہ رفتہ زمین پر گر رہی ہو اسکے کپڑے تک بدن سے اتارے جا رہے ہوں اور جب اس کو اس بے حسی کی طرف متوجہ کیا جائے تو صرف ایک موہوم اور مفروضہ دفینہ کی امید میں وہ اس پونجی کے گم ہونے کا خیال تک بھی نہ کرے لیکن اس بیچارے غریب کی کیا حالت ہو گی جب اسکو منزل مقصود پر پہونچکر یہ معلوم ہو کہ وہاں خزانے کے بجائے کوئلہ کا

ایک بیکار ا نبار دفن ہے۔ اسی طرح آزادی کے شیدائوں کو جو آج مذہب کی ہر متاع بیش بہا کو سوراج کی غلط امید کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا رہے ہیں جب معلوم ہوگا کہ جس چیز کو وہ آزادی سمجھتے تھے وہ اسلام کو ختم کرنے کا ایک حربہ تھا، جس تیر کو وہ برطانیہ کے خلاف سمجھ کر چلا رہے تھے وہ خود مسلمانوں کے سینوں پر پڑ رہا تھا اور برطانیہ اور ہندو دونوں اس حماقت پر ہنس رہے تھے تو خود ان کا جو حشر ہوگا وہ الگ رہا قوم کی بے بسی اور بیکسی کا اسوقت کیا ٹھکانا ہوگا اگر آزادی حاصل کرنے کی ہماری تمام کوششیں مذہب اسلام کو اور اسلامی ممالک کو آزاد کرانے کیلئے ہیں تو یہ کیسی سیاست دانی ہے کہ آزادی تو حاصل کرنے سے قبل ہی مذہب کو ختم کر دیا جائے اور ہندو امپیریلزم کا غلام بنا دیا جائے۔ آزادی وطن خود مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک وسیلہ ہے آزادی اسلام کا پہلا زینہ ہے ہماری منزل مقصود کا صرف وسیلہ یا ذریعہ کو حاصل کرنے کیلئے مقصد کو پہلے ہی فنا کر دینا کہاں تک اسلامی ہے؟ پھر اس نادانی پر غور کیجئے کہ :-

"جب تک ہندوستان غلام ہے اور انگریز ہندوستان سے نہیں چلے جاتے اُسوقت تک تقسیم حقوق کا کوئی سوال نہیں اُٹھانا چاہیئے بعد میں مسلمان اپنی قوت سے اپنے حقوق حاصل کرلیں گے"

اس جماعت کے نزدیک گویا انگریز ہندوستان میں ایک پہرہ دار کی حیثیت میں ہے ایک وقت وہ پہرہ خود کو د چھوڑ دیگا اور ملک میں غدر رہا ہوگا اُسیوقت مسلمان گھر سے سوتے ہوئے نکلیں گے یا ۲۴ کا گ بسی مسلمان کا مذہبی تصرحوسے

چرخہ ہاتھ میں لئے برآمد ہونگے اور عدم تشدد کی پالیسی پر عامل رہتے ہوئے مسلمانوں کا حصہ چھین لینگے سبحان اللہ! کتنا معصومانہ خیال ہے افسوس یہ جماعت سیاسی حالات اور واقعات سے کس قدر بے بہرہ اور بے خبر ہے! وہ کبھی اس امر پر غور نہیں کرتے کہ سیاسی لڑائیوں کے طریقے بدل چکے ہیں۔ انگریز رفتہ رفتہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ آزادی ہندوستان کو بالاقساط ملتی جا رہی ہے ابتک بہت کچھ مل چکا ہے اور اسیطرح ملتا رہیگا برطانیہ کا ثمر ایک دن ضرور ٹوٹنا ہے۔ ؎

ٹوٹ کر گرنے کو ہے سکتے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

لیکن یہ پھل رفتہ رفتہ پک رہا ہے۔ اگر ابھی سے ہر ہر قدم پر جو انگریزوں سے ہندوستان کو نصیب ہو رہا ہے مسلمانان ہند اپنا قبضہ اپنے حصہ کے موافق نہیں جمائینگے تو جسوقت پانی سر سے گذر جائیگا، مذہبی جذبہ، اقتصادی مسائل میں ختم ہو جائیگا، مسلم تہذیب ہندو تہذیب میں لمجائے گی اور مسلمانوں میں کوئی مرکزی جماعت باقی نہ رہیگی تو مسلمان سوائے اپنی قسمت پر ماتم کرنے کے اور کچھ نہ کرسکیں گے۔

اس حقیقت کو مسٹر محمد علی جناح نے ۷ رفروری ۱۹۳۵ء کو اسمبلی میں کمیونل اوارڈ پر تقریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کیا تھا:-

"میرے معزز دوست لیڈر مخالف پارٹی نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پہلے ہمیں حقوق ملکر حاصل کرلینے چاہییں اسکے بعد تقسیم کا معاملہ

ہوتا رہے گا۔ میں نہایت ادب کے ساتھ اس اصول کو منطقی و بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہوں۔ اصل میں اقلیتوں کے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ پہلے حقوق طلبی و حصولِ حقوق پر عمل کیا جائے اور تقسیم حقوق کو مستقبل کے لئے ملتوی کر دیا جائے یہ کوئی جاگیر نہیں ہے کہ پہلے اس کو حاصل کیا جائے اور بعد میں حصہ بخرے ہوں گے نہ یہ کوئی لوٹ کا مال ہے کہ بعد میں برابر کے حصے بانٹ لیے جائیں گے اگر یہ بات ہے تو گاندھی جی نے اچھوتوں کے معاملہ کیلئے کیوں فاقہ مرگی شروع کی تھی اور حصول حق سے پہلے تعین حقوق کے مسئلہ کو کیوں فوقیت دی تھی۔"

اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہوئے جب ہم تصویر کے دوسرے رُخ پر غور کرتے ہیں کہ آیا کانگریس آزادی کامل کی طالب ہے بھی یا نہیں؟ تو ہماری مایوسی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔ برادرانِ وطن کی ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ اور تاریخی وسیاسی واقعات کا مشاہدہ اس امر کی شہادت ہے کہ کانگریس کے دل و دماغ میں اس آزادی کامل کا تخیل تک بھی نہیں جس کے لیے ہندوستان کے مسلمان بےچین ہیں۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ مسلمانوں کے دل میں برطانوی اقتدار کے خلاف جو جذبہ پیدا ہو سکتا ہے اور جس آزادی کے تخیل کے وہ مالک ہو سکتے ہیں وہ برادرانِ وطن کے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتا ہندوستان کی گذشتہ ایک ہزار برس کی تاریخ کا ہر صفحہ ان کی گذشتہ عظمت کی یادگار رہے۔ وہ کون بدبخت مسلمان ہے جو بہادر شاہ کی اولاد کو دہلی کے کوچوں میں کاسۂ گدائی ہاتھ میں

لئے ہوئے حسرت بھری نظروں سے بھیک مانگتے ہوئے دیکھ کر کف افسوس نہ ملے، دہلی اور آگرہ کے لال قلعہ کو ویران محلوں اور تخت طاؤس کی جگہ ٹوٹے ہوئے پتھروں، دیوان عام اور دیوان خاص میں مسند شاہی کے بجائے سنگ مرمر کی سلوں کو دیکھ کر خون کے آنسو نہ روئے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ تاج محل کی شاندار عمارت کا مشاہدہ شاہجہاں کے دور حکومت کا تخیل دماغ میں پیدا نہ کرے؟ وہ کونسا دل ہے جو گورستان شاہی میں جاکر یہ مرثیہ نہ پڑھے؟ ے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا　　دیدۂ عبرت خراج اشک گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مسلمان اگر بھلانا بھی چاہے تو اپنے گذشتہ کارنامے نہیں بھلا سکتا۔ انکا ہر کارنامہ ان کو آزادی کا سبق یاد دلاتا ہے۔ ے

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں　　اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

برطانیہ اور یوروپ کے خلاف اگر کوئی آواز ہو سکتی ہے تو وہ صرف مسلمانوں کی ہو سکتی ہے وہ آواز محمد علیؒ اور اقبالؒ کی ہو سکتی ہے گاندھی اور جواہرلال کی ہرگز نہیں!

حکومت ہندوستان کے خزانوں کی کنجیاں انگریزوں نے مسلمانوں سے لی ہیں اگرچہ برادران وطن کی بے وفائی اور کم فہمی کی بنا پر سہی۔ اسلئے فرض انھیں کا ہے کہ ہندوستان کی گم شدہ آزادی کے خزانہ کو پھر وہی واپس لیں اور قدرت کو یہی منظور معلوم ہوتا ہے۔ بیرونی تسلط کا اگر کوئی حقیقی دشمن ہو سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہے اسلئے کہ مسلمان کا مذہب پرسنل لا اور انکا پورا کلچر

آزاد فضا ہی میں سانس لے سکتا ہے غلامی کی قید میں اسلام کو ہمہ گیر حیثیت کے دکھانے کا نہ موقع مل سکتا ہے نہ مسلمان احکام اسلامی کی صحیح پابندی کر سکتے ہیں۔ غلامی کی حالت میں مسلمان کی وہ مجاہدانہ حرارت اور جوش کردار باقی ہی نہیں رہتا۔ ؎

نفس کے زور سے گر غنچہ وا ہوا بھی تو کیا ——— جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

پھر مسلمانوں کے سامنے بین الاقوامی سیاست بھی پریشان کن حالات کے ساتھ موجود ہے ان کو قبلۂ اول یعنے فلسطین کا مسئلہ ایک طرف بیچین کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف انکو فرنگ کی تجارتی چالوں کی حجاز میں بھی فکر ہے۔ اسلئے بقول مولانا محمد علیؒ مسلمانوں کا غدار سے غدار ٹوڈی بھی گاندھی جی سے زیادہ مکمل آزادی کا تخیل رکھ سکتا ہے۔

برخلاف اسکے برادران وطن کے دل برطانیہ نے کبھی زخمی نہیں کئے نہ ان کی سلطنت برطانیہ نے چھینی بلکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھین کر ان کے ساتھ بہت بڑا احسان کیا ہے کیونکہ وہ دنیا کی ہر قوم کی غلامی برداشت کرنے کو تیار ہیں لیکن مسلمانوں کو مساوی شریک حکومت بھی بنانا گوارا نہیں کرتے مسلمان حکومت کے زوال کے بعد ہمارا ہر حکومت برطانیہ کی عنایات کی نظریں ہندو پر رہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مفصل بیان کیا گیا ہے یہ بھی واقعہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ہندوؤں کی بہترین حفاظت افغانستان اور دوسرے بیرونی ممالک کے خلاف کر رہا ہے۔

علاوہ ازیں بدقسمتی سے برادران وطن کی تاریخ اس ملک سے اکھڑا ہر بس

گذشتہ تک بالکل وابستہ نہیں ہے۔ گذشتہ دس صدیوں میں ہندوستانی تاریخ کے صفحات مسلمانوں کے کارناموں سے لبریز اور ہندوؤں کے کارناموں سے خالی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس ملک کو ایک ہزار برس پہلے کی دنیا میں دیکھنا چاہتے ہیں ان کے دماغ میں وہی رام اور کرشن کا تخیل ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھا ان کا دل دہلی کے لال قلعہ اور آگرہ کے تاج محل اور ہمایوں کے مقبرہ کو دیکھ کر رو نہیں سکتا ان کی کوئی قربانی ملک کی خاطر تاریخ میں موجود نہیں ہے جس کی یادگار وہ بنا سکیں اور انگریزوں کے خلاف جذبات پیدا کر سکیں ظاہر ہے اگر ان کو نفرت ہو سکتی ہے تو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں سے، اسلئے کہ ان کی نظر و نہیں مسلمانوں کی وہی پوزیشن انکے خلاف ہے جو مسلمانوں کی نظر و نہیں انگریزوں کی۔

اسکے ساتھ ہی برادران وطن کو ہندوستان سے باہر کہیں مقامات مقدسہ یا خلافت وغیرہ کی حفاظت کا خیال نہیں۔ نہ بیرونی ممالک کی سیاست میں انکو اتنی دلچسپی ہو سکتی ہے جتنی مسلمانوں کو اسلیے کہ انکی تمامتر پرواز سیاست ہندوستان کی فضا میں محدود ہے۔ نہ انکا مذہب غلامی میں جکڑا ہوا ہے جبکہ مسلمان کا قدرتی نصب العین آزادی ہے اور انکا مذہبی عقیدہ ہے۔ ؎

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

اور جبکہ انکے مذہب کے مطابق سب سے بڑا جہاد ہی ظالم بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنا ہے تو آزادی کے تخیل کا ان سے زیادہ اور کون مالک ہو سکتا ہے برخلاف اسکے ہندوؤں کا کتابی اور مذہبی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ حکومت پر برسر اقتدار ہو جائے تو اُسکے خلاف آواز مت اٹھاؤ اسلئے کہ وہ تمہارے گناہوں کے بدلہ میں مقرر کیا گیا ہے اس سے بغاوت کرنا بہت بڑا گناہ ہے سے ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

انھیں وجوہات کی بنا پر کانگریس ۵۳ سال کے بعد بھی آج قریب قریب اسی پوزیشن پر قائم ہے جسپر ابتدا میں تھی۔ دادا بھائی نوروجی کے زمانہ کی کانگریس آج جواہر لال جی کے عہد میں بھی اسی طرح وفادار اور برطانیہ کی دوست ہے۔ جس طرح دادا بھائی نوروجی نے اوائل ایام میں صدارت کرتے ہوئے کانگریس کے جلسہ میں کہا تھا:-

"ہمیں مردانہ وار کہدینا اور اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہم سر سے پاؤں تک وفادار ہیں"

آج وہی الفاظ پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سُنیئے آپ نے پراگ کے ایک مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹریبون ۱۹ اگست ۳۸ء)

ان الفاظ پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ بھی ادا کیا گیا۔

۵۳ سال کے بعد کانگریس کی ذہنیت میں اگر کوئی فرق پیدا ہوا ہے تو صرف اسقدر کہ اب وہ ایک شیر خوار خورد سال بچہ کے بجائے برطانیہ کی ساختہ و

عورت ہے مگر اُس کی وفاداری اور سعادتمندی میں کوئی فرق نہیں آیا آج بھی وہ برطانوی بیرونی پالیسی کی ہمنوا ہے بلکہ اس حد تک سعادتمند ہے کہ برطانیہ ہی کے قدم بقدم چلکر ہندوستانی سیاست کی بنیاد ڈالنا چاہتی ہے وہی لارڈ ڈفرن کا بنایا ہوا معاملہ اب تک اپوزیشن پارٹی کی شکل میں قائم ہے۔

جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دینا، ہندوستانی فوجوں کو انگریزی مفاد کیلئے مہیا کرنا، پنجاب کے وحشیانہ مظالم کے بعد بھی حکومت برطانیہ میں اعتماد کی تجویز پاس کردینا، ترک موالات کو ایک دم روک دینا پھر شدھی اور سنگھٹن تحریکوں کی درپردہ ہمت افزائی کر کے مسلمانوں کی طاقت کے شیرازہ کو پریشان کرنا ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے ذریعہ ہندو راج کا صاف اعلان کردینا۔

یہ سب تاریخی واقعات (جنکا مفصل تذکرہ پیچھے آچکا ہے) کانگریس کی اصلیت کا پتہ دے رہے ہیں آج تک کبھی کانگریس کے ایک قدم پر آزادی کامل کی روشنی کی معمولی جھلک بھی نظر نہ آئی۔

احمد آباد کانگریس سیشن میں جب مولانا حسرت موہانی صاحب نے آزادی کامل کا ریزولیوشن پاس کرانا چاہا تو ان کو سخت ناکامی ہوئی۔ اسلئے کہ گاندھی جی آزادی کامل کو نصب العین بنانے میں بھی ہندوؤں کی سیاسی موت تصور کرتے ہیں۔

انھیں وجوہات پر مولانا حسرت موہانی اور محمد علی مرحوم وغیرہ کو یکے بعد دیگرے کانگریس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ۱۹۲۹ء میں لاہور میں آزادی کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا اُس کی حقیقت کس سے پوشیدہ ہے جو تجویز وہاں

پاس کیگئی وہ ویسرائے کی ضد پرتھی اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک حکومت برطانیہ نہرو رپورٹ کو منظور کرلیتی تو آزادی کا نام بھی نہ آتا لیکن پھر بھی جو تجویز پاس کی گئی اور جن مخالفتوں اور لڑائیوں کے بعد پاس کی گئی وہ بھی اظہر من الشمس ہے گاندھی جی کی چالاکیوں سے آزادی کامل نصب العین نہیں بنایا گیا بلکہ اسکے بجائے "پورن سوراجیہ" کے مبہم الفاظ نصب العین میں شامل کئے گئے یعنے کانگریس کی تمام کوششوں کا مقصد "پورن سوراجیہ" کا حصول ہے اس نئے نصب العین کے حصول کی کوشش کانگریس نے اسطرح کی کہ جب نہرو رپورٹ کو منظور نہیں کیا گیا اور "پورن سوراجیہ" کا اعلان کانگریس کی طرف سے ہوگیا تو گاندھی جی نے سول نافرمانی کی دھمکی دی لیکن جو فہرست مطالبات کی گاندھی جی نے ویسرائے کے پاس بھیجی اسمیں "آزادی کامل" کا نام تک بھی نہ تھا اگرچہ جنگ "آزادی کامل" کے نام سے لڑنے کا اعلان کیا گیا تھا مگر فہرست میں چند اصلاحی مطالبات پیش کئے گئے تھے۔ جیسے مالگزاری کا کمی کرنا، نمک کے ٹیکس کو ملتوی کرنا۔ بڑی ملازمتوں میں تنخواہوں میں کمی کرنا، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور سی آئی ڈی کے محکمہ کی علیحدگی[1] وغیرہ مطالبات تھے۔ ان مطالبات کو پیش کرتے وقت مہاتما گاندھی نے ویسرائے کو لکھا تھا:-

"اگر وائسرائے[2] ان سادہ مگر ضروری مطالبات کی طرف سے ہم کو اطمینان دلادیں تو وہ سول نافرمانی کا ذکر بھی نہیں سُنیں گے اور ہم دل سے ہر

---

[1] یہ امر قابل غور ہے کہ آج کانگریس دور حکومت میں پولیٹکل سی آئی ڈی زیادہ استعمال میں آرہی ہے۔ [2] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۶۲۰۔

کانفرنس میں شریک ہونگے۔"

لیکن جب ان مطالبات کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا تو سول نافرمانی شروع کرنے سے قبل مہاتما جی نے دوسری مارچ ۳۰ء کو سابرمتی آشرم سے پھر خط لکھا جسمیں گورنمنٹ کو بتلایا کہ وہ سوراجیہ سے خائف نہوں وہ تو بالکل وہی چیز ہے جسکو وائسرائے دینے کا خود وعدہ کرچکے ہیں، لہٰذا آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر ڈومنین اسٹیٹس جسکا آپنے اعلان کیا ہے اصلی معنوں میں استعمال کیا جائے تو سوراج کے ریزولیوشن سے کوئی خطرہ محسوس کرنا نہیں چاہیئے اسلئے کہ برطانوی مدبرین بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈومنین اسٹیٹس بھی ایک قسم کی آزادی ہی ہے۔ لیکن مجھے جو اندیشہ ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ڈومینین اسٹیٹس دینے کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔"[1]

اس اعلان سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ پورن سوراجیہ اور ڈومنین اسٹیٹس ایک ہی شئے ہے جس کی رو سے انگریزی تسلط اپنی اصلی شکل میں باقی رہے البتہ اندرونی نظام کی مکمل طور سے مالک ملک کی اکثریت ہو۔ جب گاندھی جی کے تمام مطالبات نامنظور ہوئے تو طوعاً و کرہاً گاندھی جی نے سول نافرمانی کا اعلان کیا لیکن کس قانون توڑنے کیلئے ؟ صرف قانون نمک کی خلاف ورزی کیلئے ! آزادی کامل کا علمبردار آزادی کی تلاش ڈانڈی میں نمک بنا کر کرنا چاہتا ہے آپنے ڈانڈی پہونچنے سے قبل سورت میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"اگر نمک کا قانون توڑنے میں اور شراب کی تجارت ہندوستان میں بند

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۶۳۲۔ [2] ایضاً صفحہ ۶۵۴۔

کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اہنسا کی کامیابی ہے اور پھر دنیا کی کون سی طاقت سوراج کے حصول کو روک سکے گی؟ اگر کوئی ایسی طاقت ہے تو میں اُسے دیکھونگا: تو میں اپنے مقصد کو لیکر واپس آؤنگا یا میری مردہ لاش سمندر میں تیرتی ہوئی ہوگی۔"

ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ قانون نمک کو توڑ کر جو سوراج مل سکتا ہے اُس سوراجیہ کی طاقت اور اہمیت آجتک کسی کو معلوم نہو سکی پھر گاندھی جی کے اس دعوے کا مقابلہ کہ "یا میری مردہ لاش سمندر میں تیرتی ہوئی ہوگی" علمبردار حریت مولانا محمد علی کے اس دعوے سے کیجئے "میں غلام ملک کو لوٹ کر زندہ واپس نہیں جاؤنگا"، اور غور کیجئے کہ کونسا دعوے سچائی پر مبنی تھا۔ گاندھی جی ظاہر ہے کہ آجتک اپنے مقصد میں کامیاب نہو سکے لیکن مردہ لاش سمندر میں کبھی نہیں تیری۔

اسی طرح آپ نے یہ قسم بھی کھائی تھی کہ اگر سوراجیہ نہیں ملا تو آشرم میں رہنا چھوڑ دونگا۔ لہذا ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے اخبار کے نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ:—

"میں آشرم کو دیکھونگا ضرور لیکن جبتک پورن سوراجیہ کی قسم پوری نہو جائے وہاں رہونگا نہیں۔"

لیکن حیرت ہے کہ گاندھی جی اب بھی آشرم میں اسی طور سے مقیم ہیں اور کانگریس آشرم کے طواف میں آج بھی مصروف ہے۔

گاندھی جی جب سول نافرمانی کے سلسلے میں جیل چلے گئے تو ۲ مئی ۱۹۳۰ء کو

ؔ ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۶۲۳۔

مسٹر سلو کومب نے گاندھی جی سے یرودا جیل میں ملاقات کی مہاتما جی نے ابتدا میں دس مطالبات پیش کئے تھے مگر اب وہ بغیر سوراج حاصل کئے ہی ان مطالبات میں بھی کمی کرنے پر آمادہ ہوگئے اور محض تین مطالبات پر صلح کرنے کی خواہش ظاہر کی جس نے ان کی مرعوب ذہنیت کو بالکل سامنے رکھدیا۔

پھر گاندھی اروِن پیکٹ میں جس ذہنیت کا اظہار گاندھی جی نے کیا وہ صد درجہ شرمناک ہے خود پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر سوبھاش بوس نے اس سے اتفاق نہیں کیا لیکن گاندھی جی نے سب کو رام کر لیا اور صلح کر کے لندن کی راہ لی جو لوگ منتظر تھے کہ گاندھی جی ڈانڈی سے بغیر آزادی لئے ہوئے واپس ہی نہیں آئینگے سخت تشویش و پریشانی میں تھے گاندھی اروِن پیکٹ کا سرسری مطالعہ اس امر کو واضح کر دیتا ہے کہ گاندھی جی کا پورن سوراجیہ تو ڈومنین اسٹیٹس کے برابر بھی مرتبہ نہیں رکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی پورن سوراجیہ کے مختلف اوقات میں مختلف معنے بیان فرماتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کا دعوے ہے کہ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی ہے اور پورن سوراجیہ کے معنی آزادی کامل بیان کیا کرتے ہیں۔ وہ اس امر پر غور فرمائیں کہ گاندھی جی خود اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ پورن سوراجیہ کے کوئی خاص معنی نہیں ہیں ہر موقع پر اسکے لئے نئے معنی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

گاندھی جی سے ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء کو دہلی میں امریکہ اور لندن کے اخبارات کے نمائندوں نے سوالات کئے آپ نے ایک سوال کے جواب میں پورن سوراجیہ کی تعریف اسطرح کی :-

"میں اس سوال کا مناسب جواب نہیں دے سکتا اسلئے کہ انگریزی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو اُس کے معنوں پر حاوی ہو اُسکے لغوی معنی ہیں 'اپنی حکومت'، آزادی میں یہ معنی پنہاں نہیں ہیں۔ "سوراج" کے معنی ہیں اندرونی طور سے منظم حکومت اور 'پورنا' کے معنی 'مکمل'، کوئی صحیح لفظ نہ پاتے ہوئے ہم نے "مکمل آزادی" کے لفظ کو اسکے معنوں میں مجبوراً اختیار کر لیا ہے۔ پورن سوراجیہ کا یہ مطلب نہیں کہ کسی بیرونی طاقت سے تعلقات نہ رکھے جائیں اور برطانیہ سے تو کس طرح منقطع کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ تعلق باہمی فائدہ کے لئے ہیں۔"

یہ ہے تعریف سوراج کی۔ اسمیں برطانیہ سے باہمی مفاد کیلئے تعلقات بھی قائم کئے جا سکتے ہیں باہمی مفاد سے کیا مراد ہے؟ یہی کہ برطانیہ کا تجارتی مفاد، اور ہندوؤں کا بیرونی حملوں سے محافظت کا مفاد۔ تعجب یہ ہے کہ گاندھی جی "مکمل آزادی" کے لفظ میں وہ معنویت ہی نہیں دیکھتے اور "پورن سوراجیہ" کا لفظ اختیار کرتے ہیں حالانکہ مکمل آزادی کا صاف مطلب یہ ہے کہ کسی بیرونی طاقت سے کسی قسم کا تعلق اندرونی معاملات یا بیرونی پالیسی میں حاکم و محکوم کی حیثیت سے نہ رکھا جائے۔

پھر اسی روز جب یہ سوال مہاتما جی سے کیا گیا کہ کیا آپ پورن سوراج برٹش جھنڈے کے نیچے قبول کر سکیں گے؟ تو گاندھی جی نے جواب دیا۔

"اس جھنڈے کے نیچے نہیں بلکہ اگر ممکن ہوا تو ایک مشترک جھنڈے کے

؎ یہی حقیقت میں کانگریس کا اصل آئیڈیل ہے یعنی اندرونی طور سے منظم حکومت حاصل کرنا۔

نیچے اور اگر ضرورت ہوئی تو علٰحدہ قومی جھنڈے کے نیچے"۔
کیا آزادی کامل میں مشترک جھنڈے کی گنجائش ہے؟ اور اس کے معنے گاندھی جی فرماتے ہیں کہ جبتک ممکن ہوگا مشترک جھنڈا رکھا جائیگا اور جب مجبوراً کبھی ضرورت پڑی یا افغانستان وغیرہ کا خطرہ جاتا رہا تو علٰحدگی اختیار کرلیجائیگی۔
پھر ایک مضمون میں آپ فرماتے ہیں:۔

"سوراجیہ کے جاہے کتنے ہی سے لوگوں کو بتاؤں پھر بھی میرے نزدیک سوراجیہ کے ایک ہی معنے ہیں اور وہ ہے رام راجیہ" (ہرِیجن ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء)

جب گورنروں اور کانگریسی وزیروں میں آئینی تصادم درپیش ہوا تو گاندھی جی نے اپنے بیان میں فرمایا تھا:۔

"میں اپنے خون کا آخری قطرہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے میں صرف کردونگا"

مسٹر سبھاش بوس نے پورن سوراجیہ سے یہ مراد لی ہے کہ وہ آزاد قوموں کے وفاق میں شامل ہوکر حکومت برطانیہ کا ایک حصہ بنجائے لہذا ۱۹۳۸ء کے ہری پور کانگریس کے خطبہ صدارت میں آپ فرماتے ہیں:۔

"برطانوی سلطنت اسوقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک راستہ پر کھڑی ہے یا تو وہ اس انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہوچکا ہے یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا برطانیہ عظمٰے کیلئے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم

---

[1] ہسٹری آف دی کانگریس صفحہ ۱۰۰۷۔

کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سلطنت کو آزاد قوموں کے وفاق میں تبدیل کر دے۔

سوراج کی عمارت کی تعمیر جس نقشے پر کی جا رہی ہے اُسکا دھندلا سا خاکہ ناظرین کے سامنے ہے عمارت کا مکمل نقشہ انگلستان کا بنا ہوا ہے خود برطانیہ ہی پوری عمارت کا نگہبان اور محافظ ہے آزادی کامل کا تخیل جسمیں برطانیہ سے سیاسی تعلقات کا انقطاع منظور ہو سازندگان عمارت کے دماغ میں بھی موجود نہیں ہے اس عمارت کی ایک منزل بھی برطانیہ کی مدد کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اسوقت ملک میں جو انقلاب رونما ہے اُسکا مکمل ڈھانچہ وہی ہے جس کو توڑنے کیلئے مسلمان اسقدر بیچین ہیں وہ نقشہ وہی ہے جسکا ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ میں صاف صاف اعلان کر دیا گیا تھا۔ اب تک اُسمیں سرمو فرق نہیں آیا۔ اُسکی رو سے بیرونی حملوں کا محافظ برطانیہ ہے اور اندرونی نظام کا مالک ہندو۔ انگریز اس حفاظت کے بدلہ میں تجارتی مفاد کے قیام پر اکتفا کرنے پر راضی ہے اسطرح اندرونی و بیرونی طور سے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے کمزور کرنے کیلئے جدوجہد جاری ہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کی طرف جو قدم بھی اُٹھ رہا ہے وہ مغربی تخیل کے موافق اور ہر حرکت انگریزوں کے اشاروں پر کی جا رہی ہے۔ بقول مولانا ابوالاعلےٰ مودودی صاحب :-

"اس طور پر جو اسٹیٹ کسی اسٹیٹ کے اندر سے پیدا ہوتا ہے لامحالہ اپنے مورث کی روایات اور اس کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ بالکل اسطرح جسطرح بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ کے ورثہ کا حامل ہوا کرتا ہے مگر یہ بچہ

سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے آزادی کے دیوانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ فرعون کے گھر میں بچہ فرعون نشو ونما پا رہا ہے اور عنقریب ولیعہدی کی رسم ادا ہونے والی ہے۔ مگر یہ سادہ لوح اب بھی ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو یقین دلاتے پھرتے ہیں کہ فرعون کے ہاں موسےٰ پرورش پا رہا ہے۔ وہاں آپ کی قومیت کو ختم کر دینے کیلئے ذبح اطفال سے زیادہ خطرناک اور زیادہ کارگر پالیسی پر عملدرآمد شروع ہو چکا اور حضرت فرماتے ہیں کہ فی الحال تو آزادی کی جنگ۔ یعنے اپنی قبر کھودنے میں آنکھ بند کرکے شریک ہو جاؤ پھر آزادی حاصل ہو جانے کے بعد۔ یعنے قبر میں مدفون ہو جانے کے بعد۔ اُٹھ کر اپنی قومی زندگی (حیات بعد الممات) کی حفاظت کر لینا“ ۵

عطا کی ہے مجھے تہذیب حاضر نے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

باب پنجم

کانگریس اور گئو رکھشا

جو قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو جسکا آخری نصب العین ہی یہ ہو کہ کسی طرح وطن بیرونی تسلط سے آزاد ہو۔ اور جسکا یہ دعوے ہو کہ انکے سامنے مذہب کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کیا وہ اپنی قوت فکر کو ایک لمحہ کے لئے بھی اُردو، ہندی اور گئو رکھشا جیسے پست مسائل پر ضائع کر سکتی ہو اور بالخصوص جبکہ

ایسے واقعات سے آٹھ کروڑ ہندوستانی متاثر ہوں گا ذکشی کے خلاف کانگریس کے زعماء نے ہمیشہ آواز بلند کی اور اسکے لئے نئی نئی اسکیمیں تیار کی جا رہی ہیں کہ کسی طرح گئو کشی ہندوستان میں بالکل بند ہو جائے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بھائی پرمانند سے لیکر گاندھی جی تک گائے کو مقدس ترین شے سمجھتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے خون سے زیادہ گائے کی عزت کرتے ہیں۔ ان کو اسکی پرواہ نہیں کہ مسلمان پھر بھی انسان ہے اور گائے جانور ہے۔ کانگریسی حکومت کے سر پر آرا ہوتے ہی سب سے پہلے مدراس اسمبلی میں گاذکشی کے خلاف بل پیش کرنے نوٹس دیا گیا جسکا مفہوم یہ تھا کہ :-

"ہر وہ شخص جو گائے یا بچھڑے کو ذبح کرے یا ذبح کرنے کی ترغیب دے وہ مجرم ہوگا اور اس جرم کی سزا پچاس روپیہ جرمانہ یا پندرہ دن کی قید محض ہوگی"

مگر جب تمام ہندوستان میں شور مچا اور جمعیتہ العلماء کے سکریٹری نے تار دیا تو بل واپس لے لیا گیا۔ لیکن کوشش برابر جاری رہی۔ لہذا اگست ۳۶ء میں مشہور کانگریسیوں کے ایک وفد نے گاندھی جی سے واردھا میں اور جواہر لال اور راجندر پرشاد اور پٹیل سے ملاقات کی اور گئو رکھشا کے متعلق مشورہ کیا جس پر ان آزادی کے رہنماؤں نے ان کی زبان بند نہیں کی نہ انکو اسی طرح نصیحت کی کہ

"ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں پڑکر آزادی کی منزل دور مت کرو"

جسطرح شہید گنج کی مسجد کو شہید ہوتے وقت جواہر لال نے فرمایا تھا کہ یہ بہت معمولی معاملات ہیں ان مسائل پر غور کرنے کا موقع نہیں مگر اسوقت گئو رکھشا کا

مسئلہ تھا انھوں نے متفقہ طور سے وفد سے وعدہ کیا کہ وہ پوری توجہ اس مسئلہ پر صرف کریں گے۔

بمبئی کے مشہور رولر ہیر مسٹر منشی نے مہاتما جی سے اسکے دو ہفتے بعد ملاقات کی اور انھوں نے بھی اس مسئلہ کی طرف گاندھی جی کی توجہ دلائی۔ گاندھی جی نے وعدہ کیا کہ وہ کوئی صورت ایسی ضرور نکالیں گے۔

صوبہ پنجاب کی کانگریس کمیٹی کے صدر صاحب ڈاکٹر سیتہ پال کے مندرجہ ذیل خوش کن الفاظ ہندو مہا سبھا کی نہیں بلکہ کانگریس کی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں اسلئے کہ انھوں نے یہ الفاظ ایک بیان میں تحریر فرمائے ہیں جو بحیثیت کانگریس کے صدر کے ۲۵ راگست ۳۷ء کو شائع فرمایا تھا۔ ان کا پورا بیان ۲۹ راگست کے تیج میں ہے وہ الفاظ یہ ہیں :-

"کانگریس گوارا نہیں کرسکتی کہ کسی جماعت کے مذہبی حیات میں ٹھیس لگے کیونکہ یہ بات مصدقہ ہے کہ ہندوؤں کیلئے گائے واجب الاحترام ہے اسلئے کانگریس برداشت نہیں کرسکتی کہ کھلے بندوں ایسا کام جاری ہو جس سے ہندوؤں کو نقصان پہونچے۔"

اس بیان کو پڑھ کر اندازہ کیجئے کہ کانگریس یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہے کہ وہ آزادی کے راستہ میں مذہب کی تفریق ہی نہیں کرتی۔

اور بہت سے بیانات اس سے زیادہ پریشان کرنیوالے ہیں بالخصوص متھرا کے سکریٹری ہندو مہا سبھا اور تیج اخبار کے مقالے ہیں جنمیں بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کانگریس اور ہندو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے کہ گاؤ کشی

جاری رہے۔ کانگریس کی توجہ ابتک اس مسئلہ پر صرف ہو رہی ہے۔ لہذا ڈسٹرکٹ
بورڈوں اور میونسپل بورڈوں میں مخلوط انتخابات رائج کرانے کی اسکیم گاؤکشی
بند کرنے کیلئے بہترین حربہ ہے۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ساتھ "گاؤ
کانفرنسیں" منعقد کی جاتی ہیں "گئو رکھشا" کے فوائد پر کانگریس کی طرف سے لیکچروں کا
انتظام کیا جاتا ہے "گئو نمائشیں" تک اجلاس کانگریس کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ ہری پور
سیشن میں تو گاندھی جی نے صاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ

"کہ کسی نہ کسی طرح بذریعہ قانون گئوکشی بند کی جائے گی"

گئو رکھشا کی کانفرنسوں اور نمائشوں میں پنڈت جواہرلال اور سوبھاش بوس
تک شرکت فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کیلئے گاؤکشی فرض نہیں ہے مگر مولانا حسین احمد صاحب کے
قول کے مطابق جب کوئی حکومت زبردستی اپنی طاقت سے کسی ایسے کام کو منع
کرتی ہے۔ جس کو مذہب نے حلال کیا ہے تو ایسی صورت میں گلے کا ذبح نہ کرنا
گناہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمانوں کا جائز تمدنی حق ہے۔ آج دنیا کی ہر زندہ قوم
اپنے تمدنی اور شہری حقوق کو حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ پھر مسلمان اگر اس حق
کو قائم رکھنے پر مصر ہیں تو کانگریس اور ہندو زعماء کیوں اسقدر پریشان ہیں۔ برادران
وطن کو خوب معلوم ہے کہ اگر گاؤکشی بند کر دیجائے تو ہندوستان کی تمام سرزمین
بھی چارہ کیلئے ناکافی ثابت ہوگی اور نسل اسقدر بڑھ جائے گی کہ ہندوؤں
کو خود گاؤکشی کرنی پڑیگی۔ جس طرح ضلع فتحپور میں خود ہندوؤں کو درخواست
دینی پڑی تھی کہ یہاں گائیں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ کھیتی اجاڑ ہو جاتی ہے اور

یہ بھی معلوم ہے کہ انسداد گاؤکشی سے اقتصادی نقصان کتنا بڑا ہے۔ کتنی بڑی صنعت جو گائے کی کھال اور ہڈیوں سے جاری ہے بند ہو جائے گی۔

ذبیحہ گاؤ مسلمانوں کیلئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ شاہان سلف کے زمانے میں قربانی اور روزانہ استعمال کیلئے برابر گاؤکشی ہوتی تھی۔ غدر سے قبل تک کبھی گاؤکشی نے کسی مسئلے نے فرقہ وارانہ حیثیت اختیار نہیں کی۔ انیسویں صدی کے آخر سے جب ہندوؤں نے اپنی تنظیم کرنی شروع کی تو اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں اعظم گڑھ میں ذبیحہ گاؤ پر بہت بڑا فساد ہوا۔ یہ غالباً گاؤکشی پر سب سے پہلا فساد تھا۔ اس فساد کے بعد ہی مسٹر تلک نے انجمن مخالفین ذبیحہ گاؤ کشی کی بنیاد ڈالی۔ اسی زمانے میں بنارس کی گئو رکھشا سبھا کے اہتمام سے ایک تصویر بنائی گئی تھی۔ ایک گائے کے جسم میں کثرت سے دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں، چند تصویریں مختلف اقوام و مذہب کے لوگوں کی اسکے تھنوں کے قریب ہیں اور ایک ہندو دودھ تقسیم کر رہا ہے۔ دو صورتیں گائے کے منہ کے سامنے ہیں۔ جنمیں سے ایک کی صورت شخص خنزیر کی اور جسم ایک وحشی سفاک کا جو تلوار لئے ہوئے گائے پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری تصویر ایک برہمن کی ہے جو حملہ آور اور گائے کے درمیان حائل ہے۔ دم اور پشت کی طرف کچھ اشلوک سنسکرت میں ہیں جنکو کوئی رشی ہاتھ اٹھائے جپ رہا ہے۔ گائے کے پاؤں کے نیچے قرآن مجید کی آیت لن تنال اللہ (خدا کے پاس قربانی اور خون نہیں پہونچتا بلکہ تمہارا تقوے اس تک پہونچتا ہے) ہے۔

اس تصویر کو پھر سنہ ۱۹۱۲ء میں ارزانی کی وجہ سے کثیر تعداد میں جرمن میں

چھپوا کر مشتہر کیا گیا۔

تحریک خلافت کے بعد سوامی شردھانند نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کی تو گاؤکشی کے مسئلہ کو صرف مسلمانوں سے تصادم پیدا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا۔ باوجودیکہ گائے کی عزت ہندو برابر کرتے تھے لیکن شردھانند اور سوامی دیانند صاحبان سے پیشتر اس مسئلہ کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسی زمانے میں گئو شالاؤں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔

مہاشے کرشن بی۔ اے۔ ایڈیٹر پرکاش کا مندرجہ ذیل مضمون اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:-

"گئو رکھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت بندھن ہے۔ گئو رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند نے دیئے تھے اور آج جو گئو شالائیں نظر آتی ہیں یہ سب اسی آواز کا نتیجہ ہیں۔ رشی دیانند نے صرف لیکچروں میں ہی گئو رکھشا پر زور نہیں دیا بلکہ اس مضمون پر ایک پستک تیار کی اور اس سے بھی ادھک سو یہ کوشش کرنا چاہتے تھے کہ بھارت سے گئو کشی قانوناً بند کر دیا جائے۔"

یہ اقبالی بیان خود اس امر کا شاہد ہے کہ اگر دیانند اس مسئلہ کو نہ اٹھاتے تو ملک کی فضا اس سوال کی وجہ سے اتنی مکدر نہ ہوتی۔ پھر بھی کانگریسی حضرات شردھانند اور دیانند کو خداوندان کانگریس تسلیم کرتے ہیں اور ان کی خدمات کی تعریف میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ علاوہ مندرجہ بالا بیان کے اور متعدد تاریخی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن سے ثابت ہے کہ گاؤکشی کا مسئلہ

ہندو مذہب کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی حربہ ہے، پنڈت ابناس چندر داس صاحب ایم اے اپنی تصنیف رگ ویدک انڈیا طبع دوم نمبر ۹ میں فرماتے ہیں:۔

"قدیم آریوں کے یہاں گائے کا گوشت کھانے کی شہادت پائی جاتی ہے لیکن دودھ دینے والی گائیں شاذونادر ہی ماری جاتی تھیں"

شری چنتامن راؤ ویدیہ فرماتے ہیں:۔

"زمانہ قدیم میں رشی لوگ گائے کے گوشت کا استعمال کرتے تھے"

(رگو میدہ مصنفہ پنڈت دامودر ساتو لیکر جی)

صرف انھیں تاریخی شواہد سے نہیں بلکہ بہت سے وید کے منتروں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچی ہے۔ اتھروید کانڈ نمبر ۹ سرکت نمبر ۳ - نویں منتر میں لکھا ہے:۔

"اتیدوا اسواد یہ یدآدھی گوم - کشیرم وامانسم وا تدا یذما شینات"

اسکا مطلب یہ ہے کہ:۔

آہل خانہ گائے کا شیریں دودھ اور لذیذ گوشت مہمان کو کھلائے بغیر نہ کھائے"

مسلمانوں کے ہندوستان کے آجانے کے بعد گئو رکھشا کے خیالات ہندؤں میں ضرور پیدا ہوئے تھے مگر وہ ہندو برہمنوں کا مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت کرنے کا ایک سیاسی آلہ تھا جو زیادہ کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ غدر کے بعد تک اس مسئلہ نے فرقہ وارانہ حیثیت اختیار نہ کی تھی یہ سوامی دیانند وغیرہ کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔
اسکے بعد سے متواتر کوششیں ذبیحہ گاؤ کو بند کرنے کیلئے کی گئیں۔

عیدالضحیٰ کے اکثر موقعوں پر مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکا گیا اور متعدد مقامات پہ مسلمانوں کے خون بہائے گئے۔ یہاں تک کہ خود گاندھی جی نے ایک مضمون میں فرمایا:-

"یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یورپین کیلئے گاؤکشی ہماری سہنے کے باعث ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے میں جانتا ہوں کہ انکا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں اُسکی روح کے سراسر خلاف ہے۔ عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤکشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے وہ اغماض نہ کریگا"

اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دیگئی کہ گؤکشی سوراجیہ کا ایک جزو بنگیا حقیقت یہی ہے کہ گاؤکشی اور ہندی پرچار وغیرہ ہی کانگریس کا نصب العین ہے ورنہ سوراجیہ کے اس سے زیادہ اور کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اسکے متعدد ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں قریب قریب ہر کانگریس کے بڑے سے بڑے لیڈر نے سوراجیہ اور گؤرکشا کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔

لالہ لاجپت رائے نے جو کانگریس کے بہت بڑے لیڈر تھے ناگپور میں ۱۹۲۱ء گائے کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:-

"جب تک سوراجیہ حاصل نہیں ہوتا۔ تب تک گؤرکشا کا سوال سلجھ

لہ بحوالہ اخبار انقلاب لاہور- الفضل ۵ مارچ ۱۹۲۵ء

نہیں ہو سکتا ۔"

مالویہ جی فرماتے ہیں :-

" اہل برطانیہ نے ہندوستان میں کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے ۔ انہیں سے ایک غلطی یہ بھی ہے کہ انھوں نے گائے کے ذبح کو جاری رکھا ۔ آپ نے ہر ہندو کو تاکید کی کہ وہ سوراج حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ گاؤکشی بند کرانے کے قابل ہو جائیں ۔"[1]

یہ ہے وہ سوراجیہ کا تخیل جو کانگریسی حضرات کے سامنے ہے اور پھر بھی مسلمان فرقہ پرور کہلاتے ہیں اور ہندو قوم پرست کہلاتے ہیں ۔

باب ششم

اُردو زبان کو ختم کرنے کی کوششیں

مسلمان بادشاہوں کی صد درجہ رواداری اُردو کی تخلیق کا سبب بنی یہاں کے مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان سے تعلق قائم رکھنے اور باہمی مغایرت دور کرنے کی غرض سے اسلامی زبانوں کی تبلیغ کی بجائے ایک مشترک زبان کی بنیاد ڈالی جس کی ابتدائی زمانہ حکومت اسلامی سے ہی بنیاد ڈالنی شروع کردی گئی تھی ۔ امیر خسرو اور دکھنی نے اس پودے کی داغ بیل ڈالی اور ریختہ نام رکھا ۔

---

[1] انقلاب ۱۰ ؍ جون ۱۹۳۸ء

شاہجہاں کے زمانہ میں اس نے اُردو نام پایا جو بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی۔ لیکن غدر کے بعد جب ہندوؤں کو اپنی پُرانی قومیت کی دوبارہ تشکیل کا خیال آیا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات تازہ ہوئے تو اُنھوں نے اپنی علحدہ زبان بھی قائم کرنا چاہی انگریزوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی سب سے پہلے بنارس میں ہندی کی ترویج کا خیال پیدا ہوا چنانچہ حالی مرحوم لکھتے ہیں :۔

"۱۸۶۷ء میں بنارس میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اسکے بھاشا زبان رائج ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے"

اسکے بعد کوششیں برابر جاری رہیں یہانتک کہ ۱۹۰۰ء میں سرانطونی میگڈانلڈ کی زیر سماعت ناگری خط یو۔ پی کی عدالتوں میں جاری کر دیا گیا اور اُردو ہندی کی مخالفت کا بیج سرکاری طور سے ڈالدیا گیا جسکا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے علیگڈھ میں جوبلی کے موقع پر مارچ ۱۹۳۷ء میں دوران تقریر میں اس حقیقت پر اسطرح روشنی ڈالی ہے :۔

"جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے دوربینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جسکا تمدن جسکی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اُس کو پھر دو قوموں میں بانٹ دیا۔

علیحدہ کئے جانے کی کوشش شروع کی اور ہندی یا ہندوستانی یا اُردو دو زبانیں بنا کر ایک کیلئے پنڈت اور دوسری کیلئے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کیلئے سامان درست کر دیا۔ ابھی اٹھارھویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتروں سے اردو اور ہندی کے دو طاقتور پتلے فولادی سپاہی بنکر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے ہندو بھائیوں کے دل میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب وہ مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے آزاد ہو چکے ہیں تو ان کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اسکا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اُردو خط تک کو عدالتوں سے خارج کر دیا گیا "

آج جبکہ کانگریس قومی جماعت ہونے کی مدعی ہے کھلم کھلا اُردو کی مخالفت اور ہندی کی تبلیغ کی کوشش جاری ہیں۔ گاندھی جی اور جواہر لال سے لیکر مالویہ جی اور پرمانند تک اُردو کو فنا کرنے میں ہم زبان ہیں۔ کانگریس کی تمام کارروائیاں ہندی میں ہوتی ہیں حالانکہ ملک میں اُردو جاننے والوں کی تعداد ہندی دانوں سے کہیں زیادہ ہے خود پنڈت جواہر لال نہرو ہندی کے مقابلہ پر اردو بہت زیادہ جانتے ہیں بلکہ ان کو ہندی بولنے میں کافی تکلف ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود لکھنؤ کانگریس سشن میں صدارتی تقریر میں وہ قصداً یاد کر کے ہندی الفاظ بول رہے تھے کہ تین چوتھائی آدمی سمجھنے سے قاصر تھے جن کو سن کر

محنت صرف ہو رہی تھی مگر بہر حال یہ ان کی زبان کے ساتھ ایک زبردست خدمت تھی

گاندھی جی کا اس مسئلہ میں عجیب طرز عمل ہے اب وہ صاف طور سے ہندی کی تبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل ہیں اور اردو کو فنا کرنے کا پروگرام انکی زندگی کا اہم جزو ہو رہا ہے کانگریس نے ایک مفصل رسالہ "گاندھی جی اور اردو" کے نام سے عوام کو بہکانے کیلئے نکالا جسمیں یہ ثابت کرنے کی کوشش کیگئی ہے کہ مہاتما جی اردو کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ہندی سے انکا مطلب "اردو اور ہندی" دونوں ہے لیکن اسمیں بھی حقیقت کی ایک جھلک آہی گئی آخر میں تحریر ہے ۔

"ہمیں اسکا اعتراف ہے کہ مہاتما جی نے سیتہ پرشد کے اجلاس میں ہندی رسم الخط کو اردو پر ترجیح دی مگر یہ رسالے لکھنے کا موصوف کو پورا حق ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک اردو اور رومن دونوں خطوں میں دیوناگری خط جیسی صوتی صلاحیت اور جامعیت نہیں ہے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ ۲۴ و ۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء میں جو اجلاس بھارتیہ ساہتیہ پرشد ناگپور میں ہوا اسمیں گاندھی جی نے وہ الفاظ ہندی کی حمایت کرتے ہوئے فرمائے جنکو سنکر صرف افسوس ہوتا ہے اس اجلاس میں بہت سے مسلمان بھی تھے ۔ جنمیں مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری تبلیغ اردو بھی شامل تھے ۔ گاندھی جی یہ ریزولیوشن پاس کرانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کی آئندہ زبان ہندی ہندوستانی ہوگی مولوی صاحب موصوف نے اسکی مخالفت کی اور کہا کہ ہندوستان کی آئندہ زبان ہندوستانی

---

[۱] راقم الحروف خود اس جلسے میں موجود تھا آرتھک دشا (مالی حالت) اور مدھ سغرتی (درمیانی طبقہ) کے الفاظ جن کو ہندو عوام تک نے بھی نہیں سمجھا ، ابتک یاد ہیں ۔

ہونی چاہیئے جسمیں اُردو اور ہندی دونوں شامل رہیں ہندی کا لفظ آجانے سے ہندی مخصوص ہو گی۔ اُسوقت گاندھی جی نے جو الفاظ ارشاد فرمائے اُنکو مولانا کی زبانی سُنئے اُن کا یہ مضمون ہندوستان کے ہر اخبار میں شائع ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

"مہاتما جی نے ایک بات ایسی کہی جس کو سُنکر بہت افسوس ہوا۔ اُنھوں نے کہا کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے" قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اس کو رکھیں اور پھیلائیں"

مہاتما جی جس قسم کی زبان ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں وہ ہندی برائے نام ہے اور اصل میں سنسکرت ہے آپ نے اسی اجلاس میں فرمایا کہ میں وہ ہندی چاہتا ہوں جو رسالہ "ہنس" کی زبان ہے اس زبان کا ایک نمونہ ذیل میں درج ہے یہ اقتباس ہنس کے اُس مضمون سے لیا گیا ہے جو اُس نے حالی مرحوم کی صد سالہ جبلی کے موقع پر قلمبند کیا تھا اسلئے نسبتاً یہ مضمون آسان ہندی میں ہے پھر بھی ملاحظہ کیجئے :-

" سورگیہ مولانا حالی اردو ستہ کے یگ پروَرتکوں میں ہیں اور گت سپتاہ جمستان پانی پت میں ان کی جانتی جس سمروہ سے منائی گئی وہ اُن کی شان کے سروتھا یوگیہ تھی سنبھاپتی کے آسن کو ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال نے سشوبھت کیا تھا اور بھارت کے پرتک بھاگ سے بھگتوں نے آکر شردھانجلی ان کی سمرتی کی بھینٹ کی انہیں نواب بھی تھے۔ ستیہ کے اپاسک بھی تھے

اور شاستر پڑھ سوداہوں نے بھی اپنے پرانت ندی بھیجے تھے۔"

یہ ہے وہ زبان جو گاندھی جی ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں اور جسکے لئے ہر کانگریسی جدوجہد میں مصروف ہے۔ مدراس و بمبئی میں کانگریس حکومتوں نے ہندی زبان کو اپنے اپنے صوبوں میں لازمی قرار دیدیا ہے اور حکومت کے اثرات اور اخراجات سے ہندی کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۹۰ فیصدی ہے اگر اردو کو لازمی زبان قرار دیدیا گیا تو کانگریس کے لیڈروں نے تمام ہندوستان بھر میں شور مچا دیا اور پشاور تک جا کر جلسے کئے برخلاف اسکے اودھ کے بہت سے اضلاع میں مسلمان بچوں کو جہاں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں زبردستی ہندی پڑھائی جا رہی ہے۔ وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند (یوپی) نے ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء کو بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

"نہ صرف ہندی شمالی ہندوستان کے باشندوں کی مادری زبان ہے بلکہ وہ ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اسلئے اُسکو ایسی شکل میں ہونا چاہیئے کہ اُسکو نہ صرف اس صوبہ کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں بلکہ بنگال گجرات اور دکھن کے رہنے والوں کو بھی دقت محسوس نہ ہو۔
اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی جسکو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، اسکو جنوبی ہند کے باشندے آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں تو یہ ضروری ہے کہ انھیں سنسکرت کے کافی الفاظ ہوں .... ہندوستان دنیا کا ایک حصہ ہے اور برہمن جو کہ پیدائشی ہندوستان کے لیڈر ہیں انھیں اپنی پوزیشن کو

محسوس کرتے ہوئے سوسائٹی کی ملت بہتر بتانے میں اور اُس کی از سر نو تنظیم کرنے کی غرض سے آگے آنا چاہیئے" (روزنامہ حق اور اگست ۱۹۴۷ء)

یہ تقریر ٹاؤن ہال میں تمام پبلک میں کی گئی تھی اور مقرر صاحب صوبہ کے وزیر تعلیم ہیں جنکے ساتھ صوبہ کے مسلمان طلبار کی قسمتیں وابستہ ہیں۔

ناظرین گاندھی جی کی تجویز کردہ زبان کا نمونہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ سوامی سمپورنانند کی ہندوستانی زبان کا نمونہ بھی ذیل میں درج ہے جو آنریبل وزیر تعلیم صاحب کی ایک تقریر کا اقتباس ہے جس کو محکمہ اطلاعات یو۔پی نے شائع کیا ہے۔ (بحوالہ نگار ماہ ستمبر ۱۹۴۷ء)

(شکشا۔ سنگھٹن۔ بمت کے سمکش سنیکت پرانت کے شکشا سچیو، مانئے شری سمپورنانند جی کا دیا کھیان (پرکاش وبھاگ) سنیکت پرانتئے گورنمنٹ)۔

"آدھنک کال جیس کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبتا ہے کہ شکشنتر شمیا کے پرت لوگوں اگر شرت ورشدہ اور ویاپک ہو گیا ہے۔ ادھکا نش سے ہے۔ سنسار پر گھٹے ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شیو ویاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا ان بھو کر رہے ہیں۔ آجکل ہم اپنے کو جس مالک اور دھارتک پر شمت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استمت کا جو سابک راج نیک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم سے اپنے پورو جنوں سے جو سنسکرت پائی ہے اُس سے اس شیو ویاپی پرگت کو ہمارے سمکھ لیش سندیہ ایک بشیس روپ میں ابھشت کیا ہے اور ایک شیش لبھارے سمتبہ

بتا دیا ہے۔"

اسمبلیوں اور دوسری مجالس آئین ساز میں جدید ہندی کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے عام فہم اُردو الفاظ کا مشکل ہندی زبان میں ترجمہ کرکے بولا جاتا ہے۔ مدینہ (اخبار) مشتہرہ کے توسط سے چند ایسے الفاظ ذیل میں درج ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رُخ کس طرف جا رہا ہے۔

مدعی = جھگڑا اپیلیسرڈر۔	مدعا علیہ = جھگڑا ادوجے۔
ممالک متحدہ = جبڑے پرانت۔	ممالک متوسط = پرانت کوشل۔
مقدمہ = ٹنٹا۔	مسل = پوتھی۔
صدر = سبھاپتی۔	نائب صدر = ابردھان۔
سکریٹری = پردھان۔	رہنما = اگوا۔

کانگریس کے اجلاسوں میں ہندی نوازی کا ثبوت اس حد تک پایا جاتا ہے کہ تمام (اعلانات) اشتہارات وغیرہ ہندی میں دیے جاتے ہیں۔

مدینہ (جو ایک پکا کانگریسی اخبار ہے) کے ایڈیٹر نے ہری پورہ کانگریس کے واقعات بچشم خود دیکھ کر مدینہ میں قلمبند فرمائے تھے۔ ان میں سے ہندی کے متعلق ایک ضروری اقتباس مسلمانوں کی عبرت کیلئے مندرجہ ذیل ہے:۔

"وطن نگر میں جو تحریر بھی چاروں طرف نظر پڑتی تھی وہ یا تو ہندی میں ہوتی تھی یا گجراتی میں۔ اُردو رسم الخط اس فضا میں اسطرح مفقود تھا گویا ہندستان میں اسکے جاننے والے بستے ہی نہیں اور دو ایک جگہ جہاں اسکے استعمال کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی وہاں زبان و املا کی مضحکہ خیز غلطیوں مد

اندازِ تحریر کے بھونڈے پن سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی غیر زبان کو بادلِ ناخواستہ لکھا جا رہا ہے بالکل اسی طرح جیسے جرمنی وغیرہ کے بعض اشتہارات پر اردو زبان لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وزیٹروں کیلئے جو کٹیاں بنائی گئی تھیں اُنپر سلسلے کے نمبر بھی ہندی میں تھے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ کوفت اسوقت ہوئی جب نمائش گاہ میں داخل ہونے پر میں نے دیکھا کہ ہر چیز پر جو چٹ چسپاں ہے وہ صرف ہندی میں ہے اسکے یہ معنی تھے کہ ہندی سے ناواقف شخص کیلئے ساری نمائش[1] گاہ بالکل بے معنی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ہندی کے ساتھ بیاں اتنی پائی جاتی تھی کہ سارے وشال نگر میں "ہندوستان" کے علاوہ اور کوئی اردو اخبار دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ اردو کتابیں بھی مشکل سے چار یا پانچ ہونگی۔

اس اجلاس میں ایک عجیب چیز یہ تھی کہ اُردو کا نام بھی ہندی رکھا گیا تھا۔ جلسوں میں بعض تجویزوں کے ترجمے اچھے خاصے اُردو میں ہوتے تھے مگر ان کو ہندی ترجمہ کہا جاتا تھا۔ ایک بار مجھ سے ایک رضاکار نے پوچھا "آپکی کٹیا کا نمبر کیا ہے" میں نے کہا چونکہ نمبر ہندی میں ہے اور ہندی میں نہیں جانتا اسلئے نہیں بتلا سکتا" اس جواب پر یہ رضاکار ہنسکر کہنے لگا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ہندی تو آپ بول رہے ہیں اور پھر کہتے ہیں ہندی نہیں جانتا"

اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا

---

[1] جہاں کی اصطلاح میں رضاکار "سویم سوک" کہلاتے تھے، کانگریس کا نام "راشٹریہ مہا سبھا" تھا سالانہ کھلے اجلاس کو "کھلی بیٹھک" کہا جاتا تھا، ڈیلیگیٹ "پرتی ندہی" کہلاتے تھے۔

کانگریس کے اس دعوے پر شک کرنے کا مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ ہندی اور اُردو دونوں ایک ہی زبانیں ہیں صرف رسم الخط کا فرق ہے لیکن جب اسکے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے سوبھاش چندر بوس نے اپنا خطبہ ہندی میں پڑھا تو مجھے پہلی بار اپنے اس خیال کی غلطی کا احساس ہوا اسلئے کہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی میری فہم نارسا اسکے سمجھنے سے قاصر رہی۔ بعد ازاں پرشوتم داس ٹنڈن کی تقریر نے اس احساس کو قوی تر بنا دیا۔ آپ قومی تعلیم کی تجویز کے محرک تھے لیکن قومی تعلیم کی بجائے "راشٹریہ شکشا" کا لفظ استعمال فرما رہے تھے۔ آپ نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی لیکن تقریر کے بہت کم اجزا میری سمجھ میں آ سکے۔

آخر میں اُس زبان کے دو ایک جملے نقل کرتا ہوں جو اس اجلاس میں تقریر کرنے والے عمومیت کے ساتھ استعمال کر رہے تھے اور دو چار مقرروں کے علاوہ باقی سب اس زبان کو پسند فرما رہے تھے۔ "سبھاپتی مہاشے! دیویو اور سجنو، آپ کے سامنے جو پرستاؤ رکھا ہے اور جس کے سمرتھن اور وردودھ میں ہماری دھرمی مان اور ودوان نیتاؤں کے واکھیان آپ نے سُنے ہیں اُس کے سمبندھ میں ایک سنشودھن پر کمنٹ کرنا چاہتا ہوں ہمارے راج نیتک اور آرتھک کاری کرم کے وجہ میں یہ سنشودھن آوشک ہے آگے آپ ادھیکاری ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے مول پرستاؤ کو مانیں یا بھارت سوتنترتا کیلئے جو سدھانت آپ نے بنائے ہیں ان کو ..."

بدقسمتی یہ ہے کہ جبکہ ان معاملات میں ہندو قوم کا ہر فرد بشر خواہ وہ کانگریسی ہو

یا مہا سبھائی یا امن سبھائی، ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور ہمنوا ہے۔

مسلمانوں میں زبان جیسے اہم معاملہ میں بھی یکجہتی نہیں حالانکہ قوم کے تمدن اور تہذیب کا دارومدار زبان ہی پر ہے۔ مسلمان ان تمام حرکتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں بلکہ ان کی تائید میں مصروف ہیں۔

مسلمانوں کو اسی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کمیونل اوارڈ اور کانگریس کا طرز عمل

کمیونل اوارڈ میں مسلم حقوق کی حمایت

کمیونل اوارڈ اس فرقہ وارانہ تقسیم کا نام ہے۔ جس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم اقوام کی علٰحدہ علٰحدہ نشستیں مختلف صوبوں میں مقرر کر دی گئی ہیں۔ گول میز کانفرنس میں کانگریس کے ہندو لیڈروں کی تنگ نظری کی

بنا پر ہندو مسلمان کوئی فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہیں کر سکے تھے جیسا کہ ناظرین ملاحظہ کر چکے ہیں۔ گاندھی جی نے تو کیسر فرقہ وارانہ مسئلہ کے وجود ہی سے صاف انکار کر دیا تھا کہ "ہندوستان میں فرقہ وارانہ سوال کا وجود ہی نہیں ہے" جس پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے جواب دیا تھا کہ "ہمت کے ساتھ حقائق کا سامنا کیجئے فرقہ وارانہ مسئلہ ایک مسلمہ حقیقت ہے" گاندھی جی بعد میں مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخاب پر راضی ہوئے مگر ایک خود غرض شرط کے ساتھ کہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ نہ کیا جائے اور ان کو جداگانہ حق انتخاب نہ دیا جائے مگر انھوں نے اسکو تسلیم کرنے میں اپنی خود غرضی سمجھی۔ پھر سر علی امام مرحوم نے جب گاندھی جی سے سوال کیا کہ کیا آپ مسلمانوں کا مطالبہ کانگریس کی طرف سے منظور کرتے ہیں یا ذاتی حیثیت سے تو گاندھی جی نے جواب دیا "میں ذمہ دار نہیں ہوں کہ کانگریس اسکو تسلیم کرلے گی میں کوشش کرونگا۔"

پھر خود مہاتما گاندھی کے خط اور دوسرے گیارہ لیڈروں کی درخواست پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو ثالث مقرر کیا گیا کہ وہ اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کردیں مسلمان اس درخواست کے بالکل ساتھ نہ تھے اور ان کی یہی کوشش تھی کہ اگر آپس ہی کوئی فیصلہ ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کو ان کے مطالبہ کے مطابق ہندوؤں کی خواہش سے کچھ زیادہ سیٹیں مل گئیں۔ مثلاً یو۔پی میں مسلمان چودہ فیصدی تھے مگر اس کی رو سے ان کو ۳۰ فیصدی نشستیں مل گئیں۔ اگرچہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم دیگئیں صرف اس لئے کہ مسلمانوں کو چند صوبوں میں کچھ زیادہ

حصہ مل گیا۔ ہندوستان کے ہر خیال کے ہندو نے خواہ وہ مہا سبھائی ہو یا کانگریسی اس تقسیم کی سخت مخالفت کی۔ وہ ہرگز گوارا نہ کر سکے کہ مسلمانوں کو ذرا بھی انکی خواہش سے زائد مل جائے۔ ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے اور آزادی کو قریب تر لانے کیلئے بغیر کسی ثالث کے ہی وہ خود مسلمانوں کے مطالبے کو اور زیادہ منظور کر لیتے لیکن انکے نزدیک تمام جنگ ہندؤں کے حقوق کی ہے وہ اسکو گوارا کر سکتے ہیں کہ وہ سیٹیں یوروپین کو ملجائیں مگر مسلمانوں کو زیادہ نہ ملے۔ کانگریس کا طرز عمل تو صاف یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس ایوارڈ کو فوراً منظور کر لیتی تاکہ مسلمانوں کو کوئی شکایت باقی نہ رہتی مگر اس نے ہندوؤں کو ناراض نہ کرنے کیلئے اس کو نہ منظور کیا نہ مسترد۔ مسترد اسلیئے نہیں کیا کہ مسلمانوں کی تسلی کم از کم اسی طرح رہے مگر یہ بات بھی برادران وطن کو کب بھانے والی تھی انھوں نے تمام قوت اسکی مخالفت میں صرف کردی، مالویہ جی نے اپنی پارٹی بھی ایک بنا لی انھوں نے کانگریس کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ بنگال میں سرت چندربوس کی سرکردگی میں اور پنجاب میں ڈاکٹر سیتہ پال اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی رہنمائی میں لاکھوں ہندوؤں کے دستخط کرا کر وزیر ہند کے پاس میموریل روانہ کئے گئے۔ کہ ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ جب الیکشن کا زمانہ آیا تو کانگریس نے اپنا طرز عمل بدل دیا جبتک تو غیر جانبدار تھی مگر اب اس نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ بھی اس اعلان تقسیم کو بالکل ناپسند کرتی ہے لہذا الیکشن مینی فسٹو میں صاف صاف مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلان کیا:۔

"کمی طور پر دستور سے قطع نظر کیمونل ایوارڈ قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اسکو

منظور کیا جائے۔ کانگریس کی روش لا پرواہی اور غیر جانبداری کی نہیں ہے وہ شدت سے فرقہ وارانہ فیصلے کو نا منظور کرتی ہے اور اسکو ختم کر دینا چاہتی ہے۔"

کمیونل اوارڈ کو بیکار بنانے کیلئے آخری حربہ مسلم ماس کنٹکٹ کی تحریک تھی جسمیں کانگریس کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کمیونل اوارڈ اور اچھوت ادھار

اچھوت ہندوستان کے ان قدیم باشندوں کو کہا جاتا ہے جسکو ایرانی وغیرہ سے آئی ہوئی قوموں نے فتح کر کے مغلوب کر لیا تھا اور انکو غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چار ہزار سال سے اونچی ذات کے ہندوؤں نے ان آدنواسیوں پر جو مظالم کئے ہیں اسکی تاریخ دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابتک اچھوتوں کو غلاموں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن ہمیں یہاں عام ہندوؤں کے اعتقادات اور طرز عمل پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ کانگریس کی اس پالیسی پر غور کرنا ہے جو کچھ زمانہ سے اچھوتوں کے ساتھ برتی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں ان اچھوتوں کی تعداد جنکا ہندوؤں کی اونچی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے آٹھ اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آ کر جب اچھوتوں نے اپنی سیاسی علٰحدگی کا مطالبہ کیا تو ہندوؤں نے اُن کی علٰحدہ حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ لیکن سائمن کمیشن اور دوسری گول میز کانفرنس میں اچھوتوں کی علٰحدہ سیاسی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ اچھوتوں کی علٰحدہ پوزیشن قائم ہو جانا ہندو اکثریت پر ایک ضرب کاری ہے، اسلئے کہ

اگر اچھوت اور مسلمان اور دوسری اقلیتیں یعنے سکھ، عیسائی اور پارسی وغیرہ باہمی مفاہمت کرلیں تو ہندوستان کے کسی حصے میں ہندوؤں کی اکثریت باقی نہیں رہتی صوبہ یو۔ پی تک میں اچھوتوں کو علٰحدہ کرکے ہندوؤں کی اکثریت نہیں رہتی۔ موجودہ صورت میں ہندوؤں کو بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ تمام غیر مسلم اقوام کی آبادی کی نمائندگی خود کرتے ہیں اور ان کو کوئی حق نہیں دیتے۔ لیکن اگر آدی واسیوں کی علٰحدہ حیثیت تسلیم کرلی جائے اور ان کو جداگانہ انتخاب کا حق مل جائے تو ہندو اکثریت کا ڈھونگ فوراً ختم ہوجاتا ہے۔ اسی لئے گاندھی جی کی زندگی کا سب سے بڑا جزو اچھوتوں کو ہندو اکثریت میں جذب رکھنا ہے۔ گول میز کانفرنس میں وہ مسلمانوں سے صرف اس شرط کے ساتھ صلح کرنے پر تیار تھے کہ مسلمان اچھوتوں کا ساتھ ان کے علٰحدہ وجود کے تسلیم کرانے میں نہ دیں لیکن مسٹر جناح کی دور بین نظروں نے اسکو گوارا نہ کیا اور آخرکار ان کا سیاسی وجود علٰحدہ تسلیم کرلیا گیا۔ اسکو گاندھی جی کب برداشت کرسکتے تھے؟ وہ گول میز کانفرنس میں ہی اعلان کرچکے تھے کہ اگر اچھوتوں کی علٰحدہ جماعت تسلیم کرلی گئی تو وہ اپنی جان تک تیاگ دینگے۔ لھذا جب کمیونل اوارڈ میں اچھوتوں کی علٰحدہ جماعت کا اعلان کیا گیا اور ہندو اکثریت کے بٹ جانے کا وقت آیا تو گاندھی جی نے "اپنی پران تیاگنے" کا اعلان یروداجیل میں فرمادیا اور برت رکھ لیا جس سے تمام ہندوؤں میں ھلچل مچگئی اور اچھوتوں کو سبز باغ دکھاکر پونہ میں اُن سے معاہدہ لےلیا جسمیں اُنھوں نے اپنے جداگانہ حیثیت کے مطالبے کو واپس لیلیا اور خود کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈالدیا۔ لیکن پونہ پیکٹ حاصل ہوجانیکے

بعد ان کے ساتھ حسب دستور وہی طرزِ عمل جاری رہا۔ گاندھی جی کے برت سے ہندو قوم کے انتشار کو ضرور دور کر دیا لیکن اچھوتوں کے مظلوم طبقے کی پستی میں کوئی فرق نہیں آیا نہ برہمن کا طلسمِ قدیم ٹوٹ سکا۔ سہ

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (اقبالؒ)

گاندھی جی نے ایک سال تک اچھوت ادھار کا کام ضرور کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ کر ہندو دھرم کی سیوا میں مصروف ہو گئے۔ گذشتہ ستمبر میں جب سی۔ پی کے اچھوتوں نے گاندھی جی کو ان کے وعدے یاد دلائے اور بھوک ہڑتال کے ذریعہ ستیاگرہ کی تو گاندھی جی نے صاف جواب دیدیا کہ "اپنی ضرورت کیلئے دوسروں کی زندگی تنگ مت کرو"۔ اور توقع ہی کیا ہو سکتی تھی؟

انتخابات کے بعد مسلم صوبوں میں اچھوتوں کو وزارتیں اور پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدے دیے گئے لیکن کانگریس کے کسی صوبے میں کسی اچھوت کو کوئی بڑا عہدہ نہیں دیا گیا۔

سوامی کلھبگانند مشن لکھنؤ کی طرف سے "رام راج" کے عنوان سے ایک سرکلر نمبر ۴۴ شائع ہوا ہے جسمیں کانگریس کے طرزِ عمل پر بحث کیگئی ہے۔ اُس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کانگریس کی پالیسی کا کچھ پتہ چلتا ہے :-

"آج صوبہ واری حکومتیں جہاں جہاں مسلمان وزیر اعظم ہیں وہاں تو آدھی قوم کے وزیر بنائے جاتے ہیں اور ہر ایک محکمہ میں تعداد کے مطابق نوکریاں

اور وعدے بھی کئے جاتے ہیں لیکن جہاں جہاں برہمن وزیر اعظم ہیں انکے راج میں نوکریاں اور عہدے نہیں دیئے جاتے ہیں۔ وزیر بنانے کیلئے گاندھی جی ٹھکرا دیتے ہیں اور جب "پونا ایکٹ" بنایا تھا گاندھی جی کی جان بچانے کیلئے تو ہر قسم کے حقوق دینے کیلئے آریہ ہندوؤں کے تمام لیڈر بڑے بڑے وعدے کرتے تھے اور اب کانگریس کو راج ملا تو سب وعدے بھول گئے ۔۔ ۔

جس آٹھ کروڑ آدنواسی قوم کو پونا پیکٹ میں آریہ ہندوؤں سے یہ کہکر اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا کہ روٹی بیٹی میں شریک کرتے ہوئے سب طرح کے حقوق دینگے۔ لیکن ان سات صوبوں میں سے کم سے کم دو صوبے جہاں کہ آدنواسی اچھوت وکیل، بیرسٹر تک کافی ہیں یعنی ممبئی اور سی پی میں بجائے وزیر اعظم بنانے کے معمولی وزیر تک ایک بھی نہیں بنایا گیا۔ اور کیوں بنائیں جبکہ ویدوں میں صاف صاف آریوں کو یہ پرارتھنا کرنا سکھایا گیا ہے کہ آدنواسی اچھوت (اناریہ۔ دسیو۔ درس) تباہ و برباد ہو جائیں۔ اور یا ان کو اے ایشور اتنا کمزور کر دے کہ آریوں کی حکومت ہو جائے اور یا ان کو جان سے مار ڈال کیونکہ یہ آریوں کے دشمن ہیں"

مسٹر جگناتھ پرشاد (کلکتہ) وکیل اپنے ایک لیکچر "کلجگ پر ان" میں کانگریس کے اسی طرز عمل کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"بہت سے راجہ مہاراج جو پہلے برہمن و راجپوت تھے اور اب مسلمان ہیں ان کی ریاستوں میں وہ مظالم نہیں ہوتے جو کہ ہندوؤں کی ریاستوں میں ہوتے ہیں مثلاً اپنے مُردے کو چت لٹا کر دفن نہیں کر سکتے بلکہ کنواں ایسی زمین کھود کر سر نیچے اور پیر اوپر کرکے زمین میں گاڑ کر ایک بڑی

لگا ہوتی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ کسی شدر یا اچھوت کی قبر ہے۔ رنگین کپڑے نہیں پہن سکتے۔ خود یو۔ پی کی کانگریسی حکومت کے وزیراعظم نے بھی یہ اقرار کیا ہے کہ آدی واسی اچھوت اس صوبہ میں بھی گھی کی پوری شادی بیاہ کے وقت نہیں بنا سکتے۔ اپنے دولھا کو پالکی یا گھوڑے پر نہیں بٹھا سکتے یہ اُن مقامات کا حال ہے جہاں ہندوؤں کو آدھا سوراج ملا ہے۔

آج صوبہ یو۔ پی کی کانگریسی حکومت میں خود پارلیمنٹری سکریٹری بہاری لال جی کا بیان ہے کہ بجنور ضلع میں برہمنوں نے کنوؤں سے پانی دینا بند کر دیا ہے۔ اچھوتوں کے بچے پیاسے مر رہے ہیں۔ نوجوان اچھوت عورتوں کی زبردستی عزت خراب کی جا رہی ہے۔ اچھوتوں کے جھونپڑوں میں آگ لگا دی گئی ہے۔ برہمنوں کو یہ غرور ہو گیا ہے کہ ہمارا راج ہو گیا ہے۔

ابھی حال ہی میں کھتری خاندان کے مسٹر کے۔ ایل گابا[1] جوہ ہور شہر سے اسمبلی کے ممبر ہوئے ہیں۔ آپ کا خرچ الیکشن میں پونے پانچ آنے ہوئے جس پر ایک مسلمان نے پبلک جلسہ میں رو کر کہا کہ میں گنہگار ہونگا۔ آپ مجھ سے یہ پیسے لیں! کیا وجہ ہے کہ اچھوت و کچھوت مسلمان ہو کر تو گورنر بن سکتے ہیں۔ آج بھی اور جب مسلمانوں کی حکومت تھی تو شدر کہلانے والے غلام خاندان نے ڈیڑھ سو سال تک بادشاہت بھی کی۔ لیکن سر پر چوٹی رکھتے ہوئے اور کرشن و رام کا نام لینے کی سزا یہ ہے کہ آریہ ہندو لائق و قابل آدی واسی اچھوت لیڈروں کو نہ وزیر بنانے کیلئے تیار ہوں نہ ممبر اسمبلی۔ جب مصیبت آتی ہے تو اچھوتوں کو بھائی بنا کر انگریزوں اور مسلمانوں سے

---

[1] یہ پنجاب کے مشہور نومسلم ہیں۔

لڑایا جاتا ہے اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو پھر ٹھکرا دیا جاتا ہے "
یہ ہے ہندوستان کی آٹھ کروڑ آبادی کی حالت۔
اگر کبھی مسلمانوں نے ان کی حالت بہتر بنانے کی فکر شروع کی تو ہندوؤں میں آگ لگ گئی۔ ان کو فوراً خطرہ ہوا کہ کہیں یہ مسلمان نہو جائیں۔ ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی بعض انجمنوں نے ان کی اصلاح کی کوشش شروع کی تو گاندھی کو فوراً ڈر ہوا کہ کہیں اس تبلیغ سے وہ اسلام قبول نہ کر بیٹھیں۔
۳۰ر دسمبر ۱۹۴۰ء کا ملاپ صفحہ ۷ کا مندرجہ ذیل بیان اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے:۔

"مہاتما جی کو یہ سنکر (کہ مسلمان اچھوتوں میں کام کر رہے ہیں) بڑا دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ مجھے تو اسکا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جو اب تک خاموش تھے۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہئے تھی۔ اچھوت ادھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے"

مہاتما جی کی فرقہ دارانہ تنگ ذہنیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ آدی واسیوں کا اگر اس ملک کی سیاست میں کوئی مستقبل ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ وہ جدوجہد کر کے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کو دوسرے ہندوؤں سے علٰحدہ تسلیم کرائیں اور اپنی جماعتی تنظیم شروع کر دیں بالخصوص مسلمانوں سے سیاسی اشتراک عمل کریں۔ اُسکے بعد اس ملک میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی آسانی سے طے ہو جائے گا اور اچھوتوں کی حالت بھی بہتر ہو جائیگی۔

مسلم لیگ کی اہمیت

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ — ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اور بالخصوص ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک صدی تک مسلمانان ہند جسطرح انگریزوں اور ہندوؤں کے مظالم کے شکار رہے اور جسطرح قوم پرور مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو قائم رکھنے کیلئے سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تھی اُسکا ایک ہلکا سا خاکہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اُس وقت سے لیکر اب تک مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت رہی۔ ہندوستان کے ہر مسلم پولٹیکل لیڈر نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم ہی سے اسلامی سیاست میں حصہ لیا۔ مولانا محمد علی مرحوم اس کے یوم بنیاد سے آخر وقت تک مسلم لیگ کی خدمت میں مصروف رہے۔ میر محفوظ علی صاحب کے الفاظ ہیں:۔

"اس موقع پر باوجودیکہ اسلامی ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد وضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی نے کیا" (سیرت محمد علی صفحہ ۲۲۴)

سیرت محمد علی کے مصنف کے مندرجہ ذیل الفاظ سے مولانا محمد علی مرحوم کی مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری بشرط استواری کا پورا پتہ چلتا ہے:۔

"لیکن محمد علی کی کوششیں ابھی نہیں ختم ہوئیں۔ انھوں نے بارہا اسکی

ایک نئی زندگی پیدا کرنی چاہی اور وہ اس سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔ نہ تحریک خلافت کے ہنگامہ زار زمانے میں اور نہ تحریک کی افسردگی کے مضمحل کن عہد میں، وہ ہمیشہ اسمیں (مسلم لیگ میں) شریک ہوئے اور اس کی بلند سے بلند تر سطح نظر تک رہنمائی فرماتے رہے۔"

مولانا محمد علی مرحوم کا معمولی سا اختلاف مسلم لیگ سے ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے معاملہ میں ہوا تھا جبکہ مسلم لیگ کانگریس کی ہمنوا تھی اور مولانا کانگریس کے طرز عمل کے سخت مخالف لیکن بعد میں مسلم لیگ اور مولانا بہت جلد ہمنوا ہو کر کانگریس کی مخالفت پر مجبور ہو گئے تھے۔

مسلم لیگ کے ابتدائی زمانہ قیام میں ہی ہندوستان کا ہر مسلمان اسکی ترقی کی سعی میں لگا ہوا تھا اور مسلم جماعت کے علیحدہ نظام کی کوشش میں مصروف تھا۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جو آج فرقہ وارانہ نظام کے سخت مخالف ہیں مسلم لیگ کے کام کیلئے ابتدائی زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں:-

"خدا نے آپکے اندر ایک کامیاب اخبار نویس سے زیادہ طاقتیں رکھی ہیں۔ ظلم ہے اگر آپ اپنی طاقتوں سے کام نہ لیں، میری تجویز تو یہ ہے کہ لوگ آپ کو جبراً پریزیڈنٹ بنالیں، اور میں اس کو پوری تفصیل سے لکھنے والا ہوں مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کی تشکیل کیلئے آپ کی غیبت میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں۔" (سیرت محمد علی صفحہ ۲۴)

۱۹۱۸ء میں آپ نے لیگ کی صدارت فرمائی۔ مولانا محمد علی کے ساتھ ساتھ ہی علامہ اقبال اور دوسرے قوم پرور رہنماؤں نے ہمیشہ مسلم لیگ کے ارتقا میں کوشش کی

ہندوستان میں شاید کوئی قوم پرور مسلمان لیڈر ہو جس نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آکر مسلم سیاست میں حصہ نہ لیا ہو۔

جبکہ کانگریس اپنی پیدائش سے ۲۵ سال تک (۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۰ء تک) حکومت کی وفاداری کے رزولیوشن پاس کرتی رہی اور حدود اعتدال سے ایک قدم آگے نہ بڑھی، مسلم لیگ اپنی پیدائش کے پانچ سال کے اندر ہی مسلمانوں کی ایک اہم سیاسی جماعت ثابت ہو گئی بالخصوص تنسیخ تقسیم بنگال کے اعلان کے بعد تو برابر حکومت سے تصادم رہا۔ ہندو مسلم مفاہمت میں مسلم لیگ نے ابتدا ہی سے رواداری اور فراخ حوصلگی سے کام کیا۔ ۱۹۱۰ء سے برابر ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کی جدوجہد کی گئی اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ کو نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

یہ غلط ہے کہ مسلم لیگ کی تمام کوششیں فرقہ وارانہ سیاست ہی میں محدود رہیں اور اُس نے صرف مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت میں آواز بلند کی بلکہ مسلم لیگ نے عام ملکی مفاد میں بھی اتنا ہی حصہ لیا جتنا کانگریس نے۔

۱۹۱۰ء سے برابر ہندوستان کے مجموعی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے تجاویز پاس کی گئیں۔ مثلاً پریوی کونسل میں ہندوستانیوں کا تقرر، ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کی بہتری، انتظامی اور عدالتی (جوڈیشل) کاموں کی علٰحدگی، سول سروس، نٹال اور جنوبی افریقہ کے متعلق، دوامی بندوبست، پنجاب چیف کورٹ، ہندوستانیوں کیلئے فوج میں بڑے بڑے عہدوں کا مطالبہ، کونسل سکریٹری آف اسٹیٹ، اسکیم اصلاحات ما نٹفورڈ، قانون اسلحہ، قانون مطابع، اور قانون حفاظت ہند کی غیر مقبولیت، حکومت خود اختیاری کا مطالبہ، سیاسی قیدیوں کی رہائی، سائمن کمیشن کا

بائیکاٹ، مظالم پنجاب کے خلاف احتجاج وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ ہندوستان کی سیاست میں مسلم لیگ کو برابر وہی اہمیت حاصل رہی جو کانگریس کو، اور اسلامی سیاست میں وہ ہمیشہ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت رہی۔ حصہ اول میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جبکہ کانگریس برطانیہ کی مکمل طور سے حلیف ہوتی تھی مسلم لیگ سخت خطرناک جماعت سمجھی جاتی تھی۔ دو مرتبہ مسلم لیگ کے خطبات صدارت ضبط کیے گئے اور بارہا لیگ کے لیڈروں کو جیل جانا پڑا۔ یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اپنی سیاسی غلطیوں کی بنا پر ہم نے اتنی قربانیوں اور ایثار کے باوجود اپنی جماعت کو کمزور بنا دیا تھا۔ جو ۱۹۳۶ء تک برابر کمزور حالت میں رہی۔

مسلم لیگ نے سب سے بڑی خدمت جو مسلمانوں کی انجام دی وہ مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخاب کا حصول ہے جس کی رو سے مسلمانوں کو قانون ساز اداروں میں خود اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس حق کے حاصل کرنے کیلئے مسلم لیگ نے بیحد جدوجہد کی اور حقیقت یہ ہے جتنی محنت اور توجہ مسلمانوں نے اس واحد ادارے کے استحکام میں صرف کی وہ اس حق کے حاصل ہو جانے پر کہیں زیادہ وصول ہو چکی۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جو کچھ بھی سیاسی پوزیشن ہے وہ اسی حق جداگانہ انتخاب کی بدولت ہے ورنہ ملکی سیاست میں ان کا اب تک وہی حشر ہو گیا ہوتا جو آج دس کروڑ اچھوتوں اور دوسری نیچی ذات کے ہندوؤں کا ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء تک مخلوط انتخاب جاری رہا۔ سنہ ۱۸۶۱ء اور سنہ ۱۸۹۱ء ایکٹ کی رو سے جو حقوق ہندوستانیوں کو ملے تھے۔ اُنمیں مسلمانوں کا علیحدہ کوئی حصہ نہ تھا جسکا

نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ان حقوق سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کی نمائندگی حکومت کے کسی حصہ میں بھی نہ ہو سکی۔ ۱۸۹۶ء میں سب سے پہلے آنریبل سید محمود نے ایم اے او ڈیفنس ایسوسی ایشن کیلئے ایک یادداشت تیار کی جس میں نہایت مدلل طریقہ سے انھوں نے ثابت کیا تھا کہ جبتک مسلمانوں کو خود اپنے نمائندے چننے کا اختیار نہ ہوگا۔ اسوقت تک کونسلوں میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ۱۹۰۵ء کے مشہور ڈیپوٹیشن کی عرضداشت میں بھی یہی مطالبہ سب سے بڑا تھا۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد ۱۹۰۶ء سے برابر لیگ کے پلیٹ فارم سے اس حق کا مطالبہ زور شور سے کیا گیا۔ نواب وقار الملک صاحب مرحوم نے بالخصوص بہت جانفشانی سے کوشش کی۔ ۱۹۰۸ء میں آپ نے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا[1]

"اس پالیسی (مشترکہ انتخاب) سے گورمنٹ کو ایک فائدہ تو یہ ہو گیا ہے کہ ہندوؤں کا کثیر گروہ جو گورنمنٹ سے شکایت کرتا تھا کہ مسلمانوں کی مردم شماری سے جو کچھ زیادہ ان کی سیاسی عظمت کے لحاظ سے دینا تجویز کیا گیا تھا وہ ان کے نزدیک خلاف انصاف ہے، اب اس شکایت کے جواب میں بجائے اسکے کہ نہایت مضبوط اور صاف آواز سے کہدیا جاتا کہ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ واقعات اور واجبات پر مبنی ہے اب ان شکایت کرنے والوں کو یہ کہکر مطمئن اور ساکت کر دیا جائیگا کہ مسلمانوں کا وہ زائد حصہ اب تمہاری ہی مجارٹی کے اختیار میں ہے۔ ان کو دو یا نہ دو، تم جانو، تمہارا کام"

ہندوؤں کی بہت بڑی جماعت نے حکومت کے ساتھ ملکر اس کی سخت مخالفت کی

---

[1] انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ از محمد امین زبیری صفحہ ۲۲۔

وزیر ہند لارڈ مارلے نے ۲۷ نومبر ۱۹۰۸ء کو جو ڈسپیچ حکومت ہند کے پاس ارسال کیا اسمیں مسلم نمائندگی کے اصول کو تسلیم کر لینے کے باوجود مخلوط انتخاب کی سفارش کی تھی۔ لندن مسلم لیگ نے رائٹ آنریبل امیر علی کی صدارت میں ایک وفد وزیر ہند کی خدمت میں بھیجا جس نے مخلوط انتخاب کے خلاف کافی احتجاج کیا ان کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو نائب وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ :-

"ایسے لوگوں نے جو ہماری طرف سے کچھ کہنے کا اختیار رکھتے ہیں مسلمانوں سے پختہ وعدے کئے ہیں کہ انھیں اسی قدر اور اسی قسم کی نیابت دیجائیگی جو ان کی خواہش کے مطابق ہوگی۔ ہم اس وعدے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے"

مسٹر اسکوئتھ وزیر اعظم نے انڈیا بل کی دوسری خواندگی کے موقع پر انتخاب جداگانہ کو تسلیم کر لیا۔

اس معاملہ میں مسلم لیگ نے ہندوؤں سے بھی مفاہمت کرنے کی بہت کوشش کی بالخصوص جب مانٹیگو کی اصلاحات کا اعلان ۱۹۱۷ء میں ہوا تو مسلم لیگ نے کانگریس سے سمجھوتے کی انتھک کوشش کی اور آخر کار ۱۹۱۶ء میں باہمی معاہدہ ہوگیا جسمیں مسلمانوں کے جداگانہ حق نمائندگی کو تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدے سے گورنمنٹ کو کچھ افسوس ضرور ہوا اسلئے کہ اسکی منشا نہ تھی کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ قائم رکھا جائے۔ اور اس معاہدہ کی منظوری گورنر جنرل اور وزیر ہند نے بہت بادل ناخواستہ دی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ (۱۹۱۸ء) میں انتخاب جداگانہ کو قائم رکھتے ہوئے یہ الفاظ حکومت کی دلی منشا ظاہر کر رہے ہیں :-

"اسکے ساتھ حالات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو ۱۹۰۹ء میں مخصوص نیابت اور حق انتخاب جداگانہ دیا گیا تھا۔ دونوں فرقوں کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے اسمیں ہندوؤں کی رضامندی شامل ہے۔ اسلئے مسلمان ان دونوں چیزوں کو امور فیصل شدہ قرار دیتے ہیں اور ان کو بدلنے کی کوشش بھی کی گئی تو اُسکے ساتھ نہایت سختی سے احتجاج کیا جائے گا۔"

بالآخر مسلم لیگ کی کوششوں سے یہ مطالبہ پھر منظور ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت میں حکومت کے اس طرزِ عمل پر جو اس نے جداگانہ حق انتخاب کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ اختیار کیا! مندرجہ ذیل الفاظ میں نکتہ چینی کی:۔

"گورنمنٹ کے نام نہاد زاویۂ نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اسکی مزید شہادت اس امر سے حاصل ہوتی ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف انکے اس خاص حق کی مخالفت کی ہے جو زمانہ موجودہ میں ہماری سیاسیات کی روح رواں ہے۔ ان قیمتی وعدوں پر جو گورنمنٹ کر چکی ہے اور اس سمجھوتے پر جو ہمارے اور اہل ہنود کے درمیان ہو چکا ہے، اور خود اپنے قومی مفاد پر نظر کرتے ہوئے ہم حکومت کو اپنے وعدوں سے روگرداں ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ علاوہ بریں مسلمانان ہند کے نمائندوں کا امپیریل کانفرنس اور مجلس جنگ کے مباحث میں شریک نہ کیا جانا مسلمانوں کے اس احساس میں اضافہ کرتا ہے کہ اسکے ساتھ لاپروائی برتی جا رہی ہے۔"

اسکے بعد ۱۹۲۷ء میں اصلاحات کے سلسلے میں جب حکومت نے سر الیگزنڈر ریڈی کی صدارت میں ایک کمیٹی بٹھائی جس کے ارکان میں میاں سر شفیع مرحوم اور مسٹر محمد علی جناح بھی تھے تو انھیں دونوں حضرات کی کوششوں سے اس کمیٹی نے بھی جداگانہ انتخاب کی سفارش کی اسکے بعد سائمن کمیشن کے سامنے جتنی شہادتیں اور سفارشیں پیش ہوئیں سب میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کی حمایت کی گئی ۔

لیکن سائمن کمیشن کے آنیسے پیشتر ہی سے ہندوؤں کی ذہنیت بالکل بدل چکی تھی۔ اب وہ جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے تھے اور مخلوط انتخاب پر برابر مصر تھے جو نہرو رپورٹ میں بطور آئیڈیل شامل کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ نے ہر امکانی مفاہمت کی بیحد کوشش کی یہانتک کہ نہرو رپورٹ کی چند ترمیمات کے ساتھ حمایت بھی کی جسکا مفصل ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے ۔ ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات جسمیں جداگانہ حق انتخاب' کا مسئلہ سب سے اہم تھا) کا تماشہ حکومت برطانیہ دور ہی سے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ لارڈ برکنہیڈ نے ۷ رجولائی ۱۹۲۸ء کو جو تقریر دارالامراء میں کی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت ہندوستان کے باہمی اختلافات سے کتنا فائدہ حاصل کرتی ہے ۔ یہ تقریر تمام ہندوستانیوں کیلئے ایک چیلنج تھا کہ وہ بغیر انگلستان کی مدد کے امن سے رہ ہی نہیں سکتے ۔ اسی تقریر کے جواب میں نہرو کمیٹی کا تقرر ہوا تھا اسکا ایک مختصر اقتباس مندرجہ ذیل ہے :-

"سب سے بڑی تشویش جس سے آج ہندوستان کو سابقہ ہے وہ فرقہ دارانہ

سلہ چونکہ کتاب کا پچھلا حصہ تیار ہو چکا ہے اسلئے باقی صفحات کو ۱۰۴ ڈگری کے بخار کی حالت میں بھی لکھ رہا ہوں۔ مصنف

اختلاف ہے جو سات کروڑ مسلمانوں کو کثیر ہندو آبادی سے جدا کرتا ہے
ان اختلافات میں ہم اپنے ہاتھوں کو آلودہ نہیں کرنا چاہتے ۔ اگر کل ہم ہندوستان
سے چلے جائیں تو اسکا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں جنگ شروع ہو جائیگی"
گول میز کانفرنس میں بھی اس مطالبہ پر مسلم نمائندوں نے تمام زور صرف کیا مسلم لیگ
کی متواتر جدوجہد سے ۱۹۳۰ء میں لارڈ ارون کو وزیر ہند کے پاس آخر کار ایک
مراسلہ بھیجنا پڑا جسمیں واضح کر دیا گیا کہ "یہ رعایت جداگانہ انتخاب جو مسلمانوں کو
حاصل ہے ان کی مرضی کے خلاف نہ واپس لیجا سکتی ہے نہ لینی چاہیئے"۔
لہذا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں بھی اس حق کو تسلیم کر لیا گیا جو اب تک قائم
ہے اور انشاء اللہ جبتک مسلمانوں کی جماعتی حیثیت باقی ہے یہ حق قائم رہیگا۔
آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جو کچھ سیاسی اہمیت نظر آتی ہے اور آئندہ
کیلئے جو اُمیدیں وابستہ ہیں وہ اسی حق انتخاب جداگانہ کا نتیجہ ہیں ورنہ مسلم قومیت
نام نہاد متحدہ قومیت میں کبھی کی ضم ہو چکی ہوتی۔
علاوہ اسکے مسلمانان ہند کے دیگر حقوق سیاسی کے حاصل کرنے میں مسلم
لیگ ہی وہ جماعت رہی ہے جسکے لیڈروں نے مختلف طریقوں سے مسلم
حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کی۔ کمیونل اوارڈ اگرچہ لیگ کے مطالبے سے
بہت کم ہے لیکن صوبوں کی قانون ساز اسمبلیوں میں جو کچھ بھی تناسب مسلمانوں
کو مل سکا وہ مسلم لیگ کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔
آج جو صوبائی حکومتوں کا نظام اس ملک میں نافذ ہے اسکا نقشہ بھی مسلم
لیگ کے چودہ نکات میں موجود ہے۔ مسلم لیگ کی ابتدا سے صوبائی خودمختاری کے

حصول کی کوشش رہی تاکہ کم از کم جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انکو اندرونی آزادی حاصل رہے اور ہندوستان میں کم از کم پانچ صوبوں میں مسلمانوں کا سیاسی اثر قائم رہے۔ برخلاف اسکے کانگریس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ہندوستان میں صوبوں کو خود مختاری نہ دیجائے بلکہ مرکزی حکومت کو تمام اختیارات حاصل ہوں تاکہ مسلم اکثریت کے صوبے بھی مرکزی حکومت کے (جو ہر صورت میں ہندو حکومت ہوگی) ماتحت رہیں۔ اسی آئیڈیل کو نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا مگر مسلم لیگ کے رہنماؤں کی کوششوں کی وجہ سے کانگریس کی یہ چال کامیاب نہو سکی۔

سرحد، سندھ اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات دیے جانے کیلئے مسلم لیگ نے ہمیشہ کوشش کی۔ کانگریس ان مطالبات کی ہمیشہ مخالف رہی اسلیئے کہ ان شمالی مغربی تین صوبوں کو سیاسی حقوق حاصل ہو جانے سے اور ہندوستان میں مسلم سیاست کی اہمیت زیادہ ہو جانے سے ہندو اکثریت خوف زدہ تھی کہ مبادا یہ مسلم صوبے آزاد قبائل اور افغانستان سے ملکر ہندوستان پر قبضہ نہ کرلیں۔ اسی لئے ۱۹۲۵ء میں اسمبلی میں سوراجیہ پارٹی نے ان مطالبات کی مخالفت کی اور نہرو رپورٹ میں بھی صرف اس شرط کے ساتھ سندھ کی علیحدگی اور سرحد کو اصلاحات دیے جانے کی تجویز پاس کی کہ وہ ابتدا ہی سے اپنے مصارف خود برداشت کریں لیکن مسلم لیگ کی کوششوں سے صوبہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا اور صوبہ سرحد کو پنجاب سے علیحدہ کرکے نئی اصلاحات نافذ کیگئیں بلوچستان کا مطالبہ ابھی باقی ہے اور مسلم لیگ اس مقصد کے حصول کیلئے برابر جدوجہد میں مصروف ہے۔ حقیقت میں مسلم لیگ اور ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی مستقبل

انھیں شمالی مغربی اسلامی صوبوں کی قسمتوں سے وابستہ ہے ۔
مسلم لیگ کے چودہ نکات میں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت قائم رہے پنجاب میں ۵۱ فیصدی نیابت تقسیم کر لی گئی لیکن بنگال میں ۵۵ فیصدی آبادی کے باوجود ۴۹ فیصدی نیابت مسلمانوں کو دیگئی۔ اسکی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو کافی پاسنگ دیدیا گیا ہے۔ مثلاً یو۔ پی میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب چودہ فیصدی ہے مگر ان کی اقلیت کو موثر بنانے کیلئے ان کو ۳۰ فیصدی نیابت دیگئی اسلئے مسلم اکثریت کے صوبوں میں انکے تناسب سے ان کو بہت کم دیا گیا۔ لیکن یہ عذر قابل تسلیم نہیں ہے اسلئے کہ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اقلیت ہے مثلاً سرحد اور سندھ میں وہاں مسلمان ان کو وہی پاسنگ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن جہاں اکثریت اور اقلیت کے تناسب میں فرق بہت معمولی ہے وہاں اس قسم کی رعایت ناانصافی پر مبنی ہے۔ بہر حال اس فیصلہ کے خلاف جد وجہد برابر جاری ہے ۔

مسلم لیگ کا نصب العین | مسلم لیگ اپنے نصب العین کے لحاظ سے کانگریس سے بہت آگے بڑھ گئی ہے ۔ کانگریس آجتک اپنے نصب العین کو واضح نہیں کر سکی" پورنیہ سوراج" کا نصب العین ایسا غیر مبہم ہے کہ کبھی اسکی مکمل توضیح نہیں ہو سکی برخلاف اسکے مسلم لیگ کا نصب العین نہایت صاف اور غیر مبہم الفاظ میں کامل آزادی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی شکل میں، جسمیں مسلمانوں کے اور دوسری اقلیتوں کے حقوق ومفاد کافی اور موثر طریقہ پر دستور میں محفوظ رہینگے " ہے۔ یہامر قابل غور ہے کہ یہ وہی رزولیوشن ہے جس کو مولانا حسرت موہانی نے احمد آباد

کانگریس سیشن میں پیش کیا تھا اور وہاں منظور نہ ہو سکا تھا۔ مولانا حسرت صاحب نے لیگ کے پلیٹ فارم سے اس رزدلیوشن کو پیش کرتے وقت اس مسرت کا بیحد اظہار کیا تھا کہ جس چیز کو کانگریس خوف کی وجہ سے احمدآباد میں منظور نہیں کر سکی تھی اور نہ آجتک منظور کیا ہے وہ مسلم لیگ آج پاس کر رہی ہے"۔

رزدلیوشن کا ہر جزو معنی خیز ہے اور صاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ بیرونی تسلط کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہو گا آزادی کامل کے الفاظ صاف معنوں میں ہندوستان کیلئے ایسی آزادی کے طالب ہیں جسمیں کسی بیرونی طاقت کو مطلق کوئی دخل نہو۔

کسی جماعت کے نصب العین سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان آزاد ہو جانے کے بعد کس طرز حکومت کو اختیار کریگا۔ کانگریس اس معاملہ میں مجرمانہ طور سے خاموش ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے آزاد ہندوستان کے طرز حکومت کا پورا نقشہ سامنے رکھدیا ہے جسمیں نہ مطلق العنان شخصی حکومت کو کوئی دخل ہے اور نہ مرکزی حکومت ریونیٹری حکومت) کا کوئی امکان، نہ انگلستان کی طرح محدود شہنشاہیت اور نہ اٹلی اور جرمنی کے طرز پر ڈکٹیٹرشپ کی تقلید۔ بلکہ آزاد اور جمہوری ریاستوں کا ایک وفاق ہوگا جس کی رو سے آزادی پبلک کا ہر عضو اندرونی طور سے بالکل آزاد ہوگا۔ مرکز کسی اندرونی معاملہ میں مداخلت نہ کر سکیگا۔ مرکزی حکومت سے آزاد ریاستوں کا تعلق ان کی منشا اور خواہش پر مبنی ہوگا اگر کسی وجہ سے کوئی صوبہ مرکز سے اپنے آپ کو علحدہ کرنا چاہے تو اُس کو اختیار ہوگا۔ اسمیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بلوچستان کو شامل کر کے کم از کم چھ صوبے ایسے ہو سکیں گے

جنمیں اندرونی طور سے مسلمانوں کا سیاسی اثر غالب ہوگا اور ان کو اسلامی اصول
پر عمل کرنے کا کافی موقع مل سکے گا۔ اگر کسی وقت مرکزی حکومت جسمیں ہندو عنصر
غالب ہوگا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرے تو چھ مسلم صوبے مرکزی حکومت سے
اپنا تعلق منقطع کرکے دوسرا مسلم فیڈریشن بنا سکتے ہیں۔ یہی چھ مسلم صوبے ان مسلمانوں
کی پشت پناہ پر بھی ہونگے جو مسلم اقلیت کے صوبوں میں آباد ہیں۔ مولانا حسرت
موہانی کے اس رزولیوشن میں ایک اہم نکتہ اور پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ جس طرز
حکومت کی توضیح انھوں نے کی ہے وہ آزاد اور جمہوری ریاستہائے ہند کا وفاق
نہیں ہے بلکہ محض آزاد اور جمہوری ریاستوں کا وفاق ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ جو فیڈریشن قائم ہوگا اس میں
یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندستان ہی کی آزاد اور جمہوری ریاستیں اور صوبے اس وفاق میں شامل
ہوں بلکہ اسمیں موجودہ ہندوستان سے باہر کی ریاستیں بھی اگر وہ آزاد ہوں اور جمہوریت پر
مبنی ہوں تو اُسمیں شامل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً افغانستان اور آزاد قبائل اور وہ
ریاستیں جو روس اور افغانستان کے درمیان ہیں اور چین کا ایک حصہ۔ یہ آئیڈیل
اسلئے مدنظر ہے کہ اگر کسی وقت برادران وطن کی تنگ نظر اور متعصب پالیسی
نے مسلمانوں کو مجبور کیا اور اگر انھوں نے کبھی مسلمانوں پر مظالم کئے جسکا خطرہ
کانگریس کی ڈیڑھ سالہ حکومت نے اور زیادہ پیدا کر دیا ہے، تو ہندوستان کے
چھ مسلم صوبے دوسری آزاد ریاستوں کے ساتھ ملکر ایک ہی بلاک یا فیڈریشن
قائم کر سکتے ہیں۔ رزولیوشن کے اُس حصے سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے
کہ موجودہ صورت میں جو فیڈریشن حکومت برطانیہ ہندوستان کو دے رہی ہے
وہ لیگ کے نصب العین کے بالکل منافی ہے۔ جبتک برطانیہ کا سایہ ہندوستان میں

باقی ہے اور اُس مجوزہ فیڈریشن کے اجزا بالکل آزاد نہیں ہو جاتے اور وہاں جمہوری حکومت قائم نہیں ہو جاتی اسوقت تک کوئی فیڈریشن کی اسکیم قابل قبول نہیں ہے اسکے برخلاف جو اسکیم بھی ہوگی وہ بدرجہ مجبوری اسوقت قبول کیجائے گی جب کوئی چارہ کار نہوگا بدقسمتی سے کانگریس اس معاملہ میں بھی ہتھیار ڈالتی نظر آتی ہے اور باوجودیکہ وہ بارہا اعلان کر چکی ہے کہ موجودہ فیڈریشن کی اس اسکیم کو ہرگز منظور نہیں کیا جائیگا وہ چند ترمیمات کے ساتھ اسکو منظور کرنے پر آمادہ ہوتی جارہی ہے صرف اسلئے کہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی اور مسلم صوبوں کو اندرونی معاملات میں بھی دبا یا جا سکیگا اسلئے کہ ابھی تک صوبائی خودمختاری محض ڈھونگ ہے۔

اس رزولیوشن کی روسے جو دستور بھی مرتب ہوگا اُسمیں ہر اقلیت کو اُسکی حیثیت کے موافق نیابت اور دوسرے سیاسی حقوق دیے جائینگے۔ آزاد ری پبلک کی صدارت محض اکثریت رکھنے والی جماعت کا حق نہوگا۔ وزارت کی ترتیب و تشکیل تعلیمی معاملات، مذہبی رسومات اور ہر سیاسی و مذہبی مسئلہ میں ہر اقلیت کو بقدر تناسب حقوق حاصل ہونگے۔ مسلم لیگ صرف مسلمانوں ہی کے حقوق کی محافظ نہیں ہے بلکہ تمام اقلیتوں کے حقوق کیلئے جد وجہد کرنا ہمیشہ اُسکے فرائض میں داخل رہا ہے۔

فوجی پل | شمالی مغربی مسلم صوبوں کے متحدہ محاذ سے کانگریس ہمیشہ لرزہ براندام ہوتی ہے مسلم نیشنلسٹ اسٹیٹ کے تخیل کی کانگریس جسطرح ہمیشہ مخالفت کرتی ہے اور سرحد و سندھ میں جن طریقوں سے مسلمانوں میں عدم تشدد کی تعلیم

دیجا رہی ہے اور انہیں باہمی انتشار پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اسکا
مفصل ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اتفاق سے ہندوستان کی مجموعی فوج
میں تقریبا ۶۰ فیصدی تناسب مسلمانوں کا ہے جنمیں سے ۶۲ فیصدی مسلمان
انہیں مسلم صوبوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔ فوج میں مسلمانوں کا ۶۰ فیصدی کے
تناسب میں شامل رہنا کانگریس کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسلئے وہ عرصہ سے
اس کوشش میں مصروف ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کا یہ تناسب کم ہو۔ اسکا سب سے
موثر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ صرف یہی کہ مسلمان سپاہیوں کو مذہب کے پروپیگنڈے
سے متاثر کرکے اور فلسطین اور وزیرستان کے مظالم کی مثالیں پیش کرکے ورغلایا
جائے ان سے بغاوت کرائی جائے اور ان کو فوج سے نکلوایا جائے اور ہندوؤں
کو ان کی جگہ بھرتی کرایا جائے۔ اسی طرح فوجی بھرتی کے خلاف بھی زہریلا پروپیگنڈ
کیا گیا۔ گڑھوال اور راجپوتانے کے علاقوں میں جہاں سے گورکھے اور راجپوت
بھرتی ہوتے ہیں کوئی پروپیگنڈا آجتک نہیں کیا گیا۔ برخلاف اسکے مسلم صوبوں
میں ہر قسم کا پروپیگنڈا کیا گیا۔ غضب یہ ہے کہ اس پروپیگنڈے کیلئے بھی علمائے
سادہ لوح نے فتوے جاری کئے کہ مسلمانوں کا فوج میں بھرتی ہونا گناہ ہے۔
اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج میں مسلمانوں کا تناسب کم ہونے لگا۔ مسلم لیگ پارٹی نے
انہیں خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسمبلی میں فوجی بل کی حمایت کی جس کی رو سے
ہر وہ شخص جو فوج کی بھرتی کے خلاف پروپیگنڈا کریگا مجرم قرار دیا جائے گا۔
مسلم لیگ کے اس طرز عمل کے خلاف بہت آوازیں بلند ہوئیں۔ غلط فہمی اسلئے بھی
ہوئی کہ عوام کے سامنے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ بھرتی فلسطین کیلئے کیجا رہی ہے

حالانکہ یہ بالکل لغو ہے فوجی بل کا مقصد کسی نئی یا خاص فوجی بھرتی کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ معمولی بھرتی کی جو ہمیشہ جاری رہتی ہے اور جسمیں مسلمان نسبتاً زیادہ بھرتی ہوتے ہیں، حمایت مقصود تھی جہانتک فلسطین فوج بھیجنے یا وزیرستان کے آزاد قبائل اور کسی دوسری جگہ فوج بھیجنے یا وہاں کیلئے خاص طور سے بھرتی کا تعلق ہے مسلم لیگ نے ببانگ دہل اسمبلی میں اور باہر اپنی پالیسی کا اعلان کر دیا ہے کہ جب کبھی ہندوستان کی فوج کو برطانوی استعمار کیلئے استعمال کیا جائیگا یا بھرتی بیرون ہند مسلمانوں پر مظالم کرنے کیلئے کی جائے گی تو مسلم لیگ اُسکی پرزور مخالفت کریگی۔ فلسطین کمیٹی نے اپنی سفارشات میں جو آل انڈیا لیگ کونسل کے سامنے پیش کی ہیں اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ برطانوی مفاد کیلئے جو فوجی بھرتی ہوگی اس کی مخالفت کی جائے گی لیکن کانگریس کے پروپیگنڈے کو جو مسلمان سپاہیوں میں کیا جاتا ہے برداشت نہیں کیا جا سکتا خود کانگریس کے پروگرام کا اہم جزو یہ ہے کہ فوج میں ہندوستانیوں کے تناسب کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے مگر چونکہ کانگریس کا مطلب ہندوستانیوں سے ہندو ہوتا ہے اور فوج میں ہندوؤں کا تناسب کم ہے لہذا اسکو خود اپنے پروگرام کے خلاف آواز بلند کرنا پڑی۔ فوجی بل پاس ہوجانے کے بعد فوراً ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹوریل نوٹ کے ان الفاظ نے کانگریس کی اصل شکل سامنے رکھدی کہ:۔

"آخر کیا وجہ ہے کہ فوج کی بھرتی صرف شمالی مغربی صوبوں سے کیجاتی ہے اور جنوبی علاقوں سے زیادہ بھرتی نہیں کی جاتی۔"

ان الفاظ کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کو

ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ اگرکل کو ملک میں بغاوت ہوگئی یا انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ملک میں اصول جنگ ہوئی تو چونکہ فوج میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اسلئے وہ ہی غالب ہوکر ہندوستان پر قبضہ جمالیں گے۔ اسی لئے ایک طرف ہندو فوجی کالجوں کے قیام کی جدوجہد جاری ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو فوج سے کم کرکے ہندوؤں کو بھرنے کی اسکیم جاری ہے مسلم لیگ پارٹی نے کانگریس کے اس زہریلے پروپگنڈے کو کم کرنے میں اسمبلی میں جو طرزعمل اختیار کیا وہ مسلمانوں کے مستقبل کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہوگا ورنہ فوجی عنصر میں ہندوؤں کے غلبہ سے مسلمان آزاد اسلامی ہند کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

اقتصادی پروگرام غدر کے بعد سے مسلمانوں کی صنعتی اور اقتصادی حالت روز بروز تنزل کرتی گئی۔ آجکل مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ تجارت ہے نہ صنعت۔ کچھ سرمایہ کی کمی اور زیادہ تر ہم آہنگی اور ہمت افزائی نہونے کی وجہ سے حالت برابر ناگفتہ بہ ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں کافی صنعتیں موجود ہیں۔ کپڑے کی دستکاری بالخصوص باریک کپڑوں کے بننے کا کام زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے مگر اُس صنعت کا تمام فائدہ ہندو ساہوکار اُٹھا رہے ہیں۔ مسلمان دستکار ہندو ساہوکاروں سے سود پر قرض لیکر سامان تیار کرتے ہیں اور سود کے تقاضے اور منڈی خود انھیں ساہوکاروں کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اصل قیمت سے بھی کم پر بسا اوقات فروخت کرنے پر مجبور رہجاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی ترقی مسدود رہتی ہے۔

اور ہندو مہاجن ان کے ہاتھ کی صنعتوں سے برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دوسری طرف کانگریس اسپنرس ایسوسی ایشنز کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے پارچہ بافی کی صنعت کو رفتہ رفتہ لے رہی ہے۔ ابتدا میں مسلمان جولاہوں کو ملازم رکھ کر کام سیکھا گیا اور پھر بعد میں ان کو الگ کر کے اپنے تنخواہ دار ملازموں سے کام سکھایا جاتا ہے اور سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی تعلیم بہت جد و جہد کے ساتھ دی جا رہی ہے جس سے مسلمان جولاہے رفتہ رفتہ ان علاقوں میں کمزور ہوتے جا رہے ہیں جہاں یہ مرکز قائم ہیں۔

مسلم لیگ اس ڈیڑھ سالہ حیات نو کے دور میں اس مسئلہ کو بھی نہیں بھولی آل انڈیا مسلم لیگ اور صوبہ یو۔ پی مسلم لیگ نے اقتصادی کمیٹیاں مقرر کر کے رپورٹ شائع کرائیں اور عملی اقدامات بھی اٹھائے۔ بالخصوص صوبہ یو۔ پی میں مختلف اضلاع میں ہاتھ کا کپڑا بننے کیلئے اسٹور قائم کئے۔ لیکن یہ حالت اسوقت تک درست نہیں ہو سکتی جبتک مسلم دستکاروں کیلئے بلا سود قرضوں کا انتظام اور مسلمان منڈیاں پیدا نہ کی جائیں جہاں وہ اپنا تیار کردہ سامان جا کر مناسب قیمتوں پر فروخت کر سکیں۔ اسکے لئے کوشش برابر جاری ہے۔

تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح کیلئے بھی مسلم لیگ مصروف جد و جہد ہے مسلم لیگ کے استحکام اور تقویت نظام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مجموعی ترقی وابستہ ہے۔ لہذا مسلم لیگ کی اہمیت کو محسوس کر کے اس ادارے کو زیادہ سے زیادہ

سلہ میں نے خود صوبہ مسلم لیگ یو۔ پی کی مقرر کردہ اقتصادی کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ان تمام حالات کا کانگریسی مرکز دن بگلا مدھی آشرموں میں معائنہ کیا۔ (مصنف)

مضبوط بنانا چاہیئے۔ جب ہی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی اس ملک میں کوئی امید ہو سکتی ہے۔

باب نہم

جمعیۃ العلماء ہند کی پالیسی پر ایک نظر

علماء کا سیاست سے تعلق | غدر کے بعد سے تحریک خلافت تک علماء ہندوستان کی سیاست سے بالکل علیحدہ رہے۔ دنیا کے سیاسی انقلابات، مسلمانان عالم پر بے پناہ مظالم ہندوستان کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت سے انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انھوں نے دنیوی سیاست میں اگر کوئی حصہ لیا بھی تو صرف اتنا کہ سرسیدؒ کی جدید تعلیم کی تحریک کی زور شور سے مخالفت کی، علیگڈھ کالج کے قیام کے خلاف مسلم عوام کے مذہبی جذبات کو خوب بھڑکایا، انگریزی تعلیم، سائنس اور جدید علوم کے حاصل کرنے والوں اور اُن کے فروغ کی جد وجہد کرنے والوں کو کافر و ملحد کہکر بدنام کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے۔ جب تک ان علماء کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا دوسری قومیں بساط سیاست پر اپنا قبضہ جما چکی تھیں جبکہ ہندو تعلیمی جد وجہد، معاشرتی اصلاح اور سیاسی ترقی میں مصروف تھے ہندوستان کے علماء باہمی رزم آرائیوں اور شغل تکفیر میں مصروف تھے بقول علامہ اقبالؒ ؎

دین کافر فکر و تدبیر جہاد   دین ملا فی سبیل اللہ فساد

وہ مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کرکے دوسری قوموں کے ساتھ چلانے کے بجائے اُن میں بریلوی، وہابی، مقلد اور غیر مقلد وغیرہ فرقہ بندیاں اور گروہ بندیاں قائم کرکے باہمی انتشار پھیلانے میں مصروف تھے۔ وہ مذہب کے بڑے بڑے اصولوں کو چھوڑ کر عیسائیوں اور آریوں سے مناظروں میں مصروف تھے نماز میں ہاتھ ناف کے اوپر یا ناف کے نیچے باندھنے، الحمد کے بعد آمین بالجہر یا آمین بالسر (آہستہ سے) پڑھنے، میلاد میں سلام کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر پڑھنے کی دور از کار بحثوں میں پڑے ہوئے تھے اور مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو، جس پر ان تمام فروعی چیزوں کا دارومدار ہے، جسطرح مٹایا جارہا تھا اس کی ان کو خبر تک نہ تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے "تذکرہ" کے دیباچہ میں اس حقیقت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

"عام طور پر اس گروہ (علماء کی جماعت) کا اعتقاد یہ تھا کہ ہمارا کام صرف دین ہے اور دین کا مطلب صرف یہ ہے کہ نماز اور روزے کے مسائل بتلائے جائیں یا کفر کے فتووں پر مہریں کر دیجائیں یا شاگردوں کو چند کتابیں پڑھا دیجائیں، باقی رہی مسلمانوں کی قومی زندگی اور اُن کی موت و حیات، تو یہ تمام باتیں دنیاداری کی باتیں ہیں یا سیاسی، علمائے دین اور مشائخ طریقت کو ان سے کیا واسطہ؟ اگر ان میں سے کسی بزرگ کو چند لمحوں کیلئے قوم کی حالت زار پر توجہ بھی ہوتی تھی تو یہ کہکر خود اپنے اور اپنے معتقدین کے دلوں کو تسکین دیدیتے تھے کہ اب ہماری تمہاری کوشش سے کیا ہوتا ہے؟ اب تو قیامت قریب ہے اور مسلمانوں کی تباہی لازمی۔ سارے کاموں کو

حضرت امام مہدی کے نکلنے کے انتظار میں ملتوی کر دینا چاہیئے۔ اُس وقت ساری دنیا مسلمانوں کیلئے خالی ہو جائے گی۔"

بیسویں صدی کی ابتدا تک علماء کی یہی حالت قائم رہی۔ بعض بزرگ ہستیوں نے اسی زمانے میں مذہبی جوش اور انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کی کوشش میں سیاست میں ضرور حصہ لیا لیکن کسی جماعتی نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ اور علماء بہ حیثیت جماعت سیاست سے قطعی کنارہ کش رہے اُنکی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے کی سیاست نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں یورپین ڈپلومیسی سے متاثر ہو رہی تھی اور بدقسمتی سے علماء ہند مغربی طرز سیاست سے بالکل ناآشنا اور دشمنوں کے ہتھیاروں سے بالکل غیر مسلح تھے بلکہ اُسکے حصول کو بھی الحاد اور کفر سمجھتے تھے۔ جبکہ حضرت جمال الدین افغانی نے قسطنطنیہ حجاز، مصر اور ایران میں اپنی جلیل القدر شخصیت اور خداداد سیاسی قابلیت کی بنا پر ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا اور اپنے جدید سیاسی تجربات اور یوروپ ایشیا کے تمام حالات کا بچشم خود مطالعہ کرنے کی وجہ سے تمام مشرقی ممالک میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ ہندوستان کے علماء یوروپ کی زبانوں و علوم سائنس کے نام تک سے گھبراتے تھے۔ اُس زمانے میں جمال الدین افغانیؒ ہندوستان بھی دو مرتبہ تشریف لائے، حیدرآباد میں عرصہ تک قیام کیا، کلکتہ میں نظر بند بھی رہے اور اگرچہ مصر کے سیاسی انقلاب[۱] کی وجہ جو محض انہی کی ذات واحد کا کرشمہ تھا اُنکی

---

[۱] برطانوی استعمار کے خلاف مصر کے مسلمانوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات آپ ہی نے ابھارے تھے محمد عبدہٗ مصری اور سعد زاغلول پاشا آپ ہی کے اثر سے میدان سیاست میں داخل ہوئے تھے۔

شہرت تمام عالم میں ہو چکی تھی لیکن یہاں کے علمار کی بے حسی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکے۔ اگر سر سید نے اسی تعلیم جدید کے نسخے کو ہندوستان میں استعمال کرنا چاہا جس کو جمال الدین افغانی دوسرے ممالک اسلامی میں پھیلا چکے تھے تو علمار وقت نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو قسطنطنیہ میں شیخ الاسلام نے جمال الدین افغانی کے ساتھ کیا تھا اور کفر کا فتوے ان کے خلاف دیا تھا۔

علامہ اقبال ؒ نے علمائے ہند کو حجرہ نشینی چھوڑنے اور مرد مجاہد بننے کی تعلیم بیسویں صدی کے اوائل میں پیش کی اور جہاں انھوں نے نیم مغرب زدہ مسلمانوں کو تفریخ کے خطرات سے آگاہ کیا اور "زائران حریم مغرب" کے خلاف آواز بلند کی وہیں مرشدان خود بیں کی خود غرضیوں سے بھی آگاہ کیا ؎

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں (اقبالؒ)

مولانا محمد علی مرحوم جب ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو ایک طرف اُنھوں نے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مذہبی جذبہ پیدا کرنے اور ان میں اسلامی سیاست سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف علمار کے گروہ کو خانقاہوں سے میدان سیاست میں لانے کی سعی فرمائی۔ علمار کے مجمع میں غالبًا مولانا محمد علی کی پہلی آواز تھی جو ان کی گوشہ نشینی کے خلاف بلند کی گئی تھی۔ آپ نے مراد آباد کے ایک علمار کے مشہور اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"میں علمائے کرام سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ حضرات

اپنے منصب گرامی کی رفعت کو اور اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے۔
آپ حریم اسلام کے دربان ہیں۔ اگر عاقبت میں ہمارے دُرّے لگیں گے تو یہ
نہ سمجھئے کہ آپ بچ جائیں گے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم چھپیں کے مستوجب
ہونگے تو شاید آپ چھپتر کے مستحق ٹھہرینگے اسلئے کہ آپ پر ہم سے کہیں زیادہ
ذمہ داری عائد ہوتی ہے . . میں نئے تعلیم یافتوں کی دلی حالت آپ سے
چھپاؤں گا اگر یہ نہ کہوں کہ آپ میں سے اکثر افراد کو یہ گروہ رحل کی ایک چوب
خشک سمجھتا ہے لیکن آپ وہ رحل ہیں جس پر خدا کا قرآن رکھا ہوا ہے۔ اسلئے
ہم اس رحل کو ٹھکراتے نہیں بلکہ عظمت کرتے ہیں، لیکن آپ کی عظمت ایک
حامل شریعت جماعت کی حیثیت سے ہونا چاہیئے۔ اور ہوگی، اگر آپ شریعت
کی صحیح تعلیم دیں، خود اُس پر چلیں اور ہم سب کو اُس پر چلائیں"

جنگ عظیم سے قبل مسلمانانِ عالم پر اتحادی طاقتوں نے جو مظالم کئے اور خود ہندوستان
میں جو مسائل پیش آئے۔ اُنھوں نے علماء کو سیاست میں داخل ہونے پر مجبور رکھا۔
جنگ عظیم کے بعد جب مولانا محمد علی مرحوم رہا ہو کر امرتسر تشریف لائے تو وہیں
جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ۲۸ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ڈالی گئی اور مولانا عبدالباری
صاحبؒ فرنگی محلی نے پہلے جلسہ کی صدارت فرمائی۔

اُسی زمانے میں مسلم لیگ کا اجلاس سالانہ بھی امرتسر ہی میں تھا۔ مسلم لیگ
اُس زمانے میں ملک کی سب سے زیادہ انتہا پسند جماعت سمجھی جاتی تھی۔ جمعیۃ العلماء
کے بانی سب مسلم لیگ کے ارکان تھے۔ جمعیۃ العلماء کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی
مذہبی رہنمائی قرار پایا۔ اسطرح اُس زمانے میں جمعیۃ العلماء مسلم لیگ کی مشاورتی جماعت

تھی۔ دوسرے اجلاس میں جمعیۃ العلمار کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے فرمائی تھی۔

اسکے بعد سے برابر جمعیۃ العلمار ہند نے ۱۹۲۹ء تک مسلم لیگ سے اشتراک عمل کیا۔ تجاویز دہلی میں مسلم لیگ اور جمعیۃ العلمار ہند دونوں ہمنوا تھے۔ جمعیۃ العلمار نے برابر مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے دوسری جماعتوں سے اشتراک عمل کی دعوت دی۔ لیکن کسی تجویز کے ذریعہ بلا شرط شرکت کانگریس کا مشورہ مسلمانوں کو نہیں دیا۔

شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں میں جمعیۃ العلمار کے ارکان شرکت کانگریس کے سخت مخالف تھے اور تبلیغی جد و جہد میں مصروف تھے۔ ۱۹۲۶ء کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت علامہ سلیمان ندوی مسلمانوں کی علحدہ تنظیم کی ضرورت اور برادران وطن کی تنگ ذہنیتوں سے مجبور ہوکر مندرجہ ذیل تجویز تک پاس کردی تھی:۔

> "چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہورہی ہے اسلئے مسلمان اپنی تنظیم کرکے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارہ میں اتحاد عمل کرنا چاہیں اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا جائے۔"

اس تجویز کا ایک ایک لفظ جمعیۃ العلمار کی موجودہ پالیسی کے خلاف ہے۔ دہلی تجاویز کے زمانے تک جمعیۃ العلمار ہند کی سیاست کا محور صرف مولانا محمد علی کی ذات رہی۔ وہی علمار کو سیاست میں کھینچکر لانیوالے تھے۔ اور انھوں نے ہی

جمعیۃ العلماء کی تحریک خلافت کے زمانے میں عوام کے دلوں میں اس قدر عزت پیدا کردی تھی۔ مولانا جس پالیسی کو مناسب خیال کرتے تھے وضع کرتے تھے اور جمعیۃ العلماء کے ارکان ان کی رہنمائی میں اسی پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۸ء کے آخر ہی میں جبکہ مولانا کانگریس سے بدظن ہو کر اس کو چھوڑ چکے تھے اور ان حالات میں مسلمانوں کا کانگریس سے علیحدہ رہنا مفید اور ضروری سمجھتے تھے جمعیۃ العلماء کے ارکان نے مولانا کے خلاف وہ طرز عمل اختیار کیا جس کی کبھی توقع بھی نہ تھی۔

۱۹۲۹ء میں مرادآباد کے اجلاس جمعیۃ العلماء میں مولانا محمد علی کا نام صدارت کیلئے پیش کیا گیا لیکن انھیں اصحاب نے جن کو عوام میں مولانا ہی نے روشناس کرایا تھا اور جن کی سیاسی شہرت کا واحد سبب مولانا مرحوم ہی کی ذات شریف تھی، نہ صرف سخت مخالفت کی بلکہ ان کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مذہبی قابلیت اور عربی استعداد پر حملے کئے گئے اور اس مجاہد اسلام، شیفتہ مذہب، عاشق رسول اور وسیع النظر عالم کے خلاف ہر شرمناک مظاہرے کو جمعیۃ العلماء کے اراکین خصوصی نے روا رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ العلماء کا اسوقت کا طرز عمل ہمیشہ اُس کے دامن پر سیاہ دھبہ رہے گا۔

سیرت محمد علی کے مصنف نے اسی واقعہ کو اس طرح لکھا ہے :-

"سنا ہے کہ جمعیۃ کے ایک محترم رکن نے برسر اجلاس فرمایا کہ محمد علی تو قرآن شریف تک غلط پڑھتے ہیں وہ صدارت کیا کریں گے؟ ..... بہر حال ان

> دلشکن اور افسوسناک کارروائیوں کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا اور صدارت
> کیلئے ہندوستان کے مشہور مخدوم قوم اور خادم اسلام مولانا معین الدین صاحب
> مدظلہ کا انتخاب ہوا جنھوں نے اس روش کے بعد صدارت قبول کرنے سے
> قطعاً انکار کردیا۔ اور ممبری سے بھی استعفاد یدیا۔

اسکے بعد ۳۰ء کی تحریک میں جس غلط پالیسی پر عامل ہوکر جمعیۃ العلماء نے
شرکت کی اُسپر مفصل بحث پہلے کی جاچکی ہے، لیکن ان اختلافات کو نظر انداز
کرتے ہوئے یہ بات قابل غور ہے کہ اس تحریک میں بھی جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں
کو بحیثیت جماعت علٰحدہ رکھتے ہوئے سول نافرمانی کی تھی۔ کانگریس کے ساتھ
اشتراک عمل ضرور تھا لیکن انفرادی طور سے شرکت کانگریس کا کوئی سوال
نہ تھا نہ مسلم رابطہ عوام کا کوئی مسئلہ درپیش تھا بلکہ جمعیۃ العلماء کے ڈکٹیٹر
علٰحدہ مقرر کئے جاتے تھے اور سزایاب ہوتے تھے۔ کانگریس نے بھی گاندھی
اردن پیکٹ میں جمعیۃ سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ اسی لئے جمعیۃ العلماء نے کانگریس
کے کچھ دنوں بعد تک سول نافرمانی جاری رکھی۔

۳۴ء میں جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ قریب آیا تو جمعیۃ العلما
نے اُسوقت بھی مسلمانوں کی علٰحدہ جماعت بناکر الیکشن لڑنے کی تائید کی۔
لہذا لکھنؤ میں یونٹی بورڈ قائم کیا گیا جسمیں جمعیۃ العلماء نے باضابطہ شرکت کی
اور قوم پرور مسلم طبقے کو اسمبلی میں بھیجنے کیلئے جداگانہ حیثیت سے انتخابات میں
حصہ لینے کی تجویز پاس ہوئی۔ یونٹی بورڈ میں ہز ہائینس سر آغاخاں کو بھی شرکت
کی دعوت دیگئی تھی لیکن وہ نہیں آسکے تھے اسکے باوجود بھی جمعیۃ العلماء کے

ارکان نے برابر حصہ لیا۔

۱۹۳۶ء کے انتخابات سے کچھ عرصہ قبل اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے علٰحدہ رکھتے ہوئے انتخابات میں شرکت کی جائے تاکہ قانون ساز صوبائی اسمبلیوں میں مسلمان بہ حیثیت جماعت جائیں اور رجعت پسند طبقے کو ختم کر دیا جائے۔

اُسی زمانے میں دہلی میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ اجلاس زیر صدارت مولانا حسین احمد صاحب منعقد ہوا۔ اسمیں مسٹر جناح کو شرکت کی دعوت دی گئی اُنھوں نے وہاں علماء کے مجمع میں بزبان انگریزی تقریر کی جسکا اُردو ترجمہ مسٹر آصف علی نے کیا اسمیں انھوں نے اپنی پالیسی کی بہت صاف الفاظ میں توضیح کردی کہ مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے علٰحدہ رہنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔

اسکے تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت سر وزیر حسن منعقد ہوا اسمیں جمعیۃ العلماء کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب نے بحیثیت ممبر آل انڈیا کونسل مسلم لیگ میں شرکت فرمائی اور اس تجویز کی جمعیۃ العلماء کی طرف سے تائید کی کہ آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ کو بہ حیثیت جماعت حصہ لینا چاہیئے اور مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں پارلیمنٹری بورڈ بنا یا جائے جسکا مکمل اختیار سب کی رائے سے مسٹر محمد علی جناح کو دیدیا گیا۔

مسٹر جناح نے فوراً ہی مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے ممبروں کے نام کی فہرست شائع کردی جسمیں جمعیۃ العلماء ہند کے اراکین خصوصی بھی نامزد تھے اور نواب صاحب چھتاری بھی۔ لیکن جمعیۃ العلماء کے کسی رکن نے نواب صاحب چھتاری کی نامزدگی کا

نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں کی بلکہ ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے ان کے اور نواب جمشید علیخاں صاحب آف باغپت کے خلاف کسی امیدوار کو بھی کھڑا نہ ہونے دیا۔ الیکشن کے زمانے میں مسٹر جناح کی ہدایات کے مطابق ممبران جمعیۃ نے کافی جدوجہد کی۔ مولانا حسین احمد صاحب نے تو اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہانتک فرمایا کہ "جو شخص مسلم لیگ کی مخالفت کریگا وہ دونوں جہاں میں روسیاہ ہوگا اور گناہ عظیم کا مرتکب ہوگا۔" کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلہ میں سترہ امیدوار کھڑے کئے تھے جمعیۃ العلماء کے کسی ممبر نے بھی کسی کی تائید میں مسلم لیگ کی مخالفت نہیں کی۔

لیکن انتخابات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جمعیۃ العلماء کے ممبران کی پالیسی میں جو تغیر رونما ہوا، جسطرح بعض اراکین جمعیۃ کانگریس کے غلط پروپگنڈا اور غلط فہمیوں کے شکار ہوگئے اور جن طریقوں سے بعض نے ذاتی مفاد اور شخصی اغراض پر قومی مفاد کو قربان کیا، جب ان تمام حالات پر غور کیا جاتا ہے تو حیرت و افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جو حضرات کانگریس کی ریشہ دوانیوں اور رازِ درونِ میخانہ سے واقف ہیں وہ ملت اسلامی کی بدقسمتی پر متاسف ہیں کہ جب علماء ہی کا ایک گروہ اسقدر غیر مستقل مزاج اور سادہ لوح ہے تو عامۃ المسلمین کی بے راہ روی کا کیا حال ہوگا؟ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

کانگریس نے الیکشن کی زبردست کامیابی کے نشہ سے مست ہوکر جب مسلم لیگ سے بہ حیثیت جماعت صلح کرنے سے انکار کیا اور مسلم عوام میں براہ راست پروپگنڈہ

کرنے کی مہم جاری کی تو عوام تک پہونچنے کیلئے جمعیۃ العلمار کے اراکین خصوصی کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کانگریس جانتی تھی کہ اگر اراکین جمعیۃ بالخصوص مولانا حسین احمد صاحب اور مسٹر جناح ایک پلیٹ فارم پر متحد الخیال ہوکر کام کرتے رہے تو مسلم ماس کنٹیکٹ کی اسکیم کارگر نہیں ہوسکتی اسلئے مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کے ذریعہ مولانا حسین احمد صاحب اور دیگر اراکین جمعیۃ کے پاس غلط اور گمراہ کن واقعات پہونچائے گئے اور ان کو باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ مسلم لیگ سرکاری جماعت ہونا چاہتی ہے، رجعت پسند طبقے کو شامل کرنا چاہتی ہے اور آزادی کی مخالف ہے، کانگریس چھ صوبوں کی حکومتوں پر قابض ہونے والی ہے اسلئے مسلمانوں کو بھی کانگریس ہی میں شریک ہونا چاہیئے۔

جمعیۃ العلمار نے اسوقت تک کانگریس میں انفرادی طور سے شرکت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اسلئے جمعیۃ کے چند خودغرض ممبران کے ذریعہ کوشش کی گئی کہ جمعیۃ العلمار سے شرکت کانگریس کی تجویز پاس کرالی جائے۔ لہذا اُسی زمانے میں مرادآباد میں جمعیۃ العلمار کا اجلاس اسی مسئلہ پر غور کرنے کیلئے منعقد کیا گیا اور خوب بحث ہوئی مگر صدر جمعیۃ مفتی کفایت اللہ صاحب نے بلا شرط شرکت کو ہرگز منظور نہونے دیا۔ جو رزولیوشن وہاں پاس ہوا اُسکے دو حصے تھے ایک میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جہانتک آزادی کی جنگ کا تعلق ہے جمعیۃ العلمار کے سامنے شرکت یا عدم شرکت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے جمعیۃ العلمار نے ہمیشہ ایسی جنگ میں شرکت کی ہے۔ دوسرے حصے کا مفہوم بھی بہت صاف تھا اسمیں اسکی توضیح کردی گئی تھی کہ حکومت جزوی یا کلی ملنے پر بلا معاہدہ اور بلا شرط مسلمانوں کا کانگریس میں جانا مناسب

نہیں ہے۔ اس رزولیوشن کے بعد کانگریس کی رابطہ عوام کی مہم سے تعاون کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن ابھی اس فیصلہ کی روشنائی بھی نہ سوکھنے پائی تھی کہ الہ آباد میں آنند بھون میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کی صدارت میں کانگریس خیال کے مسلمانوں کا ایک مشاورتی جلسہ ہوا جسمیں جمعیۃ العلماء کے مقتدر رہنماؤں نے بھی شرکت فرمائی اور مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اس خبر کو سُنا کہ جس تجویز کو جمعیۃ العلماء نے مرادآباد میں رد کر دیا تھا اُس کو الہ آباد میں جمعیۃ العلماء کے اُنھیں حضرات نے بیٹھ کر پاس کر لیا اور یہ فیصلہ کر دیا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں بلا کسی شرط کے داخل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں نے اس فیصلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اسکے فوراً بعد ہی جیسا کہ خیال تھا مولانا حسین احمد صاحب کا استعفا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے آگیا۔

صدر جمعیۃ العلماء حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب الہ آباد کے اس فیصلہ میں شریک نہ تھے۔ انھوں نے ہی مرادآباد رزولیوشن کو تیار کیا تھا اور وہ پورے طور سے کانگریس کی رابطہ عوام کی اسکیم کے خلاف تھے۔ آپ نے نہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے استعفا دیا اور نہ کوئی بیان آجتک کانگریس کی حمایت میں دیا ۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو بعد ظہر راقم الحروف نے خود مفتی صاحب سے تمام حالات پر مفصل گفتگو کی۔ میرے سوالات کا مفتی صاحب نے اسطرح جواب دیا۔

"کانگریس میں بلا شرط شامل کرنے کیلئے جمعیۃ العلماء کے اراکین جو پروپیگنڈہ مسلمانوں میں کر رہے ہیں وہ مرادآباد رزولیوشن کے بالکل منافی ہے

---

[1] یہ گفتگو مدرسہ امینیہ میں ہوئی تھی۔

یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ انفرادی طور سے کر رہے ہیں۔ جمعیۃ کا اس قسم کا کوئی پروگرام نہیں ہے میرے پاس اتنی طاقت نہیں جتنی جواہر لال کے پاس ہے کہ میں بھی جماعتی نظام کے ماتحت انکے خلاف کوئی کارروائی کر سکوں"

ناظم جمعیۃ العلماء ہند مولانا احمد سعید صاحب کی پالیسی حافظ ابراہیم صاحب کے الیکشن کے زمانے تک بہت صاف رہی لیکن جمعیۃ میں ان کی پوزیشن ہیلٹ جیسی ہے وہ دل سے سب کچھ کرنا چاہتے ہیں ان کی تمام ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لیکن جمعیۃ العلماء کے اندر اپنی پارٹی کی کمزوری کی بنا پر کچھ نہیں کر سکتے۔

۴ اگست ۱۹۴۶ء کو آپ نے ایک مفصل بیان اخبارات کو دیا۔ جس میں صاف طور سے فرمایا:—

"ہم نے ہمیشہ صراحتاً اس امر کا اعلان کیا ہے کہ ہم بھی جنگ کرنے والی پارٹی کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے خواہ وہ کانگریس ہو یا سوشلسٹ یا کمیونسٹ فرض کیجئے اگر کانگریس اپنے ہتھیار کھول دے اور حکومت برطانیہ سے تعاون کرے تو کیا ہم کانگریس کے ساتھ اُلجھے رہیں گے۔ نہیں! بلکہ ہم کسی دوسری ایسی پارٹی کو تلاش کریں گے جو ہمارے حقیقی مقصد یعنے مکمل انقلاب کو ہم سے قریب کرنے والی ہو۔ ہماری کوشش تو ہمیشہ یہ رہی ہے اور ہم ہمیشہ ایسی قوت وطاقت کی تلاش میں رہے ہیں جو بدوں شرکت غیرے ہم کو منزل مقصود تک پہونچا دے"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جمعیۃ العلماء کا نصب العین بلا شرکت غیرے آزادی ہند کا حصول ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بے بسی اور مجبوری کی حالت میں دوسری

پارٹی سے اشتراک عمل بھی کیا جائے۔ لیکن اب جبکہ بقول ناظم صاحب کے اس پارٹی نے اپنے جنگ کے ہتھیار کھول دیے ہیں اور حکومت برطانیہ سے پورے طور سے تعاون ہے، تو پھر وہ اور ان کے رفقاء اس جماعت کے ساتھ کیوں اُلجھ رہے ہیں یہ حقیقت کہ کانگریس آزادی کی جنگ کو چھوڑ چکی ہے خود مولانا کے اس بیان کے مندرجہ ذیل حصہ میں ہے :۔

"مستقبل قریب میں جنگ کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کانگریس اور حکومت دونوں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کی پالیسی پر عامل ہیں"

جمعیۃ العلماء کے اجلاس مراد آباد کے قریب ہی مولانا نے ایک اور بیان دیا تھا اسمیں نہایت مدلل طریقے سے ثابت کیا تھا کہ :۔

"جب کانگریس حکومت ہند سے اپنے مطالبات منظور کرا رہی ہے تو مسلمان اگر کانگریس سے اسی بنا پر مفاہمت کرنا چاہیں تو کیا بیجا ہے"

اسی سلسلے میں راقم الحروف کو مولانا احمد سعید صاحب سے خط وکتابت کرنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا کا مندرجہ ذیل خط نمبر ۹۰ مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۴۱ء جمعیۃ العلماء کی پوری پالیسی پر روشنی ڈالتا ہے :۔

"محترم خانصاحب۔ سلام مسنون۔ بعض باتیں تمہاری بھولی بھولی سچی بھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ کسی حد تک سچی ہیں بھی۔ لیکن معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ ان کی اصلاح میرے قابو سے باہر ہے۔ میرے خود اعضا اور جوارح مجھ سے باغی ہیں۔ ان حالات میں میں خود بے بس ہوں۔ صورت صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ اگر شیخ (مولانا حسین احمد) کو کچھ مانع کر سکتے ہو

اور جواہر لال کے غرور اور تکبر کی داستان سے متاثر کر سکتے ہو اور اپنے
خلاف پروپیگنڈے کے اثر کو زائل کر سکتے ہو اور اس منتر کا کوئی تریاق
آپ کے پاس ہے۔ جو تمہارے خود غرض دوستوں نے پڑھا ہے تو پہلی
فرصت میں دیوبند جاؤ اور تمام معاملات طے کر کے مجھے مطلع کرو۔"

حقیقت میں صدر اور سکریٹری جمعیۃ العلماء دونوں مسٹر جناح سے متفق الخیال اور
لیگ کے ساتھ تعاون پر آمادہ تھے مگر چونکہ بعض خود غرض ممبران نے غلط واقعات
دکھا کر مولانا حسین احمد صاحب کو لیگ سے متنفر کر دیا تھا اسلئے ابتدا میں دونوں
حضرات نے خاموشی اختیار کی۔ یہانتک کہ جھانسی کے الیکشن میں باوجود کانگریس
کی درخواست کے دونوں صاحبان نے مدد دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ لیکن
مولانا حسین احمد صاحب اور ان کی پارٹی کی مخالفت بھی نہیں کر سکتے تاکہ جمعیۃ العلماء
کے دو حصے ہونے پائیں۔ لہذا آپ نے ایک دوسرے خط نمبر ۱۰۰ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۷ء
میں راقم الحروف کو لکھا:۔

"میں بارہا آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ مولانا حسین احمد صاحب کو ہم خیال
بنانے کی سعی کیجئے، صحیح واقعات اور صحیح خطرات سے ان کو آگاہ کیجئے ....

اگر آپ مضبوط ہو کر کام کریں اور جمعیۃ العلماء میں تفریق نہ ہونے دیں تو سب
کچھ ہو سکتا ہے اور اگر جمعیۃ العلماء میں دو حصے ہو جائیں یا ہندوؤں کی کوشش
سے دو حصے کر دیے جائیں تو یقیناً بہت نقصان ہو جائے گا۔"

مسلم لیگ کے ارکان نے تمام کوششیں مولانا حسین احمد صاحب کو سمجھانے میں
صرف کر دیں چودھری خلیق الزماں صاحب، نواب اسمٰعیل خاں صاحب اور مفتی

عنایت اللہ صاحب نے بالخصوص ان کو تمام نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی جدوجہد کی مگر (بقول خود مولانا) ان کو خداوندان لیگ پر بالکل اعتماد نہ رہا تھا اور انکو آزادی کی منزل سوراج بھون ہی میں نظر آتی تھی اسلئے تمام کوششیں بیکار ہوئیں۔ رفتہ رفتہ سکریٹری جمعیۃ العلماء ہند بھی کھل کر مخالف گروہ میں شامل ہو گئے اور حافظ ابراہیم صاحب کے الیکشن کے زمانے سے لیگ کی مخالفت میں مصروف ہو گئے۔

مولانا احمد سعید صاحب کی خط و کتابت کی مزید تفصیل اور واقعات جس کی بنا پر اسکا آغاز ہوا تھا اس وقت مصلحتاً نظر انداز کئے جاتے ہیں اسلئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ان واقعات کو موجودہ حالات میں پبلک کے سامنے لایا جائے جن سے بعض اراکین جمعیۃ کا پرائیوٹ کیرکٹر معرض بحث میں آسکے۔ لیکن اس حقیقت کو چھپانا کتمان شہادت سے کم نہ ہوگا کہ اراکین جمعیۃ العلماء کی تمام موجودہ پالیسی شخصی مفاد اور بعض غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر حافظ ابراہیم صاحب سے مسلم لیگ پارٹی سے استعفا دلاکر انکے لئے وزارت نہ حاصل کی جاتی تو جمعیۃ کی موجودہ پالیسی بالکل مختلف ہوتی حافظ ابراہیم صاحب کے آبگینۂ وزارت کی حفاظت آجکل جمعیۃ العلماء کی پالیسی کا اہم جزو ہے۔ لہذا مولانا احمد سعید صاحب اپنی سیاسی پالیسی کے تغیر کے بعد

---

[1] اگرچہ میرٹھ میں فلسطین کانفرنس کے موقع پر میں نے مولانا سے عرض کردیا تھا کہ تمام خط و کتابت کی اشاعت جمعیۃ العلماء کی پالیسی کو ظاہر کرنے کیلئے مجھ پر فرض ہے مگر بقیہ تفصیل کو ہم کسی دوسرے اہم موقع کیلئے چھوڑتے ہیں۔

۱۴ر جون ۱۹۳۸ء کو ایک خط نمبر ۱۹۵ میں راقم الحروف کے نام رقم طراز ہیں :-

" پس میں اب بھی کہتا ہوں کہ اگر حافظ ابراہیم صاحب کو نقصان پہونچائے بغیر چودھری خلیق اور نواب صاحب کا کوئی سمجھوتہ کانگریس سے ہو جائے تو میں کوشش کیلئے تیار ہوں، جھگڑا تو سارا وزارتوں کا ہے "

جمعیۃ العلماء کے یہ مقتدر رہنما ابھی تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جس طرح انھوں نے محض ایک وزارت پر اپنی سیاسی عمارت کی بنیاد رکھ چھوڑی ہے، مسلم لیگ بھی وزارتیں حاصل کرنے کیلئے تمام جد و جہد میں مصروف ہے حالانکہ لیگ کانگریس کی موجودہ گفت و شنید کی ناکامی نے ثابت کر دیا ہے کہ اصل قصہ وزارتوں کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے وجود کو تسلیم کرانا مقصود ہے۔ کانگریس وزارتیں دینے اور مسلم صوبوں میں خود حاصل کرنے پر بالکل تیار ہے لیکن مسلم لیگ کی واحد نمائندہ حیثیت کو اسلئے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ اُس کے ایسا کرنے سے اُن کانگریسی مسلمانوں کا سیاسی وجود ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا جو ملت اسلامی سے کٹ کر کانگریس میں جا ملے ہیں۔ لیکن افسوس نہ کانگریس یہ غور کرتی ہے اور نہ وہ کانگریسی مسلمان کہ ان کا سیاسی وجود مسلمانوں میں باقی ہی کہاں ہے اور کبتک وہ اسطرح باقی اقتدار کو قائم رکھ سکتے ہیں؟ کیا لیگ اور کانگریس کے متعدد انتخابات میں کانگریس کی شکست نے ثابت نہیں کر دیا ہے کہ ان مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے مسلمانوں میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے؟

بدقسمتی تو یہ ہے کہ خود اس جماعت میں ان لوگوں کا کوئی افرادی اقتدار نہیں ہے جسکے لئے اُنھوں نے ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی مخالفت مول لی۔ حالانکہ

گاندھی جی کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں ہیں لیکن کانگریس کسی پروگرام میں ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتی جب تک کہ مہاتما جی مہر تصدیق ثبت نہ فرمائیں لیکن جمعیۃ العلماء کے کسی عالم سے بھی کسی معمولی مسئلہ میں بھی کوئی مشورہ کیا جاتا ہے؟ پبلک کے بڑے مسائل کو نظر انداز کیجیے ان مسائل میں جو خالص مذہبی ہیں مثلاً کاشتکاری قانون کے حقوق وراثت کی تقسیم اور تعلیمی پروگرام وغیرہ میں کبھی کوئی مشورہ ان حضرات سے کیا جاتا ہے؟ کیا جمعیۃ العلماء کا کوئی ممبر اس قابل نہیں کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہو سکے یا کسی صوبے کی کانگریس کمیٹی کی صدارت اُسکو مل سکتی؟ اگر واقعی نہیں ہے تو مسلم لیگ کے مقابلے میں سیاست دانی کے اتنے لمبے چوڑے دعوے کیوں ہیں؟

ان کی طرف سے ودھیا مندر اور وارد ھا اسکیم کے خلاف اگر کوئی تجویز آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کی جاتی ہے، اگر ہندی نوازی کے خلاف کوئی لفظ کہا جاتا ہے یا ٹانڈہ فارنگ کے خلاف کوئی آواز نکالی جاتی ہے تو کانگریس ہائی کمانڈ پر اسکا کچھ بھی اثر ہوتا ہے؟ جمعیۃ العلماء کے ارکان دہلی میں گاندھی جی کے حضور میں وفد لیجا کر شکایات پیش کرتے ہیں لیکن گاندھی جی کی زہر قند اور تلخ مسکراہٹ کے علاوہ کوئی عملی جواب ان علماء کو دستیاب ہوتا ہے؟ ٹانڈہ کے مظلومین کی حالت مولانا حسین احمد صاحب اور ناظم جمعیۃ العلماء ہند خود جاکر دیکھتے ہیں، اُن خونچکاں واقعات کا مطالعہ بچشم خود کرتے ہیں، مسجد کی بیحرمتی، بیگناہ مسلمانوں کی مارپیٹ، اور چالیس چالیس آدمیوں کا مع ضعیف العمر نمازیوں کے ایک رسی میں مقید ہوکر زمین پر گھسیٹے

جانے اور گھروں میں گھس گھس کر گرفتاریوں کے حالات، ستر سے زائد مسلمانوں کے خاک و خون میں تڑپنے کے دلشکن اور عبرتناک واقعات خود جاکر سنتے ہیں اور اپنے بیانات اخبار میں شائع کراکے مسٹر رندھاوا کے معطل کئے جانے اور غیر سرکاری تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن اتنے غیر معمولی حادثے کے باوجود بھی ان مقتدر علماء کی آواز کانگریس حکومت کے آستانے پر کوئی اثر پیدا کرتی ہے؟ حکومت کانگریس ان کی کسی درخواست پر بھی لبیک کہتی ہے اسکے باوجود بھی خودداری کا یہ حال ہے کہ اب تک کانگریس حکومت کے خلاف ایک لفظ نہیں ارشاد ہوسکا برخلاف اسکے حال ہی میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی مقرر کردہ سب کمیٹی میں (جو اس غرض سے مقرر کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں پروپیگنڈا کرنے کے نئے ذرائع معلوم کرے اور پرانے جال کے پھندے اور مضبوط کئے جائیں) سب سے پہلا نام مولانا حسین احمد صاحب ہی کا ہے اور کانگریس ان تمام ذلت آمیز حرکتوں کے باوجود صوبہ کانگریس کے پروپیگنڈا سکریٹری مولانا کا ایک خط شائع کرتے ہیں جسمیں اُنھوں نے یقین دلایا ہے کہ کانگریس نظام سے وہ ہرگز الگ نہیں ہوسکتے بلکہ اس سے علیحدہ ہونا اُن کی نظروں میں گناہ ہے۔

کانگریس کے لیڈر ایک بار نہیں ہزار مرتبہ منظم مذہب کی مخالفت کا اعلان کرچکے ہیں اور اس کو ملکی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ خیال کرتے ہیں، جن بنیادوں پر قصر اسلامی کی تعمیر قائم ہے کانگریس انکے استیصال کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں وہ مذہب کے علمبردار علماء کے وجود کو کب گوارا

رسکتی ہے؟ آجکل اگر علماء کے ساتھ کانگریس کا تعاون ہے تو صرف اسلئے
۔ ان کے ذریعہ وہ مسلم عوام پر قبضہ کرنا چاہتی ہے جس روز مسلم عوام میں
س نے اپنا اقتدار قائم کرلیا اور خدانخواستہ ان کو اقتصادی مسائل اور روٹی
کے نعروں کا شکار بنا لیا اُسوقت سب سے پہلا حملہ علماء کی ہی جماعت پر ہوگا اور
ن کو سوائے ندامت کے اور کچھ حاصل نہو گا۔

علماء کی یہ قلیل جماعت وزارت کی ایک گدی پر خوش نظر آتی ہے اور
انگریس کو اطمینان ہے کہ انکے ذریعہ اُسکے مقصد کے حصول میں مدد مل رہی ہے
ورسادہ لوح مسلمان اُسکے پُر فریب جال میں پھنس رہے ہیں۔ بقول اکبر مرحوم
پھلی کو ڈھیل مل گئی لقمہ پہ شاد ہے   صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

افسوس! کانگریس نہایت شاطرانہ طور سے اس جماعت کو مسلمانوں کے
خلاف اسی طرح بطور آلہ کار استعمال کر رہی ہے جس طرح سیواجی دکن کی اسلامی
ریاستوں کو اورنگ زیب کے خلاف استعمال کرکے دو اسلامی طاقتوں کی لڑائی
سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ آج اگر ان سے کوئی کام لیا جاتا ہے تو وہ مسلمانوں کے
سیاسی قتل نامے پر دستخط کرنا ہے اور وہ اپنے نزدیک اسی کو عین خدمت اسلامی
تصور کرتے ہیں۔

کانگریس کے اندرونی نظام سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ان کو
یہ بھی نہیں معلوم کہ کانگریس اپنی طاقتوں کو مسلمانوں کے خلاف کس طرح صرف
کر رہی ہے، برٹش امپیریلزم سے وہ کن شرائط پر سمجھوتہ کرچکی ہے اور بیرونی
ممالک میں کس طرح کانگریس کے روپیہ سے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے

کہ جس دریا کی گہرائی سے وہ خود ناواقف ہیں اُسی میں مسلمانوں کو ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔

کانگریس کے اشاروں پر وہ مسلمانوں کو کافر قومیت اور ملحد اسلام بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں لیکن ان کو یہ بھی احساس نہیں کہ وہ خود ہندستان سے علمار کے وقار کو ختم کر رہے ہیں۔ وہ اکبری دور کی یاد پھر تازہ کر رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ وہ اب تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کانگریس علمار کی محافظ اور لیگ ان کے وجود کی مخالف ہے۔ زمانے کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔

وہ اپنے وقار کو اس طرح ختم کر رہے ہیں کہ جب مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کو کوئی الیکشن لڑنا ہوتا ہے تو ان حضرات کو سفر خرچ کی معمولی رقم کے بدلے مسلم عوام میں مسلم لیگ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور کانگریس کو اسلام دوست جماعت ثابت کرنے کیلئے بلا لیا جاتا ہے اور کام ختم ہونے پر رخصت کر دیا جاتا ہے۔

وہ خط کس قدر عبرتناک اور سبق آموز ہے جو پنڈت جواہرلال نہرو نے دارو صاکیمپ سے جھانسی الیکشن کے موقع پر ۵ رجولائی ۱۹۳۷ء کو رفیع احمد قدوائی صاحب کے نام لکھا تھا:۔

"جہانتک کام کرنے والوں کا تعلق ہے ایک اچھی تعداد باہر سے پہونچا دیگئی ہے ابوالکلام آزاد نے حسین احمد اور بشیر احمد کو اطلاعات پہونچا دی تھیں۔ انھوں نے احمد سعید کو بھی تار دیدیا تھا۔ ان لوگوں کو اخراجات سفر ملنا چاہئیں۔ ہم کچھ مالی امداد کرنے کی کوشش کریں گے، مجھے یقین ہے

سات سو روپیہ پہلے اس الیکشن میں دیا جا چکا ہے“
جبکہ حکومت کانگریس گاندھی جی کے نام کے پہلے مسٹر بھی برداشت نہیں کر سکتی اور سرکاری طور سے مہاتما کہلانا چاہتی ہے، اور پنڈت جی اپنے خطوط میں گاندھی جی اور مالویہ جی تک کو باعزت القاب سے خطاب کرتے ہیں۔ اس خط میں کسی عالم کے نام کے ساتھ ”مولوی“ یا ”صاحب“ کا لفظ تک بھی نہیں اور ان کو کام کرنے والوں کی جماعت ہی میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا علمائے اسلام کی پوزیشن یہی ہے؟

ایسا کیوں ہے؟ کانگریس ہمارے علماء کو آلۂ کار کیوں سمجھتی ہے؟
اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے علماء جنھوں نے ہمیشہ دنیا کو اپنے پیچھے چلایا ہے۔ جنھوں نے دوسری جماعتوں کی قیادت اور رہنمائی کی ہے وہ عرصے سے کانگریس کے ہر کام کی تائید میں مصروف ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کانگریس کی تمام جد و جہد اور کوشش مسلم کشی اور ہندو نوازی میں صرف ہو رہی ہے کانگریس میں نہ صرف ہندوؤں کی اکثریت ہے بلکہ وہ ہندو مہا سبھا کی دوسری تصویر ہے وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کو ۱۹۲۲ء کے بعد کانگریس سے مایوس واپس آنا پڑا، ان کے سامنے اپنی گذشتہ تاریخ اور نقشے بھی ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا۔ اشتراک عمل ضرور کیا مگر جماعتی حیثیت کو الگ رکھتے ہوئے۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود وہ کانگریس کے ہر کام کے مؤید ہیں۔
ان کے طرز عمل کے تغیر کی حالت یہ ہے کہ جب کانگریس نے نمک سازی کی

تحریک شروع کی تو نمک پر محصول لگانے کے خلاف فتوے دیے گئے۔ عدم ادائگی لگان و مالگذاری کی تحریک کی فتووں سے تائید کی گئی، کانگریس نے اسمبلیوں میں جانا چاہا تو حرام نہ ہونے کا فتوے دیدیا گیا پھر جب سوراج پارٹی نے اسمبلیاں چھوڑیں تو انھوں نے بھی اسمبلی میں جانا ممنوع قرار دیدیا۔ کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں جنگ کی تو انھوں نے بھی شروع کردی اور جب کانگریس نے صلح کرلی تو وہ بھی بغیر کسی صلح کے خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں اسمبلیوں اور کونسلوں کی ممبریاں، وزارتیں وغیرہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیدی گئیں مگر ان کے انتقال کے بعد آج نہ صرف ان کو جائز کردیا گیا بلکہ انکے حصول کیلئے جدوجہد کی گئی، حضرت شیخ الہندؒ نے اسارت مالٹا سے واپسی پر ساحل بمبئی پر گاندھی جی کی جے کے نعروں کو بھی ناپسند کیا تھا اور آج انکے ہی جانشین بندے ماترم کے گیت میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ صدر کانگریس کی قیادت میں اسی ملحدانہ گیت کی تعظیم کیلئے ہندوؤں کے ساتھ کھڑے بھی ہوتے ہیں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے مسلمان اپنی بدبختی پر اگر ماتم کریں تو فضول اور اگر محض کانگریس کو مورد الزام ٹھہرائیں تو نامناسب ہے۔ ؎

خزاں میں بھی نہ آسکتا تھا میں صیاد کی ضد میں
مگر غماز تھی شاخ نشیمن کی کم اوراقی (اقبالؒ)

مسلم لیگ کے ساتھ جو طرز عمل جمعیۃ العلماء کے ان ارکان کا ہے وہ نہایت افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔ جبکہ مسلم لیگ کا نصب العین "آزادی کامل" نہ تھا اسکا نظام جمہوری نہ تھا اور اسکے اندر اکثریت رجعت پسند طبقے کی تھی

تو ان حضرات نے لیگ کے ساتھ کامل تعاون کیا لیکن آج جبکہ مسلم لیگ آزادی کامل اپنا نصب العین بنا چکی ہے، اور جمہوری نظام کو اس حد تک اختیار کر چکی ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ اور قریہ میں لیگ کا نظام پھیل چکا ہے اور ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان لیگ سے اتفاق رسلے کر چکے ہیں تو یہ جماعت "خداوندان لیگ سے بدظن ہے۔ اسلئے کہ اب یہ بے عملوں اور سرکار پرستوں کی جماعت ہے"! اگر واقعی وہ ایسی ہی کمزور جماعت ہے تو کانگریس نے کیوں ختم نہ کر ڈالی، کیوں آخرکار کانگریس کو لیگ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور اگر اب بھی وہ بے عملوں کی اور سرکار پرستوں کی جماعت ہے تو اس کی ذمہ داری بھی زیادہ تر انھیں حضرات پر ہے۔ باہر بیٹھکر اور دشمنوں کی فوج میں ملکر گولہ باری کرنے سے کسی جماعت کو با عمل نہیں بنایا جا سکتا۔ جب لیگ کا دستور اسقدر جمہوری ہے تو کونسی چیز اس جماعت کو اندر داخل ہونے اور اسکی خامیوں کو دور کرنے میں مانع ہو سکتی ہے۔ دنیا کا کوئی نظام مکمل نہیں ہے۔ لیکن جب جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی حامی ہے تو دوسری جماعت میں انفرادی شرکت کیا معنی رکھتی ہے؟ کیوں مسلم لیگ کو اتنا مضبوط نہ بنا دیا جائے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسکو کمزور نہ کر سکے اور مسلمانوں کے سیاسی وجود کی اہمیت سے سرتابی نہ کر سکے۔ حیرت صرف یہ ہے کہ ایک طرف یہ حضرات کانگریس پر قبضہ کرنے کی امیدیں رکھتے ہیں جو ناممکن العمل ہے اور دوسری طرف ناامیدی کا یہ حال ہے کہ خالص مسلمانوں کی جماعت میں آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ داستان بہت طویل اور دردناک ہے جسکا ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ سہ

حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم
نمی گردید کوتاہ رشتہ معنی رہا کردم

باب دہم

تعین راہ منزل مقصود کا راستہ

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

گذشتہ دو صدیوں میں مسلمانان ہند نے متواتر پُرآشوب اور تباہ کن انقلابات کا مقابلہ کیا ہے۔ اس تمام عرصہ میں ان کو ترقی اور تنزل کے مختلف شاہراہوں سے گذرنا پڑا لیکن ان مظالم اور مصائب کے باوجود برطانیہ اور برادران وطن کی متحدہ طاقتیں ہندوستان سے مسلمانوں کی سیاست کو کم نہیں کر سکے۔ وہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں مساوی شریک کار کی حیثیت کے مدعی ہیں اور اپنے سامنے ایک عظیم الشان مستقبل دیکھتے ہیں۔ سے

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

آج مسلمانان ہند کو دو فرائض عظیم کی ادائیگی کیلئے جد و جہد کرنا ہے ایک حتے الامکان دوسری جماعتوں سے تعاون کر کے یا بحالت مجبوری بدون شرکت

پہلے ہندوستان کو مغربی چنگل سے نجات دلانا اور دوسرے ہندوستان میں اپنی مرکزیت اور جماعتی حیثیت کے قیام کیلئے جدوجہد کرنا۔

ہندوستان کو برطانوی استعمار سے آزاد کرانا اسلئے ضروری ہے کہ یہاں کی آزادی پر بہت کچھ مشرقی اسلامی ممالک کی آزادی کا دارومدار ہے مصر اور فلسطین کی زنجیریں اسلئے سخت کی جا رہی ہیں کہ ہندوستان کی گردن سے طوق غلامی نہ نکلنے پائے اور ہندوستان میں انگلش اقتدار کو اسلئے مضبوط کیا جا رہا ہے کہ مصر کی نہر سویز برطانیہ کے ہاتھ میں رہے یہی وجہ ہے کہ انگریز ہندوستان کی اکثریت سے ہر قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار ہیں اگر ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا قطعی خاتمہ ہوا تو فلسطین میں اینگلو یہودی اقتدار کا قائم ہونا لازمی ہے اور اگر خدانخواستہ عربی ممالک کے قلب میں انگریزی طاقت کی مدد سے یہودی حکومت قائم ہوگئی تو عراق، عرب، ترکی، مصر، شام اور ایران تک کے مسلمان ہمیشہ اس حکومت کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ اور اگر ہندوستان میں انگریزی سنگینوں کے سائے میں اکثریت کی قومی حکومت قائم ہوگئی تو نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ بلکہ چین، ملایا، برما، جاوا اور افغانستان تک کے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو جائے گا۔

ان اہم فرائض کی ادائیگی کیلئے تعین راہ کی ضرورت ہے۔ منزل مقصود تک پہونچنے کیلئے منزل کا صحیح راستہ مقرر کر لینا سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔

پہلا راستہ بہت آسان ہے وہ یہ کہ ہم جمود و تعطل کے شکار بنے رہیں

سیاست میں فی الحال کوئی حصہ نہ لیں صرف ارکان اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہیں، کسی بہتر موقع کے منتظر رہیں اور اس امید میں کہ شاید کوئی فرشتوں کی جماعت جو گناہوں اور بے عملیوں سے پاک ہو منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو تب اسمیں شامل ہو کر آزادی کی جنگ میں حصہ لیں۔ لیکن اس راستہ کو صرف وہ لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو دنیا میں اپنا کوئی مستقل سیاسی اصول نہیں رکھتے، جو تقلید کی روش پر اس کورانہ طریقے سے گامزن ہیں کہ دل و دماغ اور ہوش و خرد سے کام لیکر وہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتے بلکہ اپنے گروہ کے خود پسند لیڈروں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنا ہی انکا شعار ہے جو زمین پر اُڑنے والے گرد و غبار کے ذرات کی طرح ہوا کے ہر رُخ کے ساتھ اُڑنے لگتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو شخصیت پرستی کے غیر اسلامی اصول پر اس حد تک عامل ہیں کہ ملک کے اہم سے اہم سیاسی معاملا کو بھی اپنے مرشدوں اور رہنماؤں کے حسن اعتقاد کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں، جو ہر سیاسی جماعت کے عیوب شماری میں مصروف رہتے ہیں مگر خود کسی جماعت کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہونے کی جراءت نہیں رکھتے لہٰذا ان لوگوں کو انھیں کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اب جبکہ ملک میں سیاسی جنگ کا باجہ بج رہا ہے اور زور دست و ضرب کاری کا وقت ہے اور دوسری قومیں میدان جنگ میں اُتر کر مصروف کارزار ہیں مسلمانوں کیلئے ایک لمحہ کی غفلت بھی ان کی منزل کو اور دور کر دے گی سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد محض ایک سیاسی غلطی کی بنا پر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ برسوں پیچھے ہٹ گئی ؎

زہم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

لہذا آئندہ کسی ساعت کا انتظار کیے بغیر مسلمانوں کو آزادی اسلام اور آزادی ہند کی جد وجہد میں ہمہ تن مصروف ہوجانا چاہیئے۔

جنگ آزادی میں شرکت کرنے کا دوسرا راستہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے کانگریس میں شامل ہوجانا چاہیئے۔ کانگریس ملک کی سب سے بڑی جماعت ہے، سات صوبوں میں حکمراں ہے اسلئے اتنی زبردست جماعت سے مسلمانوں کا علیحدہ رہنا خود مسلمانوں کیلئے مضر اور ناجائز ہے۔

یہ اُن لوگوں کا عقیدہ ہے جو ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی ہیں جس کی اساس مذہب کے بجائے وطنیت پر ہو۔ جنکے نزدیک مسلمانوں کا علیحدہ مفاد کوئی معنے نہیں رکھتا، جو مذہب کو سیاست سے جدا کرکے انسان کے پرائیوٹ عقیدہ سے منسوب کرتے ہیں اور مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب کو ہندو قومی تہذیب میں ضم ہوجانے کو ہندوستان کیلئے نہایت مفید سمجھتے ہیں، جن کے نزدیک کمیونلزم سب سے بڑا گناہ اور نیشنلزم سب سے بڑی نیکی ہے۔ جو ایک بار نہیں ہزار بار اعلان کرچکے ہیں کہ مذہب، معاشیات اور اقتصادیات کے ماتحت ہے جنکے نزدیک دنیا میں اقتصادی مسئلہ کے سوا اور کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

لیکن اگر مسلمانان ہند کو اس ملک میں مسلمان ہوکر رہنا ہے اور اسلامی سیاست کی اہمیت اور اپنی جماعتی حیثیت کو قائم رکھنا ہے اگر اسلام کی حقیقی آزادی ان کو مطلوب ہے تو اس عقیدہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ اس عقیدہ کا بنیادی اصول ہی اسلامی اصولوں سے متصادم ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک کانگریس سے الگ رہنا مسلمانوں کے لئے سخت مضر اور ناجائز ہے ان کی ذہنیتیں اور دل و دماغ دوسروں کی طاقتوں سے بالکل مرعوب اور شکست خوردہ ہو چکے ہیں وہ خود اپنی طاقت سے بالکل بے خبر اور اس حقیقت خود آگاہی سے قطعی ناآشنا ہیں ؎

عجب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی کھلتے ہی غلاموں پر اسرار شہنشاہی

افسوس وہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا بینھما کی سچائی سے کس قدر بیگانہ ہیں۔ وہ اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اگر ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان آپس میں ہم آہنگ اور متحد الخیال اور متفق العمل ہو جائیں تو مع بلوچستان پانچ صوبوں میں خالص مسلم حکومت کا امکان ہے اور مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن کسی دوسری جماعت سے کمتر نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کی تمام سرحدوں کے مالک وہی ہیں۔ ہندوستان کا اندرونی امن و نظام سیاسی بغیر ان کی مدد کے ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا کاش وہ اس حقیقت کو سمجھ سکتے! ؎

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

ان تمام واقعات کے باوجود اور کانگریس کی مسلم آزار اور تنگ ذہنیت کو تسلیم کر لینے کے باوجود ایک دوسرا گروہ شرکت کانگریس کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی آواز اندر ہی سے بلند کرنی چاہیئے۔ کانگریس کے اندرونی قلعہ میں گھس کر ان کے ہاتھوں کو کمزور بنانا چاہیئے اور مسلم حقوق و مفاد کا تحفظ کانگریس میں داخل ہو کر کرنا چاہیئے۔

افسوس یہ گروہ سیاست کو بھی ایک کھلونا بنانا چاہتا ہے اور چند ہوائی نظریوں پر ایک مکمل عمارت کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔

ان کا یہ نظریہ کہ مسلمان قومی اور ملکی معاملات میں کانگریس میں داخل ہو جائیں اور مذہبی تنظیم کیلئے کانگریس کے اندر ہی ایک مذہبی پارٹی بنالیں جیسے سوشلسٹ وغیرہ اور اسطرح کانگریس کے اندر رہتے ہوئے اپنے حقوق کا تحفظ کرائیں۔

دو خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے۔ اول یہ کہ مذہب سیاست سے بالکل مختلف چیز ہے اس نظریے سے مذہب کا وہی محدود تخیل سامنے آتا ہے جو وطن پرست گروہ کا نصب العین ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان قومی حیثیت سے ایک پوزیشن رکھتے ہیں اور ملی حیثیت سے دوسری اور چونکہ مذہبی تنظیم سیاسی جماعت کے اندر رہکر یا اُسیکا ایک جزو بنکر کرنی ہوگی اسلئے ملی حیثیت قومی حیثیت کے ماتحت ہے جس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذہب سیاست کے ماتحت ہے۔ جیسے مغربی ممالک میں۔ حالانکہ اسلامی اصول اور عقائد کی رو سے بہت سی قومیں تو ایک ملت میں جذب ہو سکتی ہیں لیکن ملت کسی قوم میں جذب نہیں ہو سکتی جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن پاک میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام سے نکلکر ملت ابراہیمی میں داخل ہو گئے ان کو داخل ہونے کے بعد لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ امت کے لفظ سے۔ اگر ان لوگوں کی نظروں میں اسلام کا دائرہ اسقدر تنگ ہے کہ مذہب پر قائم شدہ اسلامی جماعت ہندوستان کے سیاسی مسائل کو دوسری اقوام کے ساتھ جماعتی حیثیت سے اشتراک عمل کر کے حل نہیں کر سکتی، اگر دوسری قوموں میں جذب ہوئے بغیر اور مذہب کو سیاست کے ماتحت کئے بغیر مذہب اسلام

آزادیٔ ہند کیلئے کوئی حل پیش نہیں کر سکتا تو ان لوگوں کا اسلام "محمدؐ عربی" کے اسلام سے بالکل مختلف ہے سے

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد (اقبالؒ)

یہ ایک فطرتی اصول ہے کہ ایک چھوٹا دریا، خواہ وہ کتنا ہی تیز رفتار اور طوفان انگیز کیوں نہو بڑے دریا میں ملکر اپنی انفرادی ہستی کھو دیتا ہے اور بڑے دریا میں جذب ہو جاتا ہے اسیطرح منظم اور با اثر قوت دوسری کمزور اور منتشر جماعت کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور کمزور جماعت کے علیحدہ وجود کو ختم کر دیتی ہے۔ مسلمان جن کی کمزوری کی حالت اپنی آخری حدوں پر پہونچ چکی ہے کانگریس جیسی منظم اور طاقتور جماعت میں جذب ہو کر کبھی اپنی انفرادی حیثیت اور جداگانہ سیاسی پوزیشن کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ کانگریسی نظام کے تابع ہو کر وہ کوئی جماعتی تنظیم نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں ان کا تمام طرز فکر ذہنیت اور دل و دماغ کانگریس کے آہنی فریم میں جذب ہو جائیگا اور ان کی جماعتی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی جس کے علامات ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ کانگریس نظام سے وابستگی رکھنے والے مسلمانوں کی ذہنیتوں اور طرز زندگی کے تمام پہلوؤں میں جو انقلاب عظیم رونما ہو چکا ہے وہ موجب عبرت ہے۔

اس اصولی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کونسا طریقہ ہے جس سے مسلمان کانگریس کے اندر اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں۔ کانگریس کی تمام ملک میں اکثریت ہے اور وہ اکثریت پورے طور سے منظم ہے، انتخاب کا جو

طریقہ ہے وہ مخلوط[1] ہے جس کی رو سے مسلمان اپنے نمائندوں کو کانگریس کمیٹیوں میں ہندو نمائندوں کے مقابلہ میں ہرگز منتخب نہیں کرا سکتے۔ مسلمان ہر صورت میں اقلیت میں رہیں گے اور چونکہ اکثریت کے رحم وکرم پر ہونگے اور جماعتی اعتماد کا کوئی سوال نہوگا لہذا خود مسلمانوں کے نمائندے ہندوؤں کے ہاتھوں میں آلہ کار بنیں گے اور اسلامی مفاد کو ختم کرنے کیلئے استعمال کئے جائیں گے اگر بالفرض سب نے منظم اور متحد ہوکر بھی اندر سے مخالفت کی تو تنگ نظر اکثریت پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ بندے ماترم کے خلاف مسلمانوں نے متحدہ طور سے کتنا شور مچایا لیکن کانگریس پر کیا اثر ہوا؟ بمبئی میں تمام مسلمانوں کی مخالفت اور واک آؤٹ کے باوجود مخلوط انتخاب کی تجویز پاس کر دی گئی۔ گئوکشی کے معاملہ میں بہار اسمبلی میں تمام مسلمانوں نے مخالفت کی لیکن کوئی پرواہ تک نہیں کی گئی۔ پہلی دوسری اکتوبر ۳۷ء کا اجلاس اسمبلی یو۔پی قابل درس تھا۔ ان تاریخوں میں زیر بحث تجویز یہ تھی کہ موجودہ قانون ہندوستان کے مفاد کیلئے ناکافی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا سے استدعا کی گئی تھی کہ قانون بنانے کا حق خود اسی ملک کے باشندوں کو ہو جس میں ہر بالغ ہندوستانی حصہ لے سکے اس جماعت کا نام کونسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی تجویز کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے متفقہ طور سے اس تجویز کی تائید کی مگر ایک ترمیم پیش کی کہ جب کبھی ایسی جماعت قائم ہو اسوقت مسلمانوں کی نمائندگی کا حق اتنا ہی رہے جتنا کہ اب ہے، اور اس جماعت کو کوئی حق نہوگا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات اور پرسنل لا یعنے طلاق، نکاح اور وراثت کے قوانین میں کوئی تبدیلی کر سکے جبتک کہ کم از کم تین چوتھائی مسلم ممبران ہم آواز ہوکر کوئی تبدیلی نہ چاہیں۔ لیکن باوجود مسلمانوں کی متفقہ مخالفت اور

---

[1] ہری پورہ کانگریس سیشن میں ۴۸۵ ڈیلیگیٹ میں کل آٹھ مسلمان منتخب ہوسکے صوبہ بنگال سے ۶۲ میں سے صرف دو کا

ہم آواز ہو کر احتجاج کرنے کے نہ صرف اس ترمیم کو مسترد کر دیا گیا بلکہ مسلمانوں کا بیحد مذاق اُڑایا گیا اور اُن کے اس معمولی مطلبے پر غور کرنا بھی گوارا نہ کیا گیا۔ یہ تمام مطالبات متحدہ طور سے اندر رہتے ہوئے بھی پیش کیے گئے تھے اور احتجاج بھی کافی کیا گیا لیکن کوئی فائدہ بھی برآمد ہو سکا؟

فرض کیجئے اگر آئندہ کانگریس یہ رزولیوشن پاس کر دے کہ کانگریس کے اندر رہتے ہوئے کوئی فرقہ وارانہ تنظیم کی اجازت نہیں دیجا سکتی کیونکہ اس سے کمیونلزم کے بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ یا اپنے گذشتہ رزولیوشن پر درآمد شروع کر دے جو اب سے دس سال قبل پاس ہو چکا ہے اور جس پر عملدرآمد اسلئے نہیں کیا جا سکا کہ اُس کی زد میں وہ ہندو مہاسبھائی لیڈر بھی آجاتے ہیں جو کانگریس کے نیتا ہیں جسکا مفہوم یہ ہے کہ کانگریس کا ممبر کسی فرقہ وارانہ جماعت کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ تو مسلمانوں کی پوزیشن اُسوقت کیا ہوگی؟ خود مسلمانوں میں سے بہت بڑی تعداد اس خیال کی مؤید بنائی جائے گی۔ پھر یا تو جماعتی تنظیم کو چھوڑا جائے یا کانگریس کو خیرباد کہا جائے۔ کانگریس کی ۵۳ سالہ زندگی کا ایک ایک دن اس روز بد کی پیشینگوئی کرتا ہے اسلئے کہ مسلمانوں کی علٰحدہ تنظیم اور قوت کو کانگریس اپنے نظام کے اندر یا باہر کسی طور سے پسند نہیں کر سکتی۔ لہذا اگر مسلمانوں کو اپنی جداگانہ تنظیم کو قائم رکھنا ہے اور مرکزیت کا تحفظ منظور ہے تو جو راستہ ان کو بعد میں مجبوراً اختیار کرنا پڑیگا اس کو ابھی سے استقلال کے ساتھ کیوں اختیار نہ کیا جائے؟ کانگریس کی مسلم آزار پالیسی کے باوجود بھی اگر کچھ عرصہ کیلئے اسمیں مسلمان بہ حیثیت جماعت داخل ہو گئے اور بعد میں اُس سے باہر

آنا پڑا جیسا کہ یقینی ہے (کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس منظم جماعت میں کبھی نہیں ہو سکتی) تو اُسوقت جو انتشار اور اختلال ملت اسلامیہ میں رو نما ہوگا وہ سنبھالے نہ سنبھل سکے گا۔ تیز گامی کے ساتھ چلتے چلتے جب ایکدم رک کر قدم پیچھے ہٹایا جاتا ہے تو مدتوں آگے قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس غلطی کا ارتکاب کرکے مسلمان اپنی تاریخ کو بیس سال پیچھے جا چکے ہیں کیا اسکا اعادہ کرکے وہ اسلامی سیاست کی تاریخ کو زمانہ غدر کی سیاست سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں؟ جبکہ دوسری قومیں ترقی کے میدان میں برابر بڑھتی جا رہی ہیں مسلمان کب تک ترقی اور تنزل کے گرداب میں پھنسے رہیں گے اور دوسروں کے سہارے کے کب تک منتظر رہیں گے۔ ؎

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

دنیا میں کبھی کوئی جماعتی تنظیم دوسری جماعت کے تبع رہ کر نہیں کی جاسکتی نہ کسی جماعت کی تنگ ذہنیت کو اُس جماعت کے اندر رہتے ہوئے بدلا جا سکتا ہے آج اگر کانگریس کوئی بات تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو وہ اسلئے کہ اسوقت اُسکو مسلمانوں کو خوش کرکے دام پر فریب میں پھانسنا منظور ہے۔ ورنہ اُس کی مسلم آزار پالیسی میں مسلمان اندر جماعتی قوت کے ساتھ احتجاج کرکے بھی سر مُو تبدیلی نہیں کر سکتے۔ احتجاج کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب کوئی مقصد احتجاج کرنے سے حل نہیں ہوتا تو آخری طرز عمل ترک موالات اور علحدہ متوازی نظام کا قیام ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود کانگریس کو حکومت برطانیہ کے خلاف

ترک موالات کے اصول پر عامل ہونا پڑا تھا۔

مسلمان احتجاج اور اندرونی و آئینی جد و جہد کی منزلوں سے گذر چکے ہیں اب انکے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں سوائے اسکے کہ وہ کانگریس سے علیحدہ ہوکر اپنے جماعتی نظام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنالیں۔

آخری راہ عمل | ہندوستان کی ماضی و حال کی سیاست کا ہر پہلو ہمارے سامنے ہے۔ کانگریس نے اپنے ڈیڑھ سالہ دور حکومت میں اُس عمارت کی ایک جھلک ہمارے سامنے رکھدی ہے جس کی بنیاد مغربی طرز پر رکھی گئی ہے اور جسکا نقشہ خود برطانوی مدبرین کا بنایا ہوا ہے۔ اس دستور العمل میں مسلمانوں کی جماعتی اور مرکزی حیثیت کا کوئی تحفظ نہیں ہے لہذا اس انقلاب کا مقابلہ اس نظام سے وابستہ رہکر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس مقصد کیلئے ایک الگ متوازی جماعت کا قیام ضروری ہے جو ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد و متفق کردے۔ مسلم لیگ ۳۲ سال سے برابر مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور ہندوستان کے ہر گوشے میں مسلمانوں نے اس جماعت کو پھیلا دیا ہے۔ ضرورت اسکی ہے کہ تمام نو کروڑ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں۔ آج جو مرکزی بیداری ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں پیدا ہو گئی ہے اگر اُس سے کام نہ لیا گیا تو سوائے ماتم کے اور کچھ نہو سکے گا۔ برباد شدہ قوموں کو زمانے کی مصیبتیں تجدید حیات کی بہت کم فرصت دیتی ہیں۔ بسا اوقات ایک معمولی سیاسی غلطی بڑی بڑی قوموں کو ہمیشہ کیلئے تباہ و برباد کردیتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا تھا لیکن بیسویں صدی کے

[illegible]ء سے [illegible]ء تک تمام عالمِ اسلامی کی بیداری نے مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ثانیہ
کا موقع بہم پہنچایا مگر اس سے فائدہ اٹھا کر حاصل کردہ نتائج کو کانگریس کے
سپرد کر دیا گیا۔ آج بیس سال بعد ہندوستان کی سیاست پھر اپنی تاریخ کو دہرا رہی
ہے اور مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ مواقع میسر آ گئے ہیں۔ جنگِ عظیم سے قبل جو
حالت عالمِ اسلامی میں رونما تھی آج وہی نقشہ پھر نمودار ہو رہا ہے۔ آج بھی یورپ
کا مطلع سیاست آئندہ کی جنگ کے بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہندوستان میں تقسیم
بنگال کی تنسیخ کے اعلان اور خلافت ترکیہ کے معاملات اور مسجد کانپور نے جو اضطراب
اُس زمانے میں پیدا کر دیا تھا۔ آج کانگریس کے ڈیڑھ سالہ دورِ حکومت نے مسجد شہید گنج
اور فلسطین کے معاملات نے وہی حرکت اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف
ہندوستان کے اندر کانگریس اور برطانیہ کے تعاون نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا
ہے دوسری طرف برطانیہ کی ملوکیت اور استعمار نے مصر و فلسطین اور حجاز میں کافی
بیداری پیدا کر دی ہے، جاپان ایک طرف مسلمانانِ مشرق کی طرف صلح کا ہاتھ
بڑھا رہا ہے تو دوسری طرف مسولینی اور ہٹلر اپنی اپنی اغراض کے ماتحت
اسلامی ممالک کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ ایران اور ترکستان میں
مسلمانوں کی حیرتناک سیاسی ترقی نے مسلمانوں کے دلوں میں کافی امید پیدا
کر دی ہے۔ مصر اور افغانستان بھی اُسی راستے پر گامزن ہیں۔ مغربی ممالک
مشرق میں اپنا اثر روز بروز کھو رہے ہیں اور اگر عنقریب کوئی جنگِ عظیم ہو گئی
تو مغربی طاقتیں آپس میں لڑ کر اس قدر کمزور ہو جائیں گی کہ مشرق کی طرف نگاہ
اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ عجب نہیں کہ علامہ اقبال کی یہ پیشین گوئی صحیح

ثابت ہو جائے ؎

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُسکا آشیانہ

مغربی ممالک کی طاقت مشرق سے جتنی کم ہوتی جائے گی مسلمانوں کا سیاسی اثر بڑھتا جائے گا۔ بدقسمتی سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی قبل از وقت موت نے مسلمان حکومتوں کے باہمی وفاق کو کچھ عرصہ کیلئے دور کر دیا ہے۔ اگر مشرقی ممالک کی حالت اسی طور سے جاری رہی تو وہ دن دور نہیں ہے کہ بین الاقوامی جماعت کا صدر مقام جنیوا کے بجائے طہران یا قسطنطنیہ ہوگا۔

علامہ اقبالؒ نے چند سال قبل ہسپانیہ میں مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر ایک نظم کہی تھی اُس کے مندرجہ ذیل اشعار اسی عالم نو کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو مشرقی اسلامی ممالک کی ترقی سے وابستہ ہے۔ ؎

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا — گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
آبِ روان کبیر[1] تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور جہاں کا وہ خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

مسلمانان عالم کی حرکت و بیداری [illegible] مسلمانان ہند میں خود اعتمادی کے جذبات کی ابھرتے برطانیہ اور برادران و[illegible]وں کے دلوں میں ایک تشویش

---

[1] وادالکبیر قرطبہ کا مشہور دریا ہے جس کے قریب [illegible] قرطبہ واقع ہے۔

پیدا کردی ہو مسلمانان ہند بیرونی اسلامی ممالک کی سیاست میں جتنی دلچسپی لیتے ہیں انگریز اسکو اتنا ہی بُرا سمجھتے ہیں اسلئے ان کو اسلامی ممالک کے اس باہمی ارتباط و اتحاد میں یہ خطرہ نظر آتا ہے کہ کہیں یہ پان اسلامزم کی تحریک مشرق سے اور بالخصوص ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم نہ کردے ہمارے برادران وطن کو بھی اس سے یہ خطرہ رہتا ہے کہ یہ اخوت مذہبی کی لہر کانگریس کی اس اسکیم اور اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دے گی جس کی رو سے وہ مسلم تہذیب اور مسلم سیاست کو تمام تر متحدہ قومیت میں جذب کرنا چاہتی ہے۔ غالباً اسی لئے پنڈت جواہر لال نہرو نے دو مرتبہ مصر جانے کی تکلیف گوارا فرمائی، فلسطین کے متعلق بادل ناخواستہ تجاویز پاس کی گئیں اور اسلامی ممالک سے تعلق پیدا کرنے کی اسلئے کوشش کی جا رہی ہے تاکہ اسلامی حکومتیں مسلمانان ہند کی مصیبت کے وقت بالخصوص جبکہ کانگریس اور برطانیہ کا نیا تعاون فیڈریشن کے اجراء کے بعد رنگ لانے والا ہے ان کی مدد کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔

لیکن افسوس کانگریس برطانیہ کی مدد کے بھروسے پر بہت بڑی سیاسی غلطی کر رہی ہے۔ برطانوی امپیریلزم کا اقتدار مشرق سے ضرور رخصت ہوتا ہے۔ اور مشرق میں اسلامی سیاست کے ارتقاء کو قریب مستقبل میں کوئی نہیں روک سکتا۔ ایسی حالت میں اس کی یہ اسکیم کہ مسلمانان ہند کو دوسرے اسلامی ممالک سے علیحدہ رکھ کر اور ان کو نیشنلزم کا شکار بنا کر سیاسی حیثیت سے ختم کر دیا جائے، بہت خطرناک نتائج پیدا کرے گی جو سب سے زیادہ خود

کانگریس اور برادران وطن کے لئے نقصان کا باعث ہونگے۔ اُن کا یہی طرز عمل اگر مسلمانوں کے ساتھ جاری رہا تو ملک میں بہت بڑی باہمی جنگ (Civil War) ہوگی جو جدید ہندوستان کے لئے بہت مضر ثابت ہوگی ان تمام نتائج کو روکنے کیلئے برادران وطن کو چاہیئے کہ وہ مسلم تحریک کا بغور اور دوربینی کے ساتھ مطالعہ کریں، وہ مسلمانوں کی تنظیم سے خائف ہونے اور اُس کو ختم کرنے کے بجائے اُن سے اشتراک عمل اور سیاسی تعاون کو اختیار کریں۔ مسلمانوں کے نصب العین اور پروگرام کو سمجھ کر اُس کے حل کرنے کی فکر کریں۔

ہندوستان ایک وسیع براعظم ہے جسمیں مختلف قومیں آباد ہیں اور اپنی اپنی جدا تہذیبوں کی مالک ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بالکل ناممکن ہے کہ سب تہذیبوں کو ایک ہی متحدہ قومیت اور کلچر میں ضم کر دیا جائے۔ بلکہ سب قوموں کو اپنی اپنی تہذیب کے قیام وارتقاء کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ہندوؤں نے اپنے گذشتہ طرز عمل سے بالکل ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہوکر کام نہیں کر سکتے۔ باوجود کوششوں کے وہ مسلمانوں سے کسی مستقل تعاون کے لئے تیار نہیں ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کسی دو قوموں میں اتنا بُعد اور امتیاز نہیں جتنا ہندوستان کے مسلمان اور ہندوؤں میں ہے دنیا کے کسی حصہ میں بھی کوئی قوم ایسی آباد نہیں جسکا کھانا مسلمانوں کے ہاتھ لگانے سے ناپاک ہو جائے۔ ایسی حالت میں مسلمان اپنے مستقبل کو اسقدر سنگدل اکثریت کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اس بے اعتمادی کا صرف ایک ہی

لازم ہے کہ دونوں قوموں کو علیحدہ علیحدہ رہ کر اپنی اپنی تہذیب کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع دیا جائے

مسلم لیگ کے نصب العین کے مطابق آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس ملک کے پیچیدہ مسائل کا صرف یہی حل ہے کہ مختلف قوموں کی آبادی کے مطابق آزاد جمہوری ریاستوں کے قیام کی کوشش کی جائے جو اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں اور مرکزی حکومت سے وفاقی شکل میں مربوط رہیں۔

شمال مغرب کے صوبوں، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کو ملا کر ایک آزاد اسلامی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے پنجاب میں سے انبالہ ڈویژن کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مشرق میں صوبہ بنگال، آسام اور بہار کے ایک حصہ کو جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ملا کر دوسری آزاد اسلامی ریاست بنا دی جائے۔ باقی دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے، ان کا تحفظ اسطرح کیا جائے کہ مختلف تہذیبوں کے علاقوں (Cultural Zones) کی حد بندی کر دی جائے۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کو مسلم ری پبلک کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے جیسا کہ روس نے کیا ہے۔ بالکل یہی مراعات ہندوؤں کو مسلم صوبوں میں دی جائیں۔ اسطرح دونوں قوموں کی جداگانہ تہذیب بھی قائم رہ سکے گی اور باہمی تعلقات بھی ہمیشہ کیلئے پر امن اور دوستانہ ہو جائیں گے۔ اسطرح قائم شدہ آزاد ریاستیں ہندوستان سے علیحدہ نہ سمجھی جائیں گی بلکہ وفاقی شکل میں مرکزی حکومت سے وابستہ ہونگی اور

سب ملکر جدید ہندوستان کی تعمیر میں معاون ہونگی۔ اندرونی طور سے اپنے
معاملات میں وہ بالکل آزاد ہونگی۔

بظاہر یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے اور انتظامی مشکلات بہت معلوم ہوتی ہیں
لیکن اسکے علاوہ جو نظام بھی ہوگا وہ سیاسی پیچیدگیوں کو اور زیادہ مشکل کردیگا
اور کوئی صحیح حل نہ مل سکے گا۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے اپنی سیاست کی بنیاد مغربی تخیل پر قائم کی وہ
جداگانہ انتخاب اور وزارت و نیابت کے تناسب کے حصول میں مصروف رہے
لیکن اتنے عرصہ کی جدوجہد کے بعد معلوم ہوا کہ جو کچھ کیا گیا وہ کوہ کندن و کاہ
برآوردن سے زیادہ نہ تھا۔ اگر ابتدا ہی سے علامہ اقبالؒ کی مجوزہ تحریک کو سمجھ کر
اہمیت دیجاتی تو آجتک بہت کچھ حاصل ہوگیا ہوتا بہرحال ابھی وقت ہے کہ مسلمان
اپنی گزشتہ سیاسی غلطیوں کی تلافی میں مصروف ہوجائیں اور جبکہ کانگریس اور
برطانیہ نے آئین کے کھلونے میں لگے ہوئے ہیں مسلمانوں کیلئے بہترین موقع
ہے کہ وہ اندرونی اختلافات کو ختم کرکے اور معمولی مسائل کو نظرانداز کرکے اس
مہم عظیم کے حصول کیلئے کمربستہ ہوجائیں اور اپنے جماعتی نظام کو زیادہ سے زیادہ
مستحکم بنانے میں سعی کریں۔ یہی ان کی نجات کا صحیح راستہ ہے اور منزل مقصود تک
پہونچنے کا واحد ذریعہ ہے مسلمانوں کے جماعتی نظام کے استحکام ہی سے دوسری
قوموں کی نظروں میں ان کی کوئی اہمیت ہوسکتی ہے اور کانگریس کو معلوم ہوسکتا
ہے کہ ہندوستان میں ۹ کروڑ مسلمانوں کا کوئی وجود ہے۔ سہ

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم   صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر

آخر میں مدبرین کانگریس سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات کے قلمبند ہونے سے مشتعل نہ ہوں بلکہ مسلم سیاست کو سمجھنے کی کوشش کریں اور رواداری وسامحت سے کام لیں۔ کانگریسی مسلمانوں کو بھی اب ہندو کو چھوڑنا چاہیئے اور اسلامی نظام کے استحکام میں فروعی مباحث کو نظرانداز کرکے کوشاں ہونا چاہیئے۔ آج ہندوستان میں جو باہمی رزم آرائیاں ہو رہی ہیں اُسکا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ایک جماعت منظم ہے اور دوسری غیر منظم۔ اگر دونوں جماعتیں برابر قوت کی مالک ہوں تو یہی دشمنی دوستی میں تبدیل ہوجائے گی۔ ترکوں سے یوروپ کی جنگ اُسی وقت تک رہی جب تک ترک کمزور رہتے لیکن اُن کی ترقی کے بعد وہی قدیم دشمن ترکوں کے دوست نظر آتے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

پس اگر مسلمان ہندوستان اور اسلام کو آزاد کرانا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں ابدی امن وصلح حاصل کرنا مقصود ہے تو اُٹھیں اور تیزگامی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھیں اپنے جماعتی نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنائیں اور دوسری قوموں کے ہمدوش ہوکر آزادی کی جنگ میں حصہ لیں ؎

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام وسحر تازہ کریں

عبدالوحید خاں۔ بی۔ اے

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	کے	کی
۴۶	۱۰	تھا	تھی
۵۵	۹	دیدیتے	دیدیتے ہیں
۶۱	۱۸	ایڈبرن	وڈبرن
۷۰	۲	ترکستان	ترکی
۷۶	۱۰	لگے ہاتھوں	آڑے ہاتھوں
۸۰	۱	۱۹ء	۱۹۱۴ء
۸۱	۱۹	ظلعت پاشا	طلعت پاشا
۸۷	۷	شریف حسن	شریف حسین
۱۲۱	۹	ہے	ہیں
۱۳۳	۴	ایشیا	ایشیائی
۱۴۰	۱۵	کو	کی